عہدِ حاضر کا سب سے بڑا ادیب

جارج برنارڈ شا

ایک نظر میں

- سوانح عمری
- فن اور ادب
- چار ڈرامے

از

ط انصاری

مکتبہ برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی

عہدِ حاضر کا سب سے بڑا ادیب

جارج برنارڈ شا

ایک نظر میں

- سوانح عمری
- فن اور ادب
- چار ڈرامے

از

ظ انصاری

مکتبۂ برہان اردو بازار دہلی

قیمت مجلد تین روپے آٹھ آنے

رمضان المبارک سنہ ۱۳۷۰ھ

جون سنہ ۱۹۵۱ء

طبع اوّل ..... ایک ہزار

مطبوعہ

ہمدرد پریس دہلی

فہرست مضامین

صفحہ

اِنتساب

"غزالی" کے نام

جسے میری تحریروں کا بڑا انتظار رہتا ہے۔

مصنف کے اور ترجمے

(از ہیج آرنٹ) انقلاب روس۔ قومی دارالاشاعت ۔لاہور

(تئین چن) چینی گاؤں ۔ کُتب پبلشرز۔بمبئی

سامرسٹ ماہام { بدیسی اناج (زیر طبع) خیابان بمبئی۔
"مشاہدے" (زیر طبع) خیابان۔بمبئی

شا کا فوٹو

دو تصویریں شریکِ اشاعت ہو جاتیں تو موجودہ
رسم کے مطابق کتاب زیادہ اپ ٹو ڈیٹ سمجھی جاتی ،
ایک شا کا فوٹو ، دوسرا مؤلف کا فوٹو۔ لیکن مکتبۂ برہان
شروع ہی سے اس سے نا آشنا رہا ہے اور اس کی شائع
کی ہوئی تمام کتابیں اس رسم سے آزاد ہیں ، قارئین
کرام معذرت قبول فرمائیں اور فوٹو کی ظاہری نوک و پلک
کے بجائے "مش" اور "نظ" کے حقیقی خدوخال زیرِ نظر
اوراق میں تلاش کریں ۔

اِس کتاب سے پہلے

شا نے بہت لکھا اور بہت کہا۔ جو کچھ انہوں نے کہا اس کا بھی ایک بڑا حصّہ لکھا گیا۔ دنیا میں ایسے ادیب انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں جنہوں نے شا کے برابر عمر پائی ہو۔ اور ایسے ادیب ڈھونڈھے سے نہیں ملینگے جنہوں نے اتنے عرصے تک مسلسل لکھا ہو۔ لیکن اس کے باوجود شا نے خود اتنا نہیں لکھا، جتنا ان کے بارے میں لکھا گیا ہے۔ شا کے متعلق تحریروں میں رجنی پام دت کا مضمون بھی ہے، اور شا کی سکریٹری کی لکھی ہوئی کتاب بھی۔ سیرت نگاری تو ایک طرف رہی، ادبی اعتبار سے بھی دونوں کو ایک دوسرے سے کوئی نسبت نہیں۔ ان کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں گھاس کوڑا بھی ہے اور جواہر ریزے بھی۔ میں نے ان سب پر ایک نظر ڈالنے کے بعد مختصر سا ایک کتابچہ لکھنے کا ارادہ کیا تھا۔ اب جو یہ تیار ہوا تو ضخامت کے لحاظ سے کتابچہ نہیں ہے۔ سیرت نگاری کے لحاظ سے اس کی جو حیثیت ہے وہ اس کتاب کے انتساب سے ظاہر ہے۔

اگر مجھے یقین ہوتا کہ شا پر ایک ضخیم کتاب اُردو میں چھپ سکیگی اور بک سکیگی تو میں جو یہ صفحے پیش کر رہا ہوں، انہیں ردی کی ٹوکری میں ڈال دیتا لیکن جب دیکھتا ہوں کہ اُردو میں ان کے جو تین ڈرامے ترجمہ ہوئے ہیں وہ بھی پڑھنے کے لائق نہیں اور ترجمے کے تقاضے کو بھی پورا نہیں کرتے، تو سوچتا ہوں کہ چلو،

یہ بھی غنیمت ہے۔ اور کچھ نہیں، تو برنارڈ شا کا ایک دھندلا سا خاکہ ہی اُردو پڑھنے والوں کو مل جائیگا۔

یہ دھندلا سا خاکہ ہے۔ اس میں رنگ آمیزی نہیں ہوئی ہے۔ ہوئی تو بہت کم ہوئی۔ میں نے جان بوجھ کر تنقیدی رویّے کو بہت کم دخل دیا ہے یہ اس لیے کہ تنقید استدلال چاہتی ہے اور استدلال طول چاہتا ہے۔ خاص طور پر جب وہ ایسی شخصیت کے بارے میں ہو جس پر اُردو میں کوئی کتاب آئی ہی نہیں۔

آخر میں چار ڈرامے بھی شامل ہیں۔ شا کے ڈراموں کو کترنا — میں جانتا ہوں کہ — بے جا حرکت ہے۔ لیکن بہتر مقصد کے لیے مجھے یہ بے جا حرکت بھی کرنی پڑی۔ اگر ان کے یہاں سے ڈرامے نہ لیتا تو مثالیں کہاں سے دیتا اور ہمارے پڑھنے والے ان تک پہنچتے کیونکر؟ اور اگر ڈرامے پورے کے پورے لیے جاتے تو پھر وہی ضخامت کا سوال۔ ہاں اتنی احتیاط میں نے ضرور کی ہے کہ کوئی ایسا مکالمہ یا ایسا سین رہ نہ جائے جس کا ڈرامے میں اہم مقام ہو۔

ایک سوال ہوتا ہے کہ صرف ان چار ڈراموں کو کیوں چُنا گیا۔ اوّل تو اس لیے کہ وہ شا کے ڈراموں کی چار قسموں کو پیش کرتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ تین اہم ترین ڈرامے (جن میں Man & Superman اور St John شامل ہیں) اُردو میں پہلے ترجمہ ہو چکے ہیں۔ اور ان کے بعد شا کی تحریروں کے دَور دیکھ کر یہ ڈرامے کافی اہم تھے۔

میں نے کتر بیونت کر کے ان کی فنی حیثیت اور ان کی لذت کو نقصان ضرور پہنچایا ہے لیکن ان کی اہمیت کو نہیں۔

مجھے ڈاکٹر ملک راج آنند کا شکریہ ادا کرنا چاہیے کہ انھوں نے مجھے شا پر کتاب لکھنے کا ایک ڈھرا بتایا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ میں اس ڈھرے پر چلا نہیں۔ اور بازار کو جس قسم کی "چیز" کی ضرورت تھی، بالکل ویسی "چیز" میں نے نہیں لکھی۔

ایک بڑی مشکل یہ ہوئی ہے کہ میں نے شا کو بحیثیت تنقید نگار، بحیثیت فلسفی، بحیثیت فن کار، بحیثیت سیاست داں الگ الگ خانوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ ایسا ضرورتاً کیا گیا ورنہ شا کے یہاں خانے نہیں ہیں۔ سورج کی کرنوں میں جس طرح بہ یک وقت کئی رنگ شامل ہوتے ہیں یہی حال شا کا ہے۔ ان کی ساری حیثیتیں ملی جلی ہیں۔ اور ان سب کی مرکزی حیثیت یہ ہے کہ وہ فن کار ہیں۔ اور عقابی نگاہ اور فنکارانہ بصیرت رکھتے ہیں اور یہ بصیرت لاکھ آلودگیوں میں بھی اُبھر کر رہتی ہے۔ نیتشے کے بارے میں اقبال نے کہا تھا کہ اس کا دل تو مومن ہے مگر دماغ کافر "قلبِ او مومن، دماغش کافر ست" شا کا دل مومن ہے۔ دماغ ایک حد تک مومن ہے۔ مگر ان کی زبان بڑی کافر ہے۔

پرولتاری ڈکٹیٹر شپ پر جو مضمون شا نے لکھا ہے، اُسے دیکھ کر کوئی گمان نہیں کر سکتا کہ چند برس پیشتر شا ہی وہ شخص تھے جنھوں نے ہٹلر اور مسولینی کو ابھرتے ہوئے ستارے سے تعبیر کیا تھا۔ اور بعد میں ابراہیم پیغمبر

کی طرح خود کو سمجھا لیا کہ "ڈوبنے والا ستارہ میرا خدا نہیں ہو سکتا۔

۲۔ نومبر ۵۰ء کو شا کے ساتھ تاریخِ ادب کی ایک بے پناہ جرأت، ایک عظیم قوت سو گئی۔ لوگ اس کی فنی حیثیت پر بحث کر رہے ہیں۔ یہ بحث اور طول پکڑیگی۔ نئے اور زیادہ تفصیلی جائزے لیے جائینگے لیکن کوئی کہہ سکتا ہے کہ جو مقام فرانس کے انقلاب میں والٹیر اور بالزک کی تحریروں کو ملا۔ اور جو مقام روس کے انقلاب میں تالستائی کی تصنیفوں کو عطا ہوا، وہی مقام کل کا عالمگیر انقلاب جارج برنارڈ شا کو نہیں دیگا۔ کہ ان کی تحریر و تقریر نے اس طبقہ کو جھنجھوڑا ہے جس طبقے کے نفع خور پنجے آج بھی دنیا کے دو تہائی جسم میں گڑے ہوئے ہیں۔

ظ انصاری

جنوری ۵۱ء

بمبئی

زندگی کے حالات

پیدائش : ۲۶۔جولائی ۱۸۵۶ء

مقام : ڈبلن (آئرلینڈ کی راجدھانی)

وفات : ۲۔نومبر ۱۹۵۰ء

مقام : لندن

سوانح عمری

"برنارڈ شا کے متعلق کوئی دلچسپ بات نہیں کہی جا سکتی سوائے ان باتوں کے جو خود شا اپنے متعلق کہہ چکا ہے۔"

یہ جملہ برنارڈ شا نے اپنے ایک امریکی سوانح نگار فرینک ہارس کو لکھا تھا۔ انہوں نے ہارس کو ہدایت کی کہ وہ ان کے بارے میں کچھ نہ لکھیں کیونکہ ان کی محض ایک سوانح عمری ہے جو قابل اعتماد ہے اور وہ آرکبلڈ ہنڈرسن نے لکھی ہے۔ شا نے خود اس کی تصدیق دی۔ اور اس تصنیف کی خوبی یہ ہے کہ اس میں شا کے متعلق غیر معمولی باتوں کا کھوج لگانے کی غیر معمولی کوشش نہیں کی گئی۔

انہوں نے ایک خط میں خود آرکبلڈ ہنڈرسن کو لکھا۔

"لوگوں سے کہہ دیجیے کہ میں واقعی بالکل ایک معتدل آدمی ہوں، خاموش، کاروباری اور بالکل عام آدمی جیسا انسان، میرے

بارے میں سب سے زیادہ غیر معمولی بات جو کہی جا سکتی ہے وہ میرا معمولی ہونا ہے۔"

شا غالباً دنیا کے ان تمام لوگوں میں سب سے آگے ہیں جن کی سوانح عمری لکھی گئی، جن کے حالات زندگی کی تحقیقات کی گئی، ان کو نئے نئے معنی پہنائے گئے اور عجیب عجیب پہلو پیش کیے گئے۔ دنیا میں کسی مصنف کے اتنے کارٹون، اتنی تصویریں، اتنے لطیفے اور اتنی غیر معمولی باتیں آج تک شائع نہیں ہوئیں جتنی شا کی۔ اس چیز نے بھی انہیں بلا وجہ معمہ بنانے میں مدد کی۔ اس معمے کو انہوں نے اپنے "سولہ خاکے" تصنیف میں سلجھانے کی کوشش کی اور بتایا کہ وہ خود بہت سلجھے ہوئے آدمی ہیں، انہیں حیرت ناک بنانے کی کوشش نہ کی جائے۔

"میری زندگی میری تصانیف اور ڈراموں کی شکل میں ڈھل گئی ہے۔"

ان کا خیال ہے کہ انسان اپنی سوانح عمری خود نہیں لکھ سکتا۔ اس کی کئی وجہیں ہیں، پہلی وجہ تو یہی ہے کہ "جب آپ کے منہ میں پانی بھرا ہوا ہو تو آپ خود پانی کا ذائقہ کیسے بتا سکتے ہیں" اور اس کے علاوہ یہ بھی ہے کہ جب ایک شخص اپنی سوانح عمری لکھتا ہے تو بالکل سچ نہیں لکھ سکتا۔ اور اگر سچ سچ لکھ دے تو خود اس کی ذات سے زیادہ دوسروں کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ ایک آدمی کی زندگی دوسروں کی زندگی سے الگ تھلگ تو ہوتی نہیں، اس کے رشتے دوسرے لوگوں مثلاً رشتہ داروں، دوستوں اور عزیزوں کی زندگی سے جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ اگر اپنے بارے میں سب کچھ کہنے کی کوشش کی جائے تو دوسر

لوگوں کا ذکر بھی آئیگا، اور بعض ایسی باتیں بھی لکھنی ہونگی جو اب تک راز میں رہی تھیں۔ چنانچہ اپنی ددھیال کے متعلق انہوں نے ایک دفعہ خود سوانح نگاری کے سلسلہ میں یہ لکھ دیا کہ میرے ایک چچا تھے جنہوں نے خودکشی کا عجیب و غریب ڈاکٹری طریقہ ایجاد کیا تھا، انہوں نے دل کی حرکت بند کرلی اور دنیا سے سدھار گئے۔ جیسے ہی یہ سوانح شائع ہوئی شا کی تمام ددھیال ان سے ہمیشہ کے لیے ناراض ہوگئی، کیونکہ چچا کی موت اب تک ایک راز سربستہ کے طور پر رکھی گئی تھی اور ظاہر یہ کیا گیا تھا کہ وہ عام حالات میں انتقال کر گئے۔

اسی طرح اُنہوں نے جہاں کہیں سوانح حیات کا ذکر کرتے وقت کسی دوست کا ذکر کیا اور اس طرح کیا جس طرح وہ جانتے تھے تو ان دوستوں کو ناگوار گزرا اور شکایت پیدا ہوئی کہ شا نے ان کو سماج میں ذلیل کر ڈالا ہے۔ اسی لیے شا نے باقاعدہ اپنی سوانح عمری پوری تفصیلات کے ساتھ خود نہیں لکھی۔ ان کا خیال ہے کہ آج تک جتنی سوانح عمریاں لکھی گئی ہیں ان میں ½ ۹۹ فیصدی وہی باتیں ہیں جو عام لوگوں کی زندگی میں ہوتی ہیں اور باقی آدھا فیصدی یا تو اقبالِ جرم ہے یا محض جھوٹ۔

"گوئٹے اور روسو کی سوانح عمریاں اپنے جرموں کے اقبالنامے ہیں"

اور باقی جو ہیں وہ ناقابل برداشت۔ اپنے دوست اور محسن ولیم آرچر کا واقعہ اُنہوں نے لکھا ہے کہ ایک دفعہ شا نے کسی پامسٹ (ہاتھ کی لکیریں دیکھنے والے) کو ہاتھ دکھایا۔ اور جب اُس نے شا کے حالات زندگی بتلائے تو انہیں

بڑی حیرت ہوئی کیونکہ واقعات بالکل صحیح تھے اور ویسے کے ویسے ہی شا پر گزرے تھے۔ دوسرے روز انہوں نے ولیم آرچر سے کہا کہ جناب مجھے بھی ہاتھ دیکھنا آتا ہے، لائیے آپ کا ہاتھ دیکھوں، آرچر کا ہاتھ دیکھ کر انہوں نے لفظ بہ لفظ وہی واقعات دہرا دیے جو پامسٹ نے خود شا کا ہاتھ دیکھ کر بیان کیے تھے۔ آرچر نے کہا، یہ تو بالکل صحیح بتا رہے ہیں آپ۔ آپ پامسٹ کب سے ہوگئے

اس واقعہ سے شا نے اندازہ کیا کہ پامسٹری محض ایک تجربے اور اندازے کا نام ہے، ورنہ ۹۹ ½ فیصدی حالات سب انسانوں کے ساتھ ایک سے ہی گزرتے ہیں، باقی رہے آدھے فیصدی، سو کوئی پامسٹ انہیں بیان نہیں کرتا۔

کسی مضمون میں (جو خط بھی ہے اور مضمون بھی) انہوں نے لکھا ہے کہ :

"واقعات مجھ پر نہیں گزرے، بلکہ میں ہوں جو واقعات پر گزرا"

چنانچہ شا جن واقعات پر خود گزرے ہیں ان کا اختصار یہ ہے کہ :

ولادت اور بچپن

۲۶۔ جولائی ۱۸۵۶ء کو جارج برنارڈ شا آئرلینڈ کی پروٹسٹنٹ بستی کے ایک شریف خاندان "شا" میں پیدا ہوئے۔ ان کے باپ جارج کار شا ڈبلن کے شرفا کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے ایک کھاتے پیتے گھرانے میں شادی کی تھی۔ ان کی ماں کے خاندان میں مذہبی پابندی، پاکبازی اور رکھ رکھاؤ کے بڑے سخت حدود تھے۔ چنانچہ ماں کی تربیت ایسے ماحول میں ہوئی جس کی اندرونی گھٹن اور ذہنی دباؤ نے ان پر منفی ردِ عمل کیا اور شادی کے بعد وہ شدت پسند

اور سخت گیر ہونے کے بجائے آزاد منش اور لاپرواہ ہو گئیں۔

باپ ایک معمولی تجارت پیشہ آدمی تھے۔ اور اگرچہ وہ اعتقادی طور پر Teetotaller (مذہباً پاکباز) تھے لیکن انہیں شروع ہی سے شراب پینے کی عادت پڑ گئی تھی۔ باپ کی عمر چالیس سال تھی جب اُنہوں نے شا کی والدہ سے شادی کی اور ماں کی عمر تیس سال۔ شادی کے فوراً بعد ہی "ہنی مون" کے زمانہ میں ایک روز ماں نے جو الماری کھولی تو باپ کے کپڑوں میں سے چھ خالی بوتلیں نکلیں، اور ماں کے تصورات پر بجلی گر پڑی، وہ سمجھ گئیں کہ ان کا شوہر زبان سے نیک اور پرہیز گار لیکن عادات میں شرابی ہے، فوراً اُنہوں نے تنہائی سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اپنے شوہر سے آزاد ہونے کی کوشش کی۔ وہ گھر چھوڑ کر بندرگاہ کی طرف چل دیں کہ شاید انہیں جہاز پر ملازمت مل جائے اور اس طرح وہ معاشی اور جسمانی طور پر اپنے شوہر سے بے واسطہ ہو سکیں۔ لیکن جہاز پر اُنہوں نے شرابی جہازیوں کو دیکھا اور وہاں بداطواروں کی کثرت کا اندازہ کرتے ہوئے انہوں نے فیصلہ کیا کہ اتنے بداطوار شرابیوں کے درمیان رہنے سے تو ایک شرابی مگر معقول شوہر کے ساتھ رہنا زیادہ گوارا ہے۔ چنانچہ وہ واپس چلی آئیں۔

ان کے باپ شرابی تو تھے لیکن ایسے بلا نوش نہیں کہ وہ سڑکوں پر یا ہوٹلوں میں گرتے پھریں۔ وہ اپنے آپ کو سنبھالے رہتے تھے اور صرف عادت کے ہاتھوں مجبور تھے۔ البتہ انہوں نے ایک دفعہ اپنے ایک دولتمند عزیز کے یہاں رات کے کھانے کے بعد اعلیٰ درجہ کی شراب دیکھ کر ضرورت سے زیادہ پی لی اور بہک گئے،

اتنے بھکے کہ تمام حاضرین کو ناگوار گزرا اور انہوں نے جارج کارشل سے اظہار بیزاری کیا۔ اس کے بعد سے ان کے والدین کو بڑے اور باعزت رشتہ داروں کی کسی ضیافت میں نہیں بلایا گیا اور ڈبلن کے شرفا میں رہ کر بھی وہ رفتہ رفتہ ذات باہر اور اچھوت بن کر رہ گئے۔

پھر شا کے والد نے تجارت میں ایک شخص کو شریک کار بنا کر جو روپیہ لگایا تھا، وہ تجارت بھی فیل ہو گئی۔ کاروبار کی طرف سے لاپرواہی، ناواقفیت اور زیادہ خرچ دونوں شریکوں میں مشترک کمزوری تھی۔ اور شا کے باپ اتنے صلح پسند خوش باش اور بے پرواہ آدمی تھے کہ انہیں کبھی اپنے شریک کار پر کوئی شبہ تک نہیں ہوا۔

تجارت ناکام ہونے کے بعد گھر میں کوئی بڑا اثاثہ نہ تھا، اور نہ کوئی باقاعدہ ذریعۂ معاش۔ چنانچہ بڑی تنگی سے گزر ہونے لگی۔ اور باپ میں گھر کی طرف سے لاپرواہی اور حالات سے بیزاری بڑھنے لگی۔

ماں اگرچہ گھریلو ماحول سے خوش نہ تھی لیکن خاموش قسم کی عورت تھی۔ اور چونکہ کبھی جھگڑتی نہیں تھی اس لیے کبھی غمگین بھی نہ تھی۔ وہ کچھ اس قسم کی عورت تھی کہ "آپ اگر کوئی غلطی یا غلط روی کریں تو وہ خاموش دیکھتی رہیگی، کچھ نہ کہیگی لیکن اپنے طور پر ہمیشہ کے لیے آپ کو غلط کار سمجھ لیگی"۔

"بشر اور فوق البشر" ڈرامے کے دیباچے میں شا نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "اس آدمی سے بچ کر رہنا جو تمہاری چوٹ کا فوراً جواب نہیں دیتا" یہ جملہ انہوں نے اپنی ماں کے کردار کو نظر میں رکھنے کے بعد لکھا ہے۔ کیونکہ وہ

اپنے شوہر سے ہمیشہ کے لیے مایوس ہو گئی تھی۔

شا کے باپ اگرچہ اپنی بیوی سے محبت کرتے تھے لیکن عملی زندگی میں اس محبت کا اظہار شاذ و نادر ہی ہوتا ہوگا۔

شادی کے بعد ان کے ہاں تین بچے ہوئے۔ دو لڑکیاں ایک لڑکا۔ شا اپنی بہنوں سے چھوٹے تھے۔ ابھی ان کی عمر ایک سال ہوگی کہ ان کی ماں کچھ دنوں کے لیے اپنے میکے چلی گئیں اور بچوں کو باپ اور خادمہ کی نگرانی میں چھوڑ گئیں۔ اس وقت ان کے باپ نے اپنی بیوی کو سسرال میں جو خط لکھا ہے اس میں شا کی شرارت اور بیقراری کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"میں نے تمہارے بوسے دونوں بچوں (بیپ اور بوب) کو پہنچا دیے لیکن تمہاری ہدایت کے خلاف کچھ اپنے لیے چرا لیے۔ اور تم جانتی ہو کہ چوری کا بوسہ کتنا لذیذ ہوتا ہے"۔

اس خط سے اور روزمرہ کے واقعات سے شا کے والدین کے باہمی تعلقات اور گھریلو ماحول کا ہلکا سا اندازہ ہوتا ہے۔ ماں کی عادات بیان کرتے ہوئے کسی جگہ شا نے لکھا ہے کہ جب وہ حالات کی ناگواری سے پریشان ہوتی تو ان میں خود کو الجھائے نہ رکھتی تھی بلکہ ہر شے سے بے نیاز اپنے وجود میں غرق ہو جاتی تھی۔ اور ایک ایسی دنیا میں رہنے لگتی تھی جسے خود اس کے تصور اور خیال نے بنایا ہو۔ بہر حال خیال کی یہ دنیا حقیقت کی دنیا سے بدرجہا بہتر اور گوارا ہوتی ہوگی۔

جس طرح ماں ایک نرم دل، خاموشی پسند، تنہائی پسند اور بے فکر قسم

کی فطرت رکھتی تھیں، ان کے باپ بھی بڑے رحم دل انسان تھے۔ وہ اس اصول کے آدمی تھے کہ "بخش دو گر خطا کرے کوئی"۔

"میری ماں اور باپ دونوں اتفاق سے ایسی فطرت رکھتے تھے جس میں دباؤ ڈالنے اور جبر کرنے کا شائبہ تک نہیں تھا" چنانچہ ایک طرف باپ کا یہ رویہ تھا کہ وہ اپنے بچوں کے کھانے پینے اور مزے اڑانے کی تمام ضروری چیزیں ہر صورت میں زیادہ سے زیادہ مہیا کر کے رکھتے تھے اور اپنے بچپن کے تجربے سے محسوس کرتے تھے کہ بچوں کو بھوک بہت لگتی ہے چنانچہ وہ ایسا سامان ہمیشہ رکھتے تھے کہ ان کے بچوں کو بھوک کے وقت مجبوری کا احساس نہ ہو "میں باورچی خانہ میں کھانا کھاتا تھا اور کبھی بھوکا نہیں رہا۔

ان کی ماں اور باپ کی عادات کے متعلق خود شا کے قلم سے اور ان کے سوانح نگاروں کے قلم سے اتنا تفصیلی ذخیرہ ملتا ہے کہ شا کی اپنی عادات اور ان کے کرداروں کو سمجھنے میں نفسیات کے ماہروں کے لیے نشانِ راہ بنانے کے کام آسکتا ہے۔

شا نے اپنے والد کے متعلق لکھا ہے کہ وہ زیادہ ہنستے تو نہیں تھے لیکن انہیں اس وقت ہنسی بے اختیار آتی تھی جب چاروں طرف ہنسی کے خلاف ماحول ہو۔ مثلاً ایک جنازے کے جلوس میں وہ شریک تھے۔ جلوس میں چلنے والوں کے منہ لٹکے ہوئے ہونگے اور ہر ایک کے چہرے پر غیر ضروری اور مضحل سنجیدگی طاری ہوگی کہ اتنے میں مسٹر کار شا کو ایک جملہ سوجھ گیا اور وہ جملہ کہہ کر وہ خود بے اختیار ہنس پڑے۔

اسی طرح اپنی تیراکی کے شوق کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ میں بہت کم عمر تھا جب میرے والد نے مجھے بہتے پانی میں نہلانے کی ترغیب دی انہوں نے خود کیلینی خلیج کے پانی میں مجھے غوطہ دیا اور کہنے لگے کہ تیرنا بہت مفید چیز ہے وہ ابھی ہیں وہ تیرنے کی افادیت سمجھا رہے تھے۔ سمجھاتے سمجھاتے ذکر کرنے لگے کہ تیرنے کی بدولت دوسروں کی جان بچائی جا سکتی ہے۔ مثلاً میں نے تمہارے ماموں رابرٹ کی جان اسی فن سے بچائی اور انہیں ڈوبتے ڈوبتے نکال لیا۔ یہ کہہ کر ذرا جھکے اور میرے کان کے قریب زبان لا کر بولے "سچ یہ ہے کہ اس کے بعد شاید زندگی بھر مجھے کسی واقعے پر اتنا پچھتانا نہیں پڑا" یہ کہہ کر خود مسکرا دیے۔

اسی طرح Anti climax سے لطف لینا شا کے باپ کی فطرت میں داخل تھا۔ اور اسی کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں "چنانچہ میرے یہاں جتنے "انٹی کلائمکس" (انتہائی عروج کے نقطہ پر پہنچ کر وہاں سے غوطہ لگانا) ہیں وہ کبھی ارادۃً پیدا نہیں کیے جاتے میری تحریر میں یہ چیز خود بخود اور قدرتاً آجاتی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ میرے باپ کی دبی دبی ہنسی ہیں اور تھیٹر کے اندر میں اپنے مزاحیہ انداز سے جو تفریح کی صورت پیدا کرتا ہوں، اس میں ضرور ایک تعلق ہے"

تعلیم و تربیت

ماں کو شا کی تربیت سے کچھ زیادہ دلچسپی نہ تھی۔ وہ اپنے شریر بچوں کو بالکل آزاد اور "بے بہرہ" چھوڑ دینے کو جبر کرنے سے زیادہ پسند کرتی تھیں۔ وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"بوہیمین انارکسٹ (اپنے حال میں مست اور بدنظمی، بے ضابطگی

کی زندگی بسر کرنے والے) والدین کے بچے جب بڑے ہوتے
ہیں تو انہیں اپنی تربیت کے خلاف ایسا شدید ردِ عمل ہوتا
ہے کہ وہ حد سے زیادہ والدین کی رسم کے پابند ہو جاتے ہیں"
حد سے زیادہ تو نہیں لیکن ایک حد تک شا پر اس 'انارکزم' اور
خود پرستی کا اثر ہوا۔ انہیں کبھی کسی نے نہیں مارا۔ ایک نوکرانی یا اناجو ان
کی دیکھ بھال کے لیے ملازم تھی وہ جب کبھی شا کو شرارت کرتے دیکھتی ان
کے سر پر ایک دھپ جما دیتی تھی، بہت دن تو وہ برداشت کرتے رہے۔
"آخر ایک دن میں نے اس کی خلاف ورزی کی، وہ دب گئی اور پھر میں
اس کے کنٹرول سے بھی باہر ہو گیا" قدرتاً شا کو اپنی ماں سے زیادہ لگاؤ
ہونا چاہیے تھا، اور ہمیشہ رہا۔ ایک تو وہ اپنے اس شریر بچے کو ڈانٹتی
نہ تھیں، دوسرے رحم اور شفقت کا برتاؤ کرتی تھیں "ایک دن جب انہوں
نے اپنے ہاتھ سے مجھے روٹی دی تو اس پر مکھن کی معمول سے زیادہ موٹی تہہ
چڑھی ہوئی تھی" چنانچہ شا کو یقین ہو گیا کہ ان کی ماں سے زیادہ ہمدرد
فرشتہ کوئی نہیں ہو سکتا۔ اور اسی لیے زندگی بھر شا کی تعلیم اور ان کی
تربیت ان کی ماں اور ماں کے متعلقین سے زیادہ متاثر رہی۔ باپ کو
ویسے بھی پڑھنے لکھنے سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ کبھی ان کے ہاتھ میں کتاب
نہیں دیکھی گئی سوائے اس کے کہ اسکاٹ کے ناولوں کا وہ ذکر کیا کرتے
تھے۔

ماں یا باپ انہیں نہلانے نہیں لے جاتے تھے بلکہ وہی انا اپنے

ساتھ رکھتی تھی۔ انا کبھی کبھی اس ناسمجھ بچے کو باغ میں ٹہلانے کے بہانے لے جاتی تو باغ جانے کے بجائے اپنے دوستوں سے ملنے ایک بستی میں چلی جاتی تھی۔ انا کا دوست ایک بہت ہی گندی بستی (Slum) میں رہتا تھا، اور جتنی دیر اس سے ملتی، ناسمجھ بچہ وہیں بدبو اور گندگی میں ٹھہرتا، اور اپنا دم گھونٹے رہتا تھا۔ چنانچہ پہلے ہی ڈرامے میں جو غلیظ مکانات اور گندی بستی کا ذکر ہے، اس کے اولیں نقوش شا کے ذہن پر اس وقت اُبھر آئے تھے جب ان کا ذہن ایک سادہ ورق کی طرح بے خبر تھا۔ ایک روز انا کا دوست اپنی محبوبہ کی ضیافت کرنے کے لیے اسے قریب کے ایک شرابخانے میں لے گیا۔ شا بھی انگلی پکڑے ساتھ ساتھ تھے۔ شرابخانے میں گھسے تو سوڈا لیمن کی بدبو، شراب کی بدبو، اور سگاروں کے دھوئیں سے پوری فضا نفرت انگیز بنی ہوئی تھی۔ وہ دھواں شا کے پاکیزہ دماغ میں بھر گیا اور ایسا بھرا کہ انہیں ہمیشہ کے لیے شراب اور سگریٹ وغیرہ سے نفرت ہوگئی۔ ان دونوں کا تصور ان کے لیے غلاظت اور بے ہودگی کے ساتھ لازم ہو کر رہ گیا تھا۔

اس کے بعد شا بچوں کے ایک اسکول میں داخل کیے گئے۔ اسکول اور شا کا تعلق اپنی جگہ خود ایک مطالعہ کا موضوع ہے۔ کیونکہ اسکول کے ضابطوں سے ان کا دم گھٹتا تھا اور ہمیشہ کے لیے ضابطہ پرستی۔ اور ہر قسم کے بیرونی ضابطوں کے خلاف ہو گئے۔

اسکول میں داخل ہونے سے پہلے ایک معلمہ کو ان کی تعلیم سپرد کی گئی، لیکن اس سے پڑھتے وقت شا کا دم گھٹتا تھا۔ مجھے کوئی ایسا وقت یاد نہیں،

جب چھپے ہوئے کاغذ کا مفہوم میں نہ سمجھ سکتا ہوں۔ بلکہ میں تو یہ بھی خیال کرسکتا ہوں کہ پڑھا لکھا ہی پیدا ہوا تھا۔"

بہرحال ان کی ابتدائی استانی نے انہیں تھوڑا بہت حساب کتاب جمع، تفریق، ضرب وغیرہ ان کو سکھا دیا تھا۔ تقسیم البتہ وہ نہیں سیکھ سکے۔ کیونکہ انگریزی قاعدے کے مطابق وہ تقسیم کے سوال کراتے وقت وہ کہتی ـــ "دو کو چار میں ڈالا" میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ "میں ڈالا" کیا بلا ہے۔ یہ "میں ڈالا" کا مطلب پہلے دن اسکول میں داخل ہوتے ہی بتایا گیا" اور میں قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ تنہا یہی وہ چیز تھی جو میں نے زندگی بھر میں اسکول سے سیکھی ہے"

اسکول میں داخل کیے جانے سے پہلے وہ اپنے رشتہ کے چچا کے ہاں جاتے تھے وہاں چچازاد بھائیوں کے ساتھ بیٹھ کر لاطینی زبان کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ اور تھوڑی بہت لاطینی ہیں سیکھی۔

شا کی عمر دس برس کی تھی جب وہ اسکول میں داخل کیے گئے۔ وہاں ناموں کے ابتدائی حروف کی ترتیب سے لڑکوں کو نشست دی گئی تھی۔ چنانچہ شا کو S کی لائن میں جگہ ملی۔

"درجے میں ہماری نشستیں حروف ابجد کے حساب سے تھیں، یعنی ان میں کوئی تبدیلی ہو ہی نہیں سکتی تھی"

اسکول کے ضابطے پر پہلا غصہ تو یہیں آیا کہ چاہے تمہارا ذہنی اور علمی مقام کوئی بھی کیوں نہ ہو، مگر تمہاری نشست اپنی جگہ سے نہیں ہل سکتی۔ مگر اس

ترتیب سے ایک فائدہ بھی ہوا۔ جب ماسٹر لڑکوں سے کتاب پڑھواتے اور شا کسی طرح اچک کر دیکھ لیتے تو وہ فوراً حساب کر لیتے کہ جب B سے یہ سوال کیا گیا ہے تو S کے نمبر پر فلاں سوال آئیگا اور اپنا نمبر آنے سے پہلے سوال کا جواب تیار کر لیتے تھے۔ جس سے درجے میں ان کی قابلیت کی دھوم مچ گئی۔

لیکن ابھی دُو چار بڑے سخت مقام باقی تھے۔ ایک تو اُستادوں کا سخت رویہ۔ پھر اسکول میں طالب علموں کا ماحول۔ اور پھر علم الحساب کا مضمون۔ حساب کے مضمون میں شا کا جی نہ لگتا تھا۔

”میں وہ چیز کبھی نہیں سیکھ سکتا جس سے دلچسپی نہ ہو۔ میرا حافظہ ہر چیز کو اندھا دھند قبول کرنے کا عادی نہیں ہے، وہ بعض چیزوں کا انتخاب کر لیتا ہے، بعض کو نامنظور کر دیتا ہے، اور حافظے کا انتخاب علمی حیثیت سے نہیں ہوتا“

چنانچہ شاؔ علم الحساب، خصوصاً الجبرے میں کورے رہے۔ جب کبھی ان سے کہا جاتا ا+ب تو وہ جی ہی جی میں سوچتے کہ الف سے مراد انڈا اور ب سے مُراد بھنا گوشت ــــ اور آگے چل کر وہ ب کا مطلب برانڈی (شراب) اور بائیبل سمجھنے لگے تھے۔ جب ان کے ایک دوست نے ان کے دماغ سے الجبرے کے متعلق یہ غلط تصور صاف کیا۔

اسکولوں میں مقابلے کی اسپرٹ بھی پیدا کی جاتی ہے۔ شاؔ کو زمانۂ طالب علمی میں یہ اسپرٹ بھی بہت کھلتی تھی۔

”مجھے مقابلے کے امتحان سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اگر میں کسی مقابلہ کے امتحان میں شریک ہوؤں اور جیت جاؤں تو مجھے اپنے حریفوں کی شکست و مایوسی سے

جو تکلیف ہوگی وہ بہ نسبت اپنی جیت کے زیادہ ہوگی۔ اور اگر میں ہار جاؤں تو اپنی نظر میں جو وقعت ہے گھٹ سے نقصان پہنچیگا۔

پھر وہاں تعلیم سے زیادہ ضابطہ پرستی اور خانہ پُری کی فکر ہوتی تھی۔ "میں کسی ایسے اسکول میں نہیں گیا جہاں اُستادوں کو میری فکر ہو۔ یا اپنے پیشے کے فرائض کا احساس ہو۔ یا انہیں اتنی مہلت بھی ہو کہ وہ یہ فکر کر سکیں"

چنانچہ اسکول میں میں نے کچھ نہیں سکھا۔ اُستادوں کا جو رویہ طالب علموں کے معاملہ میں ہوتا تھا بیچارے طالب علم اسی کے اثر سے آوارہ بدقماش اور بدلگام ہو جاتے تھے۔ جب لڑکوں کو دبا کر، دھمکا کر رکھا جائیگا، جب اُن کے ساتھ مجرموں کا سا سلوک کیا جائیگا تو اُن سے یہ توقع کیسے کی جاسکتی ہے کہ بھلے مانس بنے رہیں۔ ایک روز اسکول کے ہیڈ ماسٹر کو اچانک معلوم ہوا کہ اس کی بیوی خطرناک بیماری کا شکار ہو گئی ہے۔ ہیڈ ماسٹر پر یہ فوری صدمہ ایسا کاری پڑا کہ اُسے غش آگیا۔ اس پر ماسٹروں کو کلاس چھوڑ چھوڑ کر دوڑنا پڑا۔ شا جس کلاس میں تھے اس کا استاد بھی دوڑا ہوا گیا لیکن اُستاد نے طالب علموں سے نہایت التجا کے ساتھ درخواست کی کہ وہ اس وقفے میں غل غپاڑہ نہ کریں، اور بھلے مانسوں کی طرح پرسکون رہیں۔ لیکن "طالب علموں کے ساتھ اس سے پہلے تو بھلے مانسوں کا سا سلوک نہیں کیا گیا تھا" اُنہوں نے موقعہ غنیمت سمجھا اور وہ شور کیا کہ معاذاللہ۔ اس دن سے شا کو اسکول کے ڈسپلن اور وہاں کی تہذیب پر سے اعتماد جاتا رہا۔

اور بھی کئی چھوٹے چھوٹے واقعے ہوئے جن سے طالب علم برنارڈ شا کا

حساس دل و دماغ بہت متاثر ہوا اور اس کے رویے کو خاص شکل دینے میں ان کا بھی ہاتھ تھا۔

مثلاً طالب علموں کو وہ چیزیں پڑھانا جن میں ان کا جی نہ لگتا ہو۔ شا کو زبانیں سیکھنے سے کوئی دل چسپی نہ تھی۔ وہ تھوڑی بہت لاطینی اسکول سے باہر سیکھ چکے تھے۔ لیکن "اگر اسکول میں لاطینی کی تعلیم میں جبر اور زبردستی نہ کی جاتی تو شاید میں فرنچ کی طرح لاطینی بھی سیکھ گیا ہوتا"

"افسوس کہ میں زبانیں نہیں سیکھ سکتا، عام اہلیت کے آدمی، جتنا عرصہ مجھے جرمن زبان کی لغت خریدنے میں لگ جاتا ہے، اس سے بھی کم عرصے میں سنسکرت سیکھ لیتے ہیں" یہ بھی ان کی ابتدائی تعلیم کا اثر تھا۔ زبانیں سکھلانے کے معاملہ میں شا نے بعد میں وہ بات کہی جو بچپن کی تعلیم نے ان کے ذہن پر نقش کی ہو گی۔

"مجھے پختہ یقین ہے کہ دماغ کو غیر قدرتی کاموں میں لگانا اتنا ہی بے ہودہ اور نامعقول حرکت ہے جتنا جسم سے غیر فطری کام لینا۔ اور لوگوں پر ان چیزوں کا علم حاصل کرنے کے لیے دباؤ ڈالنا جو وہ خود نہیں سیکھنا چاہتے۔ یہ حرکت اس درجہ خوفناک اور نامعقول ہے جیسے کسی آدمی کو بھوسا کھلانا" (جہاں سیکھنے کی خواہش نہ ہو وہاں تجربہ بھی نہیں سکھا سکتا)

چناں چہ لاطینی زبان کے علاوہ علم حساب اور گرامر (قواعد) میں بھی یہی صورتِ حال پیش آئی۔ اپنے بقول وہ چودہ سال کی عمر تک یہ سوال بھی حل نہ کر سکتے تھے کہ اگر کسی بازار میں ڈیڑھ بالیوں کی قیمت تین دھیلے ہوتی ہے تو

۱۱ پیسوں میں کتنی بالیاں خریدی جاسکتی ہیں۔

علم حساب سے یہ بیزاری طریقۂ تعلیم کے بے ڈھنگے پن کی وجہ سے بھی۔ اور کچھ شا کی فطری جبر دشمنی کے سبب۔ اسکول کو وہ ایک قید خانہ سمجھتے تھے۔ جہاں کمزور اور کم عمر ہونے کی وجہ سے بڑے اور مضبوط لڑکے ان کو پیٹا بھی کرتے تھے اور استاد لسے ایک معمول سمجھ کر ٹال جایا کرتے تھے۔

"قید خانے میں تو صرف جسم کو تکلیف دی جاتی ہے لیکن اسکول میں جسم اور دماغ دونوں کو۔ قید خانے میں کم از کم یہ تو ہوتا ہے کہ تمہاری حفاظت کی جاتی ہے اور تمہارے ساتھی قیدیوں کی طرف سے مار پیٹ یا جبر و تشدد نہیں ہونے دیا جاتا لیکن اسکول میں یہ سہولت بھی نصیب نہیں ہوتی"

گرامر، لاطینی اور علم حساب میں ناکام رہنے کے باوجود اسکول میں ہی ان کی ادبی صلاحیت نمایاں ہونے لگی تھی۔ مضمون وہ اچھا لکھتے تھے اور ادبی کتابیں زیادہ پڑھتے تھے۔ کورس کی کتابیں کم اور باہر کی کتابیں زیادہ مطالعہ کرنا ان کا مشغلہ تھا۔ "ہمیں مضمون لکھنے بٹھایا گیا۔ میں نے پلوں کے نیچے یعنی تالاب کا جو نقشہ کھینچا تھا، وہ اتنا عمدہ بیان تھا کہ مجھے اول درجہ ملا لیکن اس چیز کا نہ کچھ انعام ملا، نہ کوئی خاص اہمیت دی گئی" کیوں کہ انعام اور اہمیت کے مضامین میں لاطینی زبان کو مقام حاصل تھا۔

وہاں سے اُٹھا کر وہ دوسرے پرائیوٹ اسکول میں بھیج دیے گئے۔ والدین کو صرف اس سے غرض تھی کہ بچہ اسکول جائے اور آجائے وہاں اس نے کچھ پڑھا یا نہیں، یا اس کے ذہن پر کیا گزر رہی ہے، اس سے کسی کو واسطہ نہ تھا۔

یہ اسکول ایک رومن کیتھولک اسکول تھا، لیکن یہاں ذات برادری وغیرہ کی کوئی تفریق نہ تھی، اس میں غریب دوکانداروں اور امیر سوداگروں کے بچے، پروٹسٹنٹ شرفا، اور کیتھولک جہلا اور غربا کے بچے ایک ساتھ پڑھ سکتے تھے۔ کم سن برنارڈ شا پر بچپن کی یہ روایت نقش تھی کہ خداوند عالم اصل میں پروٹسٹنٹ ہے اور پروٹسٹنٹ فرقے ہی کو پسند کرتا ہے۔ رومن کیتھولک مرتے ہی جہنم داخل ہونگے۔ اور رومن کیتھولک نیچ ذات ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ باپ نے ایک دفعہ انہیں کسی لوہار کے لڑکے کے ساتھ کھیلتے ہوئے دیکھ کر ڈانٹا تھا اور انہیں اچھی طرح سمجھایا تھا کہ ہم شرفا کے بچوں کو ان رذیل لونڈوں کے ساتھ نہیں کھیلنا چاہیے۔ تم ان سے الگ تھلگ رہا کرو۔

اپنی شرافت اور بڑائی کا نقش پہلے سے موجود ہی تھا۔ پرائیویٹ اسکول میں پہنچے تو انہوں نے کیتھولک بچوں سے الگ تھلگ رہنا شروع کر دیا کھیلنے کے وقت وہ ان ہم عمروں کے ساتھ کھیلتے بھی نہ تھے بلکہ استادوں کے ساتھ اِدھر سے اُدھر ٹہلتے رہتے تھے۔ اس وقت شا کی عمر تیرہ [۱۳] سال تھی۔ یہ صورت پانچ چھ مہینے جاری رہ سکی اور شا نے "رذیلوں کی اس صحبت" میں جانے سے انکار کر دیا۔ باپ کو جب پتہ چلا کہ شا کے مشفق اور شا کی ماں کے معلم اور ساتھی نے ان کے بچے کو ایسی جگہ داخل کرا دیا تھا تو انہوں نے بھی بیٹے کی حمایت کی اور اسے فوراً وہاں سے اٹھا کر شرفا کے پروٹسٹنٹ اسکول میں داخل کرا دیا گیا۔ اس اسکول میں ۱۸۷۱ء تک جب ان کی عمر پندرہ [۱۵] سال تھی، تعلیم پائی اور "یہ میری آخری اسکول قید ثابت ہوئی"

اس "آخری اسکول قید" میں شا کی جرأت عمر کے ساتھ ساتھ کافی بڑھ گئی تھی۔ وہ کلاس میں اپنا وقار قائم رکھنے کے لیے نہ صرف اسکول کا کام تیار کر لیتے تھے بلکہ ماسٹروں کی غلطی پر انہیں کھرے جوابات بھی دے جاتے تھے۔

ایک دن کسی نے کوئی بدعنوانی کی۔ ماسٹر نے کوشش کی کہ پتہ چلائے، یہ حرکت کس نے کی ہے تاکہ اس کو سزا دی جائے "ہر طالب علم سے یکے بعد دیگرے پوچھا گیا کہ ایسا کس نے کیا ہے۔ جب میرا نمبر آیا تو میں نے جواب دینے سے انکار کر دیا۔ اور اس کی دلیل یہ دی کہ کوئی طالب علم قانوناً اپنے آپ کو سزاوار ٹھیرانے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ اور سوالات جو کیے جا رہے ہیں ان کا مطلب یہ ہے کہ طالب علموں کو جھوٹ بولنے کی ترغیب دی جائے" اس کے دو ایک دن بعد تک تو یہ خیال رہا کہ اس بد زبانی کی سزا مجھے دی جائیگی، لیکن سزا نہیں ملی" کیونکہ صورت حال بالکل نئی تھی" اور اس کی سزا پہلے سے مقرر نہ تھی۔ "جب افسران بالا کو کسی معاملہ میں یہ خبر نہیں ہوتی کہ کیا کیا جائے تو وہ صرف وہی کر سکتے ہیں جو پچھلی دفعہ کیا گیا تھا۔ یہاں میں نے وہ حرکت کی تھی جو اس سے پہلے نہیں کی گئی تھی چنانچہ انہوں نے اس کے جواب میں کچھ نہیں کیا۔ اور نہ پھر آئندہ ویسے سوالات کیے گئے گویا یہ میری طرف سے پہلی اصلاح تھی"

شا کی تعلیم و تربیت میں صرف ماں، باپ اور اسکول ہی کا دخل نہیں ہے بلکہ دو شخصیتیں اور شامل ہیں۔ ایک تو ان کے رشتے کے ماموں ڈاکٹر، جو گریجویٹ تھے اور انہیں ادب سے بڑا ذوق تھا اور شا کے پڑھنے لکھنے میں دلچسپی رکھتے تھے۔ دوسرے لی۔ جس کے متعلق شا کہتے ہیں کہ وہ ایک زبردست قوت کشش اور بڑی پُر اثر شخصیت

رکھتا تھا"

لی۔ ان کے گھر میں عجیب و غریب طریقے سے داخل ہوا۔ وہ ڈبلن میں بڑا مشہور موسیقار تھا اور موسیقی کی تعلیم کو اس نے اپنا ذریعہ معاش بنا رکھا تھا۔ جا بجا موسیقی کے پروگراموں کی تنظیم کرتا اور اپنے دوستوں اور شاگردوں کی موسیقی کا مظاہرہ کراتا۔ چونکہ اس زمانہ میں اس طرح زندگی بسر کرنے والے اچھی نظر سے نہیں دیکھے جاتے تھے اس لیے لی کے مخالفین کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ اس نے شا کی والدہ کو موسیقی کی تعلیم دینی شروع کی، اور ان کی آواز کے جادو کو ایسا نکھار دیا کہ شا کے گھر میں موسیقی کا ماحول پیدا ہو گیا۔ اور خود شا نے اپنی ماں سے موسیقی کی بنیادی تعلیم حاصل کر لی۔

شا کا گھرانہ چونکہ غریب ہو چکا تھا اس لیے وہ اعلیٰ درجہ کے شاندار مکان کا کرایہ ادا نہیں کر سکتا تھا، اور اگر کسی گرے ہوئے علاقے میں گھر لیا جاتا تو وہاں لی شا کی والدہ کو موسیقی کی تعلیم دینے کے لیے نہ آسکتا۔ وہ خود بے گھر بار بھی تھا۔ چناں چہ طے پایا کہ لی وہیں شا کے مکان میں کرایہ دار کی حیثیت سے شریک ہو جائے اور "لی اکیلا ہونے کے باوجود ہمارے مکان کے دو کمروں پر قابض ہو گیا۔ ایک میں خود رہتا تھا، دوسرے میں سامانِ موسیقی"

یہ شرکت اتنی اہم ہو گئی کہ میری ماں ہر مشغلے سے بے نیاز ہو کر صرف موسیقی کے پروگراموں میں لگ گئیں۔ اور بعد میں جب لی لندن چلا گیا تو کچھ عرصہ کے وقفے سے وہ بھی لندن چلی آئیں۔

"لی کا اثر ہمارے گھرانے پر ایسا تھا، اور بعد میں وہ ہمارے گھر کا ایک فرد

ہوگیا تھا، کہ لی کے اثر سے ہی میں نے علمی سند کے متعلق شک وشبہ رکھنا اور اسناد کو ماننے سے انکار کرنا سیکھا۔ جو ابھی تک مجھ میں باقی ہے۔" (۱۹۴۸ء) لی ان کی والدہ کا استاد ہی نہیں بلکہ زندگی بھر کا شریک کار رہا۔ بلکہ شا کے متعلق لندن میں جو مخالفانہ افواہیں پھیلی تھیں ان میں لی اور شا کی والدہ کے تعلقات کے متعلق بھی طرح طرح کی افواہیں مشہور ہوگئیں تھیں۔

شا کے بیان کے مطابق انہیں تین استاد ملے۔ ایک معمولی خواندہ باپ، ایک گریجویٹ ماموں اور تیسرے موسیقار لی۔ اپنے ڈرامے "بے جوڑپن" (Mis alliance) میں جو انہوں نے عاشق کے تین باپ دکھائے ہیں اس میں بچپن کے اس تربیتی ماحول کا بھی ہلکا سا اثر ہے۔ اور اسے شا نے تسلیم کیا ہے کہ "میرے بھی تین باپ تھے۔ ایک قدرتی باپ اور دو باہر کے لوگ"

نوکری اور ذریعۂ معاش

پندرہ سال کی عمر میں ہی شا کو خود کھانے کمانے کی فکر پڑ گئی، اور وہ ڈبلن کے مکانات کی ایک دلال کمپنی میں کسی عمدہ دار عزیز کی سفارش سے بحیثیت چپراسی ملازم ہوگئے۔ وہاں چونکہ رشتہ داروں کے اثرات کام کر رہے تھے، اس لیے جسمانی مشقت کے کام سے بچ گئے۔ "اور میں نے اپنے آپ کو جونیر کلرک کہنا شروع کر دیا" یہاں شا کی ۱۸ پونڈ سالانہ تنخواہ طے ہوئی۔ وہ ڈاک بھی لے جاتے تھے، خطوں کو فائل کرتے تھے، لفافے وغیرہ بناتے تھے، اور دوپہر کو صرف ایک آنے کا کھانا کھا کر پیٹ بھر لیتے تھے۔

چپراسی اور کلرک کی دوپہلو نوکری کے زمانے میں شا نے اپنا خط صاف کرلیا اور ستھرا لکھنے لگے۔ فائلوں کی پہچان بھی ہوگئی۔ یہاں بھی انہیں وہی اسکول والا

تجربہ ہوا کہ جب کوئی مشکل آکر پڑتی تھی تو افسر یہی حکم دے دیتے تھے کہ دیکھ لو پچھلی بار ایسے موقعہ پر کس طرح کام کیا تھا۔ اور یہ "پچھلی بار" کا سبق شا کو اچھی طرح یاد ہو گیا تھا۔

اتنے میں "بڑے خزانچی" کا عہدہ خالی ہوا۔ شا نے خلا پُر کرنے کے لیے اس کا چھوٹا موٹا کام خود سنبھالنا شروع کر دیا، اور کام میں محنت کی۔ افسران نے دیکھا تو نئے خزانچی کو لینے سے پہلے شا کو عارضی طور پر بڑے خزانچی کا قائم مقام بنا دیا۔ اور بعد میں وہ اپنی کارگزاری دکھا کر مستقل خزانچی ہو گئے۔ اور ۴۸ پونڈ سالانہ تنخواہ مقرر ہو گئی۔

"لیکن میرا جی اس کام میں لگتا نہیں تھا" کیونکہ حساب میں کمزور ہونے کی وجہ سے ہر چھ مہینے بعد کے ٹوٹل میں خود اپنی جیب سے نقصان بھرنا پڑتا تھا۔
اب وہ دفتر کے باعزت لوگوں میں شمار ہونے لگے تھے۔ کچھ دن بعد کالجوں کے پڑھے لکھے نوجوان بحیثیت امیدوار دفتر میں آنے لگے۔ یہ کھاتے پیتے شرفا کے لڑکے تھے۔ شا کو سپرد کیے گئے کہ انہیں دفتری کام کی مشق کراتے رہیں۔ انہوں نے دفتری کام کی جگہ موسیقی کی مشق شروع کرا دی۔ ایک روز ایک نوجوان لڑکے کو وہ گانے کی مشق کرا رہے تھے کہ اتنے میں ناگہانی سینئر پارٹنر (کمپنی کا بڑا شریک مالک) اندر آ گیا اور اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ دفتر کے اوقات میں ملازمت کے اُمیدوار یہ کنسرٹ پروگرام کیسے کر رہے ہیں۔

اس دن سے دفتر میں شا کی ماہر موسیقی کی حیثیت تسلیم ہونے لگی۔ ان پر جو ڈانٹ پڑی وہ پی گئے کیونکہ دفتر کی سوسائٹی کچھ بہتر ہو گئی تھی، اور چاروں

طرف تعلیم یافتہ نوجوانوں کا مجمع رہنے لگا تھا۔

پھر بھی بیزاری باقی تھی کہ ایک اہم واقعہ ہو گیا۔ شا دفتر میں لوگوں سے مذہبی اور اعتقادی بحثیں کیا کرتے تھے۔ اور بعض اوقات عام معتقدات کے خلاف بات کہہ جاتے تھے۔ ایک روز ان کے افسر اعلیٰ کو اس کا پتہ چل گیا۔ اس نے شا کو اپنے کمرہ میں بلایا اور سمجھا بجھا کر کہا کہ دفتر میں اس قسم کی بحثیں نہیں ہونی چاہییں۔

"میں نے اپنے ضمیر کے خلاف سینئر ایمپلائر سے وعدہ کر لیا، اس لیے نہیں کہ میری گزر اوقات کا ذریعہ خطرے میں پڑ گیا تھا (ویسے بھی میں اپنی کشتی پھونک ڈالنے میں کبھی ہچکچاہٹ نہیں کرتا ہوں) بلکہ اس لیے کہ میں ایسی پابندیوں کے درمیان مستقل طور پر بسر کرنا نہیں چاہتا تھا۔"

وعدہ کر کے باہر نکلے تو بیزاری اپنی حد کو پہنچ چکی تھی۔ چنانچہ چند روز بعد ہی شا نے وہاں سے استعفا دیا اور اپنی نیک چلنی کا سرٹیفکٹ لے کر روانہ ہو گئے اور ایسے روانہ ہوئے کہ پھر تیس سال تک ڈبلن نہیں گئے۔

لندن میں

ماں پہلے سے لندن آچکی تھیں اور ان سے پہلے لی وہاں موجود تھا ۱۸۷۶ء میں برنارڈ شا بھی وہیں چلے آئے۔ لندن آئے تو کوئی سہارا نہیں تھا۔ اور جو سہارے تھے، وہ کمزور۔

"لندن آیا تو میں تمام بدیسیوں میں سب سے زیادہ بدیسی تھا۔ کیونکہ مجھے کسی برطانوی یونیورسٹی میں تعلیم و تربیت نہیں ملی تھی . . . .
میں غیر تعلیم یافتہ نہیں تھا۔ لیکن میری تعلیم ایسی تھی جس سے برطانوی گریجویٹ

نابلد تھے"

یہاں بھی شانے کچھ دن معمولی نوکری کے فرائض انجام دیے۔ مگران سے خرچ بھی چلنا دشوار تھا۔ وہ ملازمت بھی چھوڑ دی۔ قلم کے ذریعے زندگی بسر کرنے کا جذبہ بیقرار تھا۔ کئی رسالوں کو خط لکھا، کئی پبلشروں سے ملے، لیکن

"لندن نے کسی شرط پر بھی مجھے قبول کرنے سے انکار کردیا۔۔۔۔ اپنے آپ کو قبول کرانے یا برداشت کرانے کے لیے مجھے لندن کا دماغ بدلنا تھا"۔

صرف ایک رسالے میں ایک مضمون منظور کیا گیا، جس سے پانچ شلنگ معاوضہ ملا۔ ایک پبلشر سے ملاقات ہوگئی، جنھیں پرانے بلاکوں پر اشعار لکھوانے تھے تاکہ انہیں اسکول کی انعامی کتابوں میں شامل کیا جا سکے۔ "میں نے ان کی منشا کے مطابق ایک پیروڈی (مزاحیہ) نظم لکھ دی۔ اور ایک دوستانہ مذاق کے طور پر انہیں بھیج دی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ انہوں نے میرا شکریہ ادا کیا اور پانچ شلنگ معاوضہ بھیجا۔ مجھ پر اس کا اثر ہوا اور میں نے دوسری تصویر کے لیے سنجیدگی سے نظم لکھ دی۔ اس سنجیدہ نظم کو پبلشر نے مذاق سمجھا اور قابلِ اعتراض مذاق" اس کے بعد شا نے کبھی کسی کے لیے نظم نہیں لکھی۔

"برٹش میوزیم ریڈنگ روم" میں بیٹھ کر برنارڈ شا کارل مارکس کا مطالعہ کیا کرتے تھے۔ وہاں ولیم آچر سے ۱۸۸۳ء میں ملاقات ہوگئی۔ اور انھوں نے

شاکے ذریعۂ معاش کے لیے کوشش کی۔ تھوڑے دن بعد وہ انہیں لے کر Pall mall Gazette میں گئے اور انہیں تبصرہ نگاری پر مامور کرادیا۔ اس وقت تک لندن آئے ہوئے شا کو نو سال گزر چکے تھے اور اس نو سال کے طویل عرصہ میں انہوں نے صرف چھ پونڈ کمائے تھے۔ اور وہاں سے The World رسالے میں فنی تنقید نگار کی حیثیت سے جگہ مل گئی۔ اتنے عرصے تک عسرت سے بسر کرنے کے بعد شا کو پہلی بار روپیے کی آمد اور شہرت کا دروازہ کھلتا نظر آیا۔ اس سال انہوں نے قلم کے ذریعے ایک سو سترہ پونڈ کمائے۔ ۱۸۸۸ء میں Star رسالے کی بنیاد پڑی۔ اس کے پولیٹیکل اسٹاف میں لے لیے گئے۔ لیکن ہر مضمون ناقابل قبول قرار دیا گیا (کیونکہ شا نے یہ ملازمت سیاسی مقصد پیش نظر رکھ کر کی تھی جس کی تفصیل کہیں اور آئیگی) بعد میں جب انہوں نے محسوس کیا کہ یہ ملازمت ہاتھ سے جاتی رہے تو خود تجویز کیا کہ کوئی مستقل کالم دے دیا جائے جس میں غیر سیاسی مسائل پر وہ لکھا کرینگے۔ چنانچہ "Cornodi dascetto" کے فرضی نام سے وہاں لکھتے رہے اور بہت مقبول ہوئے۔

۱۸۹۰ء میں لوئی اینجل جو اس زمانے کا سب سے بڑا موسیقی کا نقاد تھا مصیبت میں پھنس گیا اور اسے ملک چھوڑنا پڑا۔ وہ گیا تو ولیم آرچر کے کہنے سے شا کو موسیقی کے تنقید نگار کی حیثیت سے لے لیا گیا۔ The World کے اڈیٹر کا انتقال ہوا اور نئے اڈیٹر سے شا کی نبھ نہ سکی اگرچہ اڈیٹر سے زیادہ خود شاہ مقبول عام ہوتے جارہے تھے لیکن مجبور ہو کر ۱۸۹۵ء میں انہوں نے

استعفا دے دیا۔ اور وہاں سے ہٹ کر "Saturday review" میں تھیئٹر کے نقاد کی حیثیت سے نوکری کرلی۔ یہاں سے انہیں چھ پونڈ ہفتہ مستقل معاوضہ ملنے لگا۔ اور یہاں ۱۸۹۸ء تک وہ باقاعدہ لکھتے رہے یہ شا کے ذہنی اور جسمانی شباب کا ہی نہیں بلکہ ان کی شہرت کے عنفوان شباب کا بھی زمانہ تھا۔ ۱۸۹۸ء میں ہی انہوں نے ایک دولتمند عورت پے نی ٹاؤن شینڈ سے شادی کرلی اور کچھ عرصے بعد لندن سے چالیس میل دور سینٹ آئٹ لارنس ایک گاؤں کے پرانے بنگلے میں چلے گئے اور وہیں سے آخری سفر پر ۲۔ نومبر ۱۹۵۰ء کو روانہ ہو گئے۔

خدوخال

حلیہ — وضع قطع

لندن کے ایک تھیٹر میں حاضرین "Cyrano De Bergerac" ڈرامہ دیکھنے کے لیے منتظر بیٹھے ہیں۔ پردہ ابھی ہٹایا نہیں گیا۔ اسٹیج پر ایک بڑی کرسی پڑی ہے۔ کرسی کی آڑ سے ایک شخص تیزی کے ساتھ اٹھا اور کرسی پر جھنڈے کی طرح نصب ہو گیا۔ عمر یہی ہوگی تقریباً چالیس سال۔

بھورے رنگ کا کوٹ ہے جس پر اس طرح ہلکے شکن پڑے ہوئے ہیں جیسے کوٹ کو الماری کے بجائے کسی مٹکے میں رکھا گیا تھا۔ سرخی مائل داڑھی ہے۔ چھریرا مگر تندرست بدن ہے۔ پیشانی پر گہرے سوچ بچار کی وجہ سے چمک کی بجائے پُرسکون کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ بھووں میں تناؤ پایا جاتا ہے، اور وہ چہرے سے کچھ آگے بڑھ گئی ہیں۔ چہرے کے رنگ، داڑھی اور سر کے بالوں کے رنگ اور لباس کے رنگ میں کسی قدر یکسانیت اور ہم آہنگی پائی جاتی ہے، مگر ایسی جسے ارادۃً پیدا نہیں کیا گیا۔ کپڑے اگرچہ معمولی اون کے ہیں لیکن بظاہر سمور کی کھال کے معلوم ہوتے ہیں۔ جوتوں پر کئی دن پہلے پالش ہوئی تھی، لیکن صفائی باقی ہے۔ لباس اور وضع قطع اگرچہ انگریز شرفا کی سی نہیں ہے مگر اس میں سلیقہ ضرور

پایا جاتا ہے۔ سر کے بال اتنے بڑے نہیں ہیں جو عام طور پر فنکار اپنی پہچان کے لیے بے ترتیب چھوڑ دیتے ہیں۔ اگرچہ بالوں کو توجہ کے ساتھ بنایا سنوارا نہیں گیا، لیکن ان میں ترتیب بھی ہے اور اعتدال بھی۔ سر پر ہیٹ ہے جو کلرک سے لے کر پرانے لارڈ تک سب پہنتے ہیں۔ اس میں کوئی خصوصیت نظر نہیں آتی۔

اسٹیج پر قدم رکھتے ہی اس شخص نے بالکل آئرش انداز میں ایک ہاتھ بلند کیا، دوسرا ہاتھ پتلون کے بائیں کونے پر کمر اور کولھے کے درمیان سنبھال لیا۔

"خواتین اور حضرات!" ڈرامہ شروع ہونے سے پہلے میں آپ کو..."

یہ جارج برنارڈ شا ہے جسے حاضرین میں اکثر لوگ پہلے بھی مختلف اسٹیجوں پر دیکھ چکے ہیں۔ کوچہ و بازار میں تقریر کرتے دیکھ چکے ہیں۔ سوشلسٹوں کی مختلف تحریکوں میں اس کی تقریریں سن چکے ہیں اور لندن کے بڑے بڑے بقراط اس کے آگے کان پکڑتے ہیں۔

شا کے لب کھولنے سے پہلے جو خاموشی تھی وہ ایک گمبھیر سناٹے میں بدل گئی۔ شا کی آواز "بلور پر اشرفی کی جھنکار" کی طرح بکھرنے لگی۔ حاضرین کے چہروں پر مسرت کی لہر دیکھی جاسکتی ہے۔ اس کی آواز میں ایک فیصلہ کن قوت ہے، استدلال کی کیفیت ہے، اور موسیقار کا سا سوز اور دلکشی ہے۔ ایک بے تکلف اپیل ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ تقریر کرنے اسٹیج پر نہیں آیا بلکہ حاضرین سے کسی بحث طلب موضوع پر صرف

وہی باتیں کہنے آیا ہے جن کو وہ پہلے سے مانتے آئے ہیں۔

(Scoundrel)

"میں تو کہونگا کہ چالیس برس سے اوپر کا ہر شخص بدقوارہ ہوجاتا ہے"

ایک ایک حرف الگ الگ سُنا جاسکتا ہے۔ حرکت وسکون صاف سُنائی دیتے ہیں "اسکاؤنڈرل" کا لفظ شا کی زبان سے اس طرح ادا ہوا کہ لفظ کے ساتھ پورا مفہوم بھی اُبھر آیا۔

"مگر شا! عورتوں کے بارے میں کیا خیال ہے ؟" ایک عورت نے پوچھا "عورتوں کے معاملے میں تیس برس کی میعاد ہے" اور پورا مجمع بُری طرح لوٹ پوٹ ہوگیا۔

شا کے چہرے پر ہنسی کے آثار نہیں تھے — وہ اور تن کر کھڑے ہوگئے۔ جیسے وہ پہلوان جو اپنے جوڑ کو بیچ اکھاڑے میں چت کر کے تن جاتا ہے اور اسے مقابل کے ہر شخص کے سامنے اپنی فوقیت کا احساس ہوتا ہے۔

شا تقریر کر رہے ہیں۔ انداز مناظروں کا سا ہے جلے منطقیوں کے جیسے ہیں۔ آنکھوں سے، بھووں سے، ہاتھوں سے ایک ایک جملے کی تصویر کھینچتے جاتے ہیں۔ آواز میں اتار چڑھاؤ بڑھتا جاتا ہے۔ کاندھے چڑھاتے ہیں اور چھوڑ دیتے ہیں۔ آستین اُلٹتے ہیں اور یونہی رہ جاتے ہیں۔ ان کے جسم کی ایک ایک حرکت الفاظ کا ضروری جزو معلوم ہوتی ہے۔ سر کو وہ ہاتھوں کے ساتھ جھٹکا دیتے ہیں۔ کبھی آگے کی طرف کبھی داہنی جانب، کبھی بائیں طرف اور کبھی ایک دم پیچھے۔ ہر جھٹکے کے ساتھ الفاظ کو جھٹکا لگتا ہے — اور جملہ کی تان

ایسے لفظ اور ایسے اشارے پر ٹوٹتی ہے جس سے حاضرین کی وہ کیفیت ہو جاتی ہے جیسے گرم لوہے پر بھاری گھن پڑا۔ اور لوہا اور چپٹا ہو گیا۔

شا بہت بلند آواز آدمی نہیں ہے۔ لیکن اس کی آواز میں بے مثل لطافت ہے نشتر کی سی تیزی اور تلوار کی سی لچک۔ شا کو بولتے وقت اس بات کی کوئی پروا نہیں کہ کہیں کوئی جملہ حاضرین کی توہین نہ بن جائے۔ وہ کہیں اسے چیلنج نہ کر دیں۔ خود شا ہر ایک مخالف کو چیلنج کر رہے ہیں۔ لب ولہجہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں پورا یقین ہے کہ تمام حاضرین ایک ایک لفظ اور ایک ایک نقطے پر اُن سے متفق ہیں۔ اور اگر کہیں کوئی کٹر امخالف ٹوک بیٹھا تو انتہائی جرأت، موقع شناسی اور ٹھنڈے طریقے سے اس کی شورش کو ٹھنڈا کر دینگے۔

ایسے بھی کئی موقعے آئے اور شا نے میدان فتح کر لیا۔

⁂

بعض نامہ نگاروں نے ان کا حُلیہ لکھا تو اس میں یہ بھی لکھ دیا کہ شا فلینل کی قمیص پہنتے ہیں۔ اُنہوں نے تردید کی کہ شا نے زندگی بھر فلینل کی قمیص نہیں پہنی۔ قمیص تو کبھی پہنی ہی نہیں۔ بھلا اپنے دھڑ پر دو دو پوشاکیں منڈھنے کی کیا ضرورت ہے۔ سر سے پیر تک اندر وہ ایک اور چیز پہنے رہتا ہے جس سے کوئی قمیص بنانے والا قطعی واقف نہیں۔

جب لندن کی اونچی سوسائٹیوں میں اکڑا ہوا سفید کالر لگانا ضروری قرار پایا تو شا نے بھورے رنگ کا کالر حاصل کر کے صرف خاص خاص موقعوں پر گردن کے گرد لپیٹ لیا۔ بعد میں مختلف رنگ کے کالر لگائے۔ اکثر وہ ایک ہی

رنگ کے دو مختلف صورتوں کے کالر لگاتے تھے اور اسی وضع کو پسند کرتے تھے۔

واسکٹ یا جیکٹ جو شروع میں معمولی قسم کی ہوا کرتی تھی بعد میں لندن کے سب سے اعلیٰ درزیوں کے یہاں سلنے لگی۔ عام طور پر سادہ اور دھاریوں سے پاک ہوا کرتی تھی۔ سوٹ بھی دھاری دار نہیں ہوتا تھا۔ اکثر تسمے دار بوٹ پہنتے تھے اور بڑھاپے میں بھی وہی پہنتے رہے۔ البتہ ساٹھ سال کے لگ بھگ پہنچتے پہنچتے انہوں نے ایک عصا بھی سنبھال لیا تھا۔ جو عصائے پیر کے بجائے استادوں کی قمچی سے زیادہ مشابہ تھا۔

ہلکی اور لطیف مسکراہٹ سے ان کے چہرے پر جو لہریں پڑی رہتی تھیں وہ بڑھاپے کی جھریوں میں چھپ گئیں لیکن ان میں آخر وقت تک اتنی تازگی تھی کہ ہر وقت مسکراتے ہوئے نظر آتے تھے۔

کسی نے (ایک بار کے سوا جب ان کی بیوی کا انتقال ہوا) انہیں کبھی روتے نہیں دیکھا اور نہ کبھی قہقہہ لگاتے سُنا۔ بے تکلفی اور سادگی کے باوجود ان کے حلیے، وضع قطع اور چہرے پر ایک رکھ رکھاؤ مستقل طور پر پایا جاتا تھا۔

اخلاق و عادات ایک خدا ترس موجودہ سماج سے متنفر، ایک محنتی فنکار، ٹھنڈے مزاج کے منطقی، اور ایک آئرش باشندے کے اخلاق و عادات کے نچوڑ سے برنارڈ شا نے جنم لیا ہے۔

خدا ترس: اس معنی میں کہ وہ گوشت نہیں کھاتے۔ شراب نہیں پیتے۔ سگرٹ یا تمباکو سے شوق نہیں کرتے۔ طمانچے کے جواب میں طمانچہ نہیں مارتے کسی شخص پر جسمانی یا ادبی حملہ اس کی تذلیل اور اسے دکھ پہنچانے کے لیے نہیں

کرتے۔ اور جب انہیں یقین ہو کہ ان کی مہربانی کسی کام آسکتی ہے تو وہ نہایت مہربانی
اور نرمی سے پیش آتے ہیں۔ چھبیس برس کی عمر میں انہوں نے گوشت کھانا چھوڑ دیا تھا
اس لیے نہیں کہ جانوروں کا کاٹنا ظلم ہے، بلکہ اس لیے کہ مردہ جانور چبانا بدمذاقی
اور گندگی ہے۔ اس پر ان کے ایک لارڈ دوست نے جملہ کسا ہے کہ اگر جانور زندہ
کھائے جاسکتے تو شاید برنارڈ شا کو گوشت کھانے پر کوئی اعتراض نہ ہوتا۔ اصلیت
یہ ہے کہ ان کی نفاست پسندی انہیں گوشت سے زیادہ سبزی ترکاری کی طرف
لے گئی ــــ جو بالکل قدرتی بات تھی۔

پہلے تو میں آدم خور تھا، لیکن میں نے دیکھا کہ سبزی جیسی اعلیٰ خوراک ہوتے ہوئے
مردہ جانوروں کے جسم کھانا حماقت ہے۔ ۱۸۸۰ء میں جب وہ مشہور انگریزی شاعر
شیلی کی نظمیں پڑھ چکے تو انہوں نے شیلی کی تعلیم کے اثر میں گوشت کھانا ترک
کر دیا۔ اس پر انہیں تین خاص اعتراضات تھے۔ (۱) جانور ہماری طرح کی مخلوق
ہیں۔ انہیں چبا جانا قابل نفرت ہوگا (۲) سوشل لحاظ سے نقصان دہ ہے۔
اس طرح آدمی اپنی عادات میں جانوروں کا غلام اور پابند ہو کر رہ جائیگا۔
(۳) صحت اور تندرستی کا بھی سوال ہے۔ گوشت کھانے سے جسم کو نقصان پہنچتا
ہے، اور قوت بھی کم ہو جاتی ہے۔ "مجھے مردار لوگوں کو چلتے پھرتے دیکھ کر نفرت ہوتی
ہے۔ یہ بالکل غیر فطری بات ہے"

شراب اور سگریٹ کو وہ جسم کی عمارت میں گندگی اور غلاظت پھیلانا سمجھتے
ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ جو لوگ گوشت کھانے، شراب پینے اور تمباکو استعمال کرنے
کی عادت رکھتے ہوئے بھی صحت مند، ذہین اور صاحب دماغ ثابت ہوئے، اگر

وہ ان عادتوں کو چھوڑ دیتے تو اور زیادہ ذہین، زیادہ طاقتور، زیادہ صاحبِ دماغ اور روشن فکر ہوتے۔

میرے دماغ کو کسی مصنوعی تحریک کی ضرورت نہیں ہوتی .... میں کھلے لفظوں میں کہتا ہوں کہ جو شخص مردار جسم (گوشت) اور وہسکی سے پیٹ بھرتا ہے وہ کبھی اتنا اعلیٰ فرض انجام نہیں دے سکتا جس کی اہلیت اس میں پائی جاتی ہے" کسی نے ان کی سبزی خوری پر طنز کیا تو اُنھوں نے کہا۔ مجھ جیسا آدمی، جس کے پاس ایسی روحانی قوت ہو، بھلا وہ مردہ جسموں کو کیسے کھا سکتا ہے"

لیکن وہ اپنے سامنے ان تمام عادتوں کو برداشت کرتے تھے۔"میں خود تمباکو نہیں پیتا لیکن اپنے سامنے تمباکو پینے کو برداشت ضرور کرتا ہوں اگر ایسا نہ کروں تو انسانی سوسائٹی سے میرا قطع تعلق ہو جائے ..... لیکن میں اس حقیقت سے آنکھیں (یا ناک) بند نہیں کر سکتا کہ (تمباکو اور شراب پینا) ایک لچر اور مکروہ عادت ہے

⁂

موجودہ سماج سے نفرت اس طرح آئی کہ خود موجودہ سماج نے ان سے نفرت کرنے میں پہل کی۔ سب بچوں کی زندگی کی ابتدا گھر سے ہوتی ہے، ان کی ابتدا گھر بار اُجڑ جانے سے ہوئی۔ باپ کا شرابی ہونا اور کاروبار میں ناکام ہو جانا پہلا نقش تھا جوان کے ورق سادہ جیسے ذہن پر قائم ہوا۔ اسی کے ساتھ ماں اور باپ کا ایک دوسرے سے الگ جانا۔ اُس کے بعد نابالغ شا کا ایک معمولی کمپنی میں چپراسی اور اس کے بعد کلرک یا خزانچی

کی جگہ کام کرنا ۔۔۔ وہاں مذہب اور اعتقادات کے سلسلے میں بحث پر پابندی لگ جانا۔ وہاں سے لندن آنا اور پبلشروں کی طرف سے کورا جواب۔ مصائب اور مشقت کی زندگی۔ جس کی ایک جھلک یہ ہے کہ نو سال تک برنارڈ شا دن کے وقت اپنے گھر سے باہر نہیں نکل سکے اور اچھے کپڑے نہ ہونے کے ڈر سے وہ چوہوں کی طرح دبکے پھرتے تھے۔ اور ایک زمانہ تک وہ اعلیٰ سوسائٹی میں جاتے ہوئے ڈرتے تھے، اس کے بعد سوشل ڈیموکریٹک فیڈریشن کے جلسے میں جب وہ پہلی بار گئے تو وہاں ان کا مذاق اُڑایا گیا کیونکہ وہ معاشیات اور اقتصادیات ۔۔ خصوصاً مارکس ازم سے بالکل بے بہرہ تھے ۔۔۔ یہ تمام نقوش تھے جنہوں نے شا کے اخلاق و عادات میں موجودہ سماجی ڈھانچے اور اس کے ناخداؤں کے خلاف کھُرا پن پیدا کر دیا تھا۔ اور وہ ان تمام لوگوں اور جماعتوں اور اداروں کے خلاف سختی اور تلخی سے پیش آنے لگے تھے جنہوں نے لاکھوں انسانوں کو ذلیل سمجھا تھا۔

ہنری اِرونگ کا جب جلوس جنازہ نکالا جا رہا تھا تو بڑے بڑے ادیب معززین، امرا اور صاحب حیثیت لوگ، اور وہ بھی جو اسے عوام دشمن سمجھتے تھے اس کے تابوت کو کاندھا دینے کے لیے نکلے۔ شا کو بھی دعوت دی گئی تھی۔ انہوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا "اِرونگ کی قبر میں ادب کی کوئی جگہ نہیں ہے"

ایک دفعہ مسٹر ونسٹن چرچل کی لیڈی نے انہیں تعطیل کے روز مہمان بلانا چاہا۔ تو شا نے اسی دعوتی خط کے ایک کنارے پر لکھ بھیجا ۔۔۔ "ہفتے میں فرصت کے دن گزارنے کے لیے جو میرے طریقے عام طور سے سب کو معلوم ہیں، آپ ان پر

یہ بے وجہ حملہ کیوں کرتی ہیں؟"

لندن کے سب سے بڑے اخبار "ٹائمز" کا نامہ نگار ایک دفعہ ان سے وقت مقرر کیے بغیر ملنے چلا گیا۔ وہ اپنے گھر کے دروازے پر آئے۔ کسی رسمی گفتگو اور تواضع کے بغیر انہوں نے ملنے سے انکار کیا، اندر چلے گئے اور دروازہ بند کر لیا۔

لندن کے خاص خاص لوگ کبھی کبھی رات کو کھانے پر جمع ہوتے تھے اور پہلے سے طے ہوتا تھا کہ کھانے کے بعد انتہائی بے تکلفی کے ساتھ فحش سے فحش لطیفے سنائے جائینگے اور جامے سے باہر ہونے میں کوئی کسر نہ چھوڑی جائیگی۔ اس دعوت میں عمر رسیدہ معزز مرد ہی ہوا کرتے تھے۔ عورتوں کو شرکت کی اجازت نہ تھی۔ شا کو ان کے ایک صاحب اقتدار دوست نے وہاں شریک ہونے کی دعوت دی۔ انہوں نے صرف ایک جملہ کہا "بھلے آدمیو! اگر تم تکلفات اور مدارات کی خواہ مخواہ کوشش نہ کرو تو ہمیں بغیر اس کے بھی لطف آسکتا ہے"۔ اس جملے میں تحقیر بھری ہوئی تھی۔ اور اس جواب کے بعد شا وہاں کبھی نہیں گئے۔

بناوٹ اور تکلف اور خود کو صاحب اقتدار سمجھنے والوں کے خلاف ان کی یہ نفرت اتنی پختہ ہو گئی تھی کہ اس سے ان کے اخلاق و عادات پر بہت گہرا اثر پڑا تھا۔

ایک فن کار سے اگر رومانس اور غیر ضروری جذباتیت کو کم کر دیا جائے تو شا کی عادات کا لب لباب نکل آتا ہے۔ ان کے خیال میں فنکار کو عالی ظرف۔ اپنے حق میں منہمک اور چھوٹی باتوں سے بے پرواہ، پاک صاف اور تضیع اوقات سے دور رہنا چاہیے۔ چنانچہ خود ان کی ذات میں یہ تمام اوصاف پختہ عادتیں بن کر شامل ہو گئے تھے۔

شا پر لوگوں نے ذاتی حملے کیے، ان کی ماں اور بہن کے متعلق افواہیں پھیلائیں ان کے شرمناک کارٹون بھی بنائے۔ ایک طرف کمیونسٹ نقادوں نے انھیں "سوشل فاسسٹ" اور "مسخرہ انارکسٹ" لکھا اور دوسری طرف قدامت پرستوں نے انھیں "دوغلا" اور "کمیونسٹ یتیم خانے کا پروردہ" کہا لیکن شا نے ان کو براہِ راست جواب نہیں دیا۔ شا نے کسی فرد پر ذاتی حملہ نہیں کیا۔ ان کی ساری زندگی جنگ کرتے گذر گئی۔ ڈراموں کے ذریعے، تقریروں کے ذریعے، بیانات کے ذریعے، پمفلٹوں اور مضامین کے ذریعے انھوں نے انتہا پسند کمیونسٹوں سے لے کر قدامت پرستوں، پادریوں اور فاسسٹوں تک کے خلاف جنگ کی لیکن کبھی ان کی لڑائی میں ایک فرد کا دوسرے فرد کے خلاف غصہ نہیں جھلکا۔

بقول شخصے "انھوں نے سب سے زیادہ لڑائی کی لیکن سب سے کم زخمی کیا"۔ اور یہ ان کی فنکارانہ عالی ظرفی تھی جو انھیں کسی موڈ میں بھی اپنے مقام سے گرنے نہیں دیتی تھی۔

فن میں انہماک کا عالم یہ تھا کہ وہ لوگوں سے ملتے ہوئے ہچکچاتے تھے۔ اہم سے اہم فرد کے لیے نمبر ۱۰ ڈاؤننگ اسٹریٹ پر گھنٹوں بات چیت کرنا آسان تھا لیکن شہر سے باہر دور دراز گاؤں آیٹ لارنس میں شا کے پرانے بنگلے پر چند منٹ گزارنا مشکل تھا۔ جب تک کوئی ضروری کام نہ ہو وہ کسی سے ملنے نہیں جاتے تھے۔ اور اپنا زیادہ تر وقت پڑھنے لکھنے میں گزارتے تھے۔

جب لندن میں ان کا کوئی ذریعہ معاش نہ تھا تو برٹش میوزیم لائبریری میں گھنٹوں بیٹھے پڑھا کرتے تھے اور ناول کے پانچ صفحے روزانہ لکھا کرتے تھے، اور انتہائی

پابندی سے کام کرتے تھے۔

"مجھ میں اسکول کا طالب علم اور کلرک اس قدر موجود تھا کہ اگر میرے پانچ صفحے جملہ پورا ہونے سے پہلے بھر گئے تو میں جملے کو وہیں چھوڑ دیتا تھا اور دوسرے دن اسے پورا کرتا تھا۔ اور اگر کبھی کوئی دن بغیر لکھے یونہی گزر گیا تو دوسرے دن اس کمی کو پورا کرتا تھا اور دس صفحے لکھتا تھا"

پھر جب وہ لندن سے باہر ایک بستی میں چلے گئے تو انہوں نے اپنا پروگرام ایسا رکھا کہ صبح اٹھتے ہی لکھنا شروع کر دیتے تھے۔ اور کم از کم ۵ سو الفاظ روزانہ لکھتے تھے۔ جب تک ان کی صحت نے اجازت دی انہوں نے اس پروگرام کی پابندی کی اور کسی مصروفیت پر اپنے فنی انہماک کو قربان نہیں ہونے دیا۔

ٹھنڈے مزاج کا منطقی کہہ دینا شا کی تمام عادات کا بڑی حد تک آئینہ دار ہے۔ اوّل اوّل تو وہ مذہب کی روایات اور مسیحی انسانیت سے چونکے اور انہوں نے منطق اور غیر جذباتی معقولیت پسندی کو اپنے مذہبی ماحول کی کسوٹی کے لیے استعمال کیا۔ پھر وہ کسوٹی زندگی بھر کے لیے ان کے وجود کا ایک جزو بن گئی۔ سیاست، مذہب، سائنس، طب، تقریر اور تحریر غرض زندگی کے ہر شعبے میں وہ پیشہ ورانہ ذہنیت کے صرف اس لیے دشمن ہیں کہ پیشہ ورانہ ذہنیت یا تو لوگوں کو کسی خاص اصول کے بارے میں جذباتی اور کٹر بنا دیتی ہے یا پھر معقولیت کی کسوٹی کو استعمال نہیں ہونے دیتی۔

"ڈاکٹر کی مصیبت" ڈرامے میں انہوں نے طبی پیشے پر اس جانب سے حملہ کیا ہے کہ ایک پیشہ ور ڈاکٹر کو انسانی صحت کے باقی رہنے سے اتنی دلچسپی نہیں

ہوتی جتنی اس بات سے کہ وہ اپنے فن کا کمال دکھائے۔ جب ایک کردار کو جو ایک خاص دوا کا موجد ہے، یہ تحقیق ہوتا ہے کہ وہ مرض موجود ہی نہیں جس کی دوا ایجاد کی گئی ہے تو وہ انسانی صحت کے مستقبل پر خوش ہونے کے بجائے اپنا سر پیٹ لیتا ہے۔

یہ حرکت غیر منطقی ہے اور Rational پوزیشن کے خلاف۔

اسی طرح شا نے جن تاریخی کرداروں کا خاکہ پیش کیا ہے مثلاً نپولین یا سیزر۔ ان کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہمیشہ "رلیشنل" اور معقولیت پسند رہتے ہیں۔ غصے کے عالم میں کبھی فیصلہ نہیں کرتے۔ جذبات کی رو میں کبھی نہیں بہتے۔ ٹھنڈے دل و دماغ سے اور استدلال کی کسوٹی پر کس کر ہر ایک قدم اُٹھاتے ہیں، چاہے مصر فتح کرنا ہو یا قلوپطرہ کے اظہار محبت کا جواب دینا۔

زندگی کے ہر جھگڑے اور ہر سرگرمی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کے باوجود شا خود کو برف میں دبائے رکھتے ہیں اور اسی میں انہیں اپنی عظمت نظر آتی ہے۔ وہ سیزر نہیں ہے بلکہ جارج برنارڈ شا ہے جس نے مصر فتح کرنے کے بعد ابوالہول کے عظیم مجسمے کو نظر اٹھا کر دیکھا اور کہا ـــــ

"میں نے دریا پار کیے ہیں۔ ملک ملک گھومتا پھرا ہوں۔ پہاڑوں سے گزرا ہوں۔ بڑی بڑی مہمیں سَر کی ہیں مگر اے ابوالہول میں نے اپنا ثانی نہیں دیکھا ـــــ "اے ابوالہول! اگرچہ میں اور تو۔ باقی ساری دنیا کے لیے اجنبی ہیں لیکن ہم ایک دوسرے کے

لیے اجنبی نہیں ہیں"

فے بین سوسائٹی میں لندن کے چنے ہوئے ذہین نوجوان موجود تھے
برطانیہ کی مبہم سوشلسٹ تحریک میں ہینڈمین سے لے کر ولیم موریس اور
گراہم ولاس، سڈنی ویب اور اینی بیسنٹ جیسی اہم شخصیتیں تھیں ــــ
لیکن اس کے باوجود ایک دوسرے سے الجھنا تھا اور اصولی بحثوں میں
اتنی تلخی بڑھتی تھی کہ جلسے ٹوٹ جاتے تھے اور نوبت "تو" تڑاق تک پہنچتی
تھی، ایسے موقعوں پر وہ نہایت ٹھنڈے مزاج کے ساتھ عادتاً ٹانگ اڑاتے
دونوں فریقوں کے الزامات کا نقاب بے دردی سے چاک کرتے۔ ان کے
مزاج کا تجزیہ کرتے۔ اور دونوں فریقوں کو خوب گرما کر ان کے دلوں کا رہا
سہا بخار اپنے اوپر نکلوا لیتے ــــ اس کے بعد صلح صفائی کرا دیتے ــــ
اور فریقین شا کو بُرا بھلا کہہ کر آپس میں مل جاتے تھے۔

یہ ٹھنڈا منطقی اخلاق تھا جسے وہ "آئرش چالاکی اور ہوشیاری"
کہتے ہیں۔

⁂

"میری آئرش ہوشیاری" کی وجہ سے فے بین سوسائٹی بچی ورنہ کب کی ٹوٹ
پھوٹ کر برابر ہو جاتی۔

شا کا نام لیتے ہی آئرش اور انگلش کا اختلاف ضرور ذہن میں تھے۔
وہ آئرلینڈ کے پروٹسٹنٹ شرفاء کی فطرت لے کر پیدا ہوئے تھے اور ذرا
سا موقع ملتے ہی وہ آئرش فطرت کا مظاہرہ ضرور کرتے تھے۔ آئرلینڈ کا

باشندہ ہونا ان کے وجود کے ساتھ ایک دُم کی طرح لگا ہوا ہے جس سے وہ کبھی غافل نہیں ہوتے ۔۔۔ اور اس سے محبت بھی نہیں کرتے ۔

"میں تمام آئرلینڈ والوں کی طرح خود بھی آئرلینڈ والوں (آئرش) سے نفرت کرتا ہوں"

لیکن ان کے آئرش ہونے میں "حبِ علی" سے زیادہ "بغضِ معاویہ" کو دخل ہے ۔ وہ انگلینڈ کے قدامت پرست شرفاء، صرف منافع پر جینے والے دولتمندوں اور قناعت پسند متوسط طبقے کی نمائشی حرکتوں اور لفاظیوں سے نفرت کرتے ہیں ۔ انہیں مزدور تحریک کو ذریعۂ معاش بنا کر لمبے چوڑے دعوے کرنے والے لیبر لیڈروں اور سوشلسٹ گٹ بندوں سے بھی نفرت ہے ۔ وہ اپنے آئرش ہونے کو ڈھال کے طور پر استعمال کرتے ہیں اور انگلش سوسائٹی کے بنیادی تکلفات اور اس کے لغو ڈھانچے پر حملہ کرتے ہیں ۔

جا بجا انہوں نے "انگریزوں کی لفظی نزاع پسندی" پر حملہ کیا ہے ایک منطقی، فن کار، مفکر اور اصلاح پسند کی حیثیت سے انہیں خود بھی جھگڑا پسند ہے، لیکن وہ جھگڑا جو کسی اصول کی بنیاد پر ہو ۔ وہ جنگ جو زندگی کے بنیادی اصولوں کے لیے ۔۔۔ حامی یا مخالف کی حیثیت سے لڑی جائے، شا کو پسند ہے، انہیں طوفانی جلسوں میں تقریر کرنا بہت عزیز تھا ۔ انہیں تسکین وہیں ملتی تھی جہاں کسی اہم سوال پر ہنگامہ برپا ہو اور جہاں سب لوگ گردن ہلا دیں اور کہنے والے کی ہر بات سے بے روک ٹوک اتفاق کرتے چلے جائیں، وہاں شا کی آئرش فطرت کو لطف نہیں آتا تھا ۔ وہ اسے تحقیر کے

ساتھ "مسیحی ماحول" کہتے ہیں، جہاں ہر شخص ہاں ہاں کہہ کر متفق تو ہو جاتا ہے لیکن اپنی رائے نہیں بدلتا اور حسب دستور عمل کرتا رہتا ہے۔

اور یہی "مسیحی ماحول" انگریز شرفا کی سوسائٹی میں بھی عام تھا۔ کہ اصول پر سب متفق ہیں لیکن بے بنیاد اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر لڑ رہے ہیں۔ "یہ انگریز بھی بڑے جھگڑالو ہوتے ہیں" شا نے بار بار لکھا۔ سیب گاڑی میں لیبر پارٹی کا وزیر اعظم کہتا ہے ــ لاحول ولا قوۃ ـ یہ بھی کوئی ملک ہے۔ "جہاں لوگ فٹ بال اور تفریح کے سوا کسی کام میں سنجیدگی نہ دکھاتے ہوں، وہاں میں وزیر اعظم ہونے سے نہ ہونا ہی بہتر سمجھونگا"

شا کا آئرش ہونا ان کے خاندانی تعلق کو نہیں بلکہ ان کی ایسی عادات کو ظاہر کرتا ہے جو انہوں نے اصولوں کے طور پر اپنائی تھیں مثلاً یہ کہ اگرچہ لوگ ان کے اقوال اور ان کی تحریروں میں ذو پہلو اور متضاد معنی تلاش کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود دو رخی بات کہہ کر بھی اپنا مطلب آسان سے آسان اور سہل سے سہل تر لفظوں میں کہہ دیتے ہیں۔ ڈنکے کی چوٹ اپنی بات کہہ جانا اگرچہ شا کو اکثر بہت مہنگا پڑا (جیسے ۱۹۱۴ء میں) مگر وہ آئرش عادات کا نقاب ڈال کر ہر بات اسی قوت کے ساتھ کہتے رہے

دوسرے یہ کہ وہ آئرش روایت کے مطابق جس بات پر اختلاف کرتے ہیں، اس پر ڈٹ جاتے ہیں اور اصول کو اختلاف کی بنیاد بنا لیتے ہیں۔ ہر اختلاف کے پیچھے کسی اصول کی حمایت یا مخالفت ضرور ہوتی ہے یہاں تک کہ معمولی سے معمولی طنزیہ یا مزاحیہ جملہ بھی صرف جملہ بازی یا مزاح کے لیے نہیں ہوتا بلکہ اپنی بات منوانے

اور اسے قوت پہنچانے کے لیے ہوتا ہے۔

تیسرے یہ کہ ان میں آئرش خلوص ہے۔ جسے ریاکاری اور بناوٹ سے کوئی لگاؤ نہیں ۔۔ ان کے یہاں ہاں کی تہہ میں نہیں کبھی نہیں ہوتا۔ اس آئرش خلوص میں سادگی اور بے تکلفی ہے۔ وہ سادگی جو شاؔ کے قلم سے سیاسی کردار میں، ادبی، سرگرمی میں، مرد عورت کے تعلقات میں، روزمرہ کے لین دین اور میل جول میں، غرض ہر موقعے پر بے نقاب اور بے حجاب ہونے کی تبلیغ کراتی ہے۔

"میں آئرش ہوں ۔۔ میرا خاندان یارک شائر سے چلتا ہے"

ان لفظوں کے پیچھے شاؔ کی تمام عادات پوشیدہ ہیں۔ ویسے انہیں آئرلینڈ سے محض اتنا تعلق تھا کہ جب وہ ایک بار وہاں سے نکلے تو کوئی جذباتی بے چینی اُن کا دامن تھامنے نہیں آئی۔ اور جب وہ لندن میں آباد ہو گئے تو تیس برس تک انہیں پھر وطن کی صورت دیکھنے کا خیال بھی پیدا نہیں ہوا۔

آئرش ہونے کا دعویٰ کرنا محض ایک ہلکا سا پردہ ہے۔ ورنہ شاؔ نے اپنے اصول اور اپنی سرگرمیاں دراصل اپنی عادتوں کے سانچے میں نہیں ڈھالی تھیں۔ بلکہ اپنی عادتوں کو اصولوں کے منطقی سانچے میں ڈھال لیا تھا۔

مزاج اور ذوق

"کون؟ جی، بی، ایس؟ وہ تو میرا بنایا ہوا ایک افسانوی کردار تھا۔۔ اصلی برنارڈ شا اس سے بہت مختلف ہے"

یہ خود جی بی ایس (جارج برنارڈ شا) نے ایک سوال کے جواب میں لکھا تھا۔

برنارڈ شا نے اگرچہ ایک سے زیادہ مقامات پر یہ بھی کہا ہے کہ "میں جو کچھ بھی ہوں اپنے ڈراموں میں موجود ہوں" لیکن شاؔ ڈراموں کے باہر دوسرے مزاج

کی ایک شخصیت ہو۔ ڈراموں میں وہ انتہائی سخت گیر، اصولی، کٹر، اور جملہ باز انسان نظر آتے ہیں ــ اپنے گھر میں، اور بے تکلف دوستوں میں (جن کی تعداد دنیا کے ہر بڑے آدمی کے دوستوں سے کم ہو گی) ایک معصوم اور بے تکلف، نرم اور مہربان گھریلو مزاج کے آدمی ہیں۔ جو ایک طرف سائیکل پر چڑھنے کی بار بار مشق کرتے ہیں اور گرتے ہیں تو اس بُری طرح گرتے ہیں کہ دیکھنے والے ہنستے ہنستے بے قابو ہو گئے ــ "اور اتنا ہنسے کہ میرے ڈراموں کے کسی کردار پر شاید کبھی کوئی مجمع نہ ہنسا ہو گا" اور دوسری طرف بیوی کے انتقال پر لندن کی سڑکوں سے جلوس جنازہ کے ساتھ روتے ہوئے اور آنسو پونچھتے ہوئے گزرتے ہیں۔

اپنی ہر چیز کی طرح انہوں نے اپنا مزاج بھی خود ہی بنایا تھا۔ اور اس مزاج کی سب سے اہم کڑی اُن کی انفرادیت پسندی تھی۔ انفرادیت پسندی ــــ جو خطرناک ڈکٹیٹر سے لے کر عظیم فن کار تک پیدا کرتی ہے۔

شا کے ایک نیازمند اور عہد حاضر کے بہت بڑے انگریز فلسفی سی ایم جود نے شا کے مزاج اور ان کے مشغلوں کی کُنہ تک پہنچنے کے لیے ایک نیا فلسفہ تراشا ہے جس کا تجزیہ یہ ہو کہ جسمانی ترکیب اور دماغی صلاحیت سے مل کر ایک اور خاص قسم کا فطری رجحان پیدا ہوتا ہو جو انسان کے مزاج اور اس کے نظریے کی راہیں بناتا ہے۔ مثلاً برنارڈ شا جسمانی طور پر کمزور اور دُبلے پتلے آدمی تھے اور ذہن و دماغ کی اعلیٰ ترین صلاحیتوں کے مالک تھے۔ جسمانی ترکیب اور دماغی ترکیب کے جوڑ سے پورے وجود کی ایک ایسی ترکیب، ایک ایسا دائرہ جنم لیتا ہے جو فکر اور عمل دونوں کو ایک ڈگر پر لگا دیتا ہے۔ اُسی ڈگر پر برنارڈ شا کو چلنا پڑا۔ یہی

وجہ تھی کہ مادیت کے فلسفے سے اُوپر اُٹھ جانے کے باوجود وہ مسیحی نہ ہو سکے۔ غیب پر ایمان نہ لا سکے۔ اور مذہبی آدمی نہ بن سکے۔ کھیل کود، تفریح، کود پھاند، ہنسی مذاق، پُر لطف صحبت، اور عام میل جول سے وہ خود کو بچاتے رہے۔ ہر فلسفے اور ہر سائنس کو بالکل ابتداء سے تحقیق کرنے کی فکر میں رہے۔ وجہ یا اس کا فارمولا کچھ بھی ہو، لیکن شا کا مزاج بالکل انفرادیت پسند ہے۔ وہ ہر بات میں الگ راہ بنانے کے قائل ہیں۔ ڈبلن میں چار سال تک ٹھیکیدار کمپنی میں کلرکی اور خزانچی کا فرض انجام دینے سے وہ اس لیے نہیں گھبرائے کہ وہ اس پیشہ میں اپنی ناکامی دیکھ رہے تھے بلکہ صرف اس وجہ سے گھبرائے کہ وہاں روز روز ایک ہی قسم کا کام کرنا پڑتا تھا۔ اور اگر اتفاق سے کوئی نئی صورت حال آپڑتی تو اس کا نیا حل سوچنے کے بجائے افسروں کی طرف سے حکم ہوتا کہ فائل اُلٹ کر دیکھ لو۔ پہلے ایسے موقعے پر کیا عمل کیا گیا تھا بس ویسے ہی کیا جائے۔ چنانچہ دفتری دستور پسندی سے شا کی انفرادیت پسند طبیعت ایسی اُکتائی کہ انہوں نے استعفا دیتے وقت افسر بالا سے کہا "میں یہاں سے جانے کا فیصلہ کر چکا ہوں" یہ بات انہوں نے اس ڈر سے کہی کہ ایسا نہ ہو کمپنی ان کی تنخواہ بڑھا کر انہیں وہیں روک لے۔

انفرادیت پسندی اور جدت پسندی صرف اسی بات سے ظاہر نہیں کہ انہوں نے ڈراموں کی ایک نئی ٹکنیک دریافت کی، اور انگلینڈ میں پہلی بار بحثی ڈرامے لکھے، ان کو نئے طرز ــــ اور بالکل اپنے انوکھے انداز پر تعمیر کیا، بلکہ ان کے لباس، ان کی وضع قطع، اخلاق و عادات، شغل، روز مرہ کے پروگرام، طرز گفتگو، طرز تحریر، طرز استدلال اور حد یہ ہے کہ خط کا پتہ لکھنے میں بھی نمایاں ہوتی ہے۔

جب انگریزی میں پتہ لکھنے کا دستور یہ تھا کہ لفافے کے درمیان اُوپر نیچے لائنوں میں پتہ لکھا جائے۔ اس وقت شا نے لفافے کے بائیں کونے میں ایک طرف پتہ لکھنا شروع کیا اور اس وقت تک لکھتے رہے جب تک کہ ڈاکخانے کی طرف سے انہیں منع نہیں کیا گیا۔

اسی طرح وہ تحریر میں توسین، کاما، ان ورٹڈ کاما اور دوسرے نشانات وغیرہ نہیں لگاتے۔ اور نہ اپنی کتاب میں یہ نشانات لگنے دیتے ہیں۔ کیونکہ ان کے خیال میں اس سے صفحے کا حسن بگڑ جاتا ہے۔ اور ثبوت یہ ہے کہ انجیل مقدس میں اگر ایسے نشانات ہوتے تو انجیل کو وہ زبردست ادبی مقام نہ حاصل ہوتا جو ان نشانات کے بغیر حاصل ہے۔

یہ دلیل کس قدر اچھوتی ہے۔ اچھوتی دلیل نکالنا بھی شا کی ذہانت سے زیادہ ان کے مزاج میں شامل ہے۔ خواہ کسی بات کی حمایت کرنا ہو یا مخالفت کرنا۔ وہ اس کے لیے ایسی اچھوتی دلیل تلاش کر کے نکالیں گے جو خود ان کی صنف کو حیرت میں ڈال دیگی۔

جب انگلینڈ میں عورتوں کی آزادی کی تحریک چل رہی تھی۔ انہیں ووٹ کا حق، اور ہر محکمے میں ملازمت کا برابر کا حق دیے جانے کی مخالفت ہو رہی تھی، تو عورتوں کی کمزوریوں پر روشنی ڈالتے ہوئے یہ بھی کہا جا رہا تھا کہ عورتیں جان کو خطرے میں نہیں ڈال سکتیں۔ چنانچہ وہ جنگ کے ناقابل ہیں۔ عورتوں کی طرف سے جواب دیا جاتا تھا کہ ہاں جنگ، ایک غیر فطری اور وحشتناک چیز ہے اس لیے عورتیں جنگ میں حصہ نہیں لیتیں البتہ وہ جان کا خطرہ مول لے سکتی ہیں اگر

بچے کی پیدائش میں بھی تو خطرہ مول لیتی ہیں۔

شا نے عورتوں کی طرف سے آواز بلند کی۔ ان کی انفرادیت پسندی اور جدت پسندی نے بالکل اچھوتا ہتھیار آزمایا۔ انھوں نے کہا۔ عورتیں جنگ بھی کر سکتی ہیں آخر انقلاب فرانس میں عورتوں نے مردوں سے آگے بڑھ کر حصہ لیا تھا۔ اگر جنگ اصولی اور جائز ہو تو عورتیں اس میں حصہ لینے اور جان کو خطرے میں ڈالنے سے نہیں گھبراتیں۔

اسی طرح سوشلزم کی حمایت میں انھوں نے اپنی انفرادیت کچھ اس انداز سے باقی رکھی کہ خود سوشلسٹ سٹپٹا گئے۔ مثلاً انھوں نے ایک سوال کے جواب میں اپنے یہ جملے دہرائے

"میں سوشلسٹ ہوں کیونکہ میں مزدور طبقے کا دشمن ہوں .... انگلینڈ کے مزدور طبقے کو دیکھ کر میرے دل میں صرف ایک ہی جذبہ پیدا ہوتا ہے کہ انھیں بالکل فنا کر دوں .... میں مزدور طبقے سے نفرت کرتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ وہ اس قابل ہو جائیں کہ ان سے محبت کی جا سکے۔"

ظاہر ہے کہ سرمایہ داری کے خلاف مزدور طبقے کی حمایت کا بالکل اچھوتا اور سٹپٹا دینے والا حربہ تھا، جو ان کے انفرادیت پسند مزاج نے انھیں عطا کیا تھا۔

تحقیق پسندی بھی ان کے مزاج میں بسی ہوئی تھی۔ بچپن میں ایسے کئی واقعے شا نے بیان کیے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے مزاج اور ذات میں کھوج لگانے کی بہت تڑپ تھی۔ انھوں نے کسی سے سنا کہ بلی ایک ایسا جانور ہے کہ جب گرتا ہے پیروں کے بل گرتا ہے۔ چنانچہ بارہ[12] برس کی عمر کا برنارڈ شا فوراً اپنی بلی کو پکڑ کر اوپر کے کمرے میں لے گیا وہاں اس نے بلی کو نیچے پھینک دیا ---- اور یہ دیکھ کر اسے اپنی تحقیق کے مکمل ہونے کا ثبوت ملا کہ بلی واقعی پیروں کے بل گری۔

زندگی بھر شا د سائنس، فلسفے، طب، سرجری (جراحت) سوشلزم، معاشیات، اقتصادیات، میونسپلٹی ــ غرض ہر شعبے کی بنیاد کھوجتے رہے انہوں نے کسی مسئلے کو اس کی موجودہ شکل میں تسلیم نہیں کیا۔ بلکہ خود تحقیق کر کے نتیجہ نکالنے کی کوشش کی۔ جیسا کہ انہوں نے سائنس کی اس تحقیق کا مذاق اڑایا کہ آفتاب اس زمین سے پچاس ہزار میل ہے انہوں نے کہا ــ اس جھوٹ کا طول اتنا ہے کہ وہ بھی بے سلیقہ معلوم ہوتا ہے۔

ان کے مزاج میں گہرا طنز گھر کر گیا تھا۔ وہ طنز جو ظلم کے خلاف نفرت کے چشمے کی طرح پھوٹتا ہے۔ نفرت کا چشمہ، جس نے فلابیر سے کہلوایا تھا کہ "میرا جی چاہتا ہے کہ میں انسانیت کے منہ پر خون کی قے کر دوں ــ اور یہ پوری دنیا غرق ہو جائے" برنارڈ شا نے خون کی قے نہیں کی۔ انہوں نے مادام بواری جیسا ناول نہیں لکھا ــ کیونکہ یہ بدمذاقی اور ان کے خیال میں نفاست و لطافت پسندی کے خلاف ہوتا۔ البتہ انہوں نے اس قے پر چاندی کے ورق چڑھا دیئے۔ "لاوارثوں کی بستی" "مسز وارن کا پیشہ"، "ہرکتہ برک ہاؤس" ــ اور ایسے ڈراموں کے چبھتے ہوئے جملوں کی شکل میں پیش کر دیا۔

بہترین طنز وہ ہے جو قہقہے کے ساتھ آنسو بھی لائے۔ شا اس عمل جراحی کے وقت اپنے وجود کو نہیں بھولتے۔ وہ خود اپنے اوپر بھی بھرپور طنز کرتے ہیں۔ اور جہاں اپنا قصور دیکھتے ہیں ــ اس کا اعتراف کرتے ہیں۔ یہ بات بچپن سے ان کے مزاج میں داخل تھی۔

ڈال کی پہاڑی پر کمسنی کے زمانے میں وہ دو ہم عمروں کے ساتھ چڑھ گئے۔

وہاں ان کی بچپن طبیعت کو خیال آیا کہ اگر پہاڑی کے ایک سرے کو آگ لگا دی جائے تو دھماکا سننے میں بڑا لطف آئیگا۔ اُنہوں نے شہ دی۔ ایک ساتھی نے وہاں آگ لگا دی۔ شا اور دوسرا لڑکا دونوں بھاگ گئے لیکن وہ تیسرا لڑکا پکڑا گیا۔ بعد میں شا کے مزاج میں اعتراف جرم کی جرأت نے کروٹ لی اور وہ اچھا سا لباس پہن کر سیدھے اس پہاڑی کے مالک کے پاس پہنچے اور کہا میرے ساتھی کو چھڑوا دو۔ وہ بے قصور ہے یہ سب میری شرارت تھی ۔۔۔ اور نہ جانے کیسی جوشیلی تقریر کی ۔۔۔ یہ ان کی پہلی تقریر تھی ۔۔۔ کہ مالک زمین نے پولیس کے نام خط لکھ دیا اور دونوں بری ہو گئے۔

تفریح میں وقت گزارنے سے انہیں بڑی نفرت تھی۔ لوگوں سے الگ تھلگ رہ کر وہ اپنے وقت کو زیادہ سے زیادہ کام کے لیے استعمال کرتے تھے۔ تفریح کو انہوں نے چوپایوں کی دلچسپی کی چیز کہا ہے۔ "یہ فالتو اور کاہل لوگوں کا کام ہے کہ وہ پڑے ہوئے سوچتے رہیں کہ آیا وہ خوش ہیں یا نہیں ۔۔۔ جو آدمی خود کو مصروف رکھتا ہے اسے اتنی مہلت کہاں کہ یہ سوچ بھی سکے۔

چنانچہ وہ خود کو مطالعہ میں اور لکھنے میں اتنا مصروف رکھتے تھے کہ ملنے ملانے کے لیے وقت ہی نہ بچتا تھا۔ عالم یہ تھا کہ کپڑے بدلتے وقت وہ میز پر کتاب پھیلا کر رکھ لیتے۔ کپڑے بدلتے جاتے اور کتاب پڑھتے جاتے، یہاں تک کہ وہ ختم ہو جاتی اور اسی پر چند روز بعد دوسری کتاب کھل جاتی۔ اور اس طرح کپڑے بدلنے کے کمرے میں میز پر آرائش کے سامان کی جگہ اوپر تلے کتابوں کا ایک ڈھیر ہو جایا کرتا تھا۔

تعطیل اور تفریح دونوں سے شا کو اسی لیے الجھن تھی کہ دونوں کا مقصد وقت کو ارادۃً تفریح میں گزارنا ہوتا ہے۔ حالانکہ انسان کو اتنی تھوڑی عمر ملی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ

کام کے لیے استعمال ہونی چاہیے۔

"بدقسمتی سے میں کچھ اس قسم کا بنا ہوا ہوں کہ اگر واقعی جنت میں بھی ہوتا تو مجھے وہاں محظوظ ہونے کے لیے کسی نہ کسی قسم کا کام کرنا ہوتا اور کچھ نہ کچھ حرکت کرنی پڑتی۔ اگر کچھ نہ ہوتا تو شام کے تفریحی لمحوں میں ایک گھنٹے کے اندر مجھے دو ہفتے کی سخت محنت اور مشقت کرنی پڑتی ...."

ان کی تنہا پسندی جو عمر کے ساتھ بڑھتی چلی گئی تھی، بعض نقادوں کی نگاہ میں آگے چل کر ان کے غیر جمہوری نظریات کا سبب بنی۔ لیکن اس کی بنیاد کو شا کے مزاج میں نہیں بلکہ ان کے ماحول اور سماج میں دیکھنا چاہیے۔ شا اپنے مزاج کی بدولت نہیں، بلکہ اپنی انسانیت دوستی کی بنا پر سرمایہ دارانہ جمہوریت کے دشمن تھے۔

شا کے مزاج میں ورثے کے طور پر Anti climax (گمبھیر کیفیت میں ایک دم مُڑ جانے) کی صلاحیت آئی تھی چنانچہ ڈراموں کے کرداروں میں ہی نہیں بلکہ روزمرہ کی زندگی میں بھی وہ اس مزاج کو شعوری طور پر استعمال کرتے ہیں۔

جو چیز دوسروں کے لیے تفریح کا سبب ہو سکتی ہے وہ شا کے لیے دردناک حادثہ کی حیثیت رکھتی ہو اور جو حرکتیں یا واقعات دوسرے لوگوں کی نظر میں حادثے ہوتے ہیں، شا کے لیے ان کی حیثیت تفریح کی سی ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ کسی واقعے سے بھی اپنے آپ کو جذباتی طور پر نہیں باندھتے۔ وہ خود کو بہت لیے دیے رہتے ہیں۔

جو نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ ۱۹۳۵ء میں سینٹ جیمس پارک کے زمین دوز ریلوے اسٹیشن پر ایک روز شا بڑی تیزی سے زینہ طے کر رہے تھے۔ ٹرین پلیٹ فارم پر آ رہی تھی۔ اور وہ ابھی سب سے اوپر کی سیڑھی پر تھے کہ اتنے میں ان کا پیر

پھسل گیا۔ اور اسی برس کا بوڑھا شا اوپر سے کمر کے بل پھسلتا ہوا نیچے پلیٹ فارم پر گرا۔ کئی آدمی جو شا کو پہچانتے تھے دوڑے کہ ان کی مدد کریں اور انہیں اٹھائیں کہ اتنے میں شا خود اٹھ کھڑے ہوئے اور بڑے اطمینان سے کپڑے جھاڑتے ہوئے ٹرین کے اندر جا بیٹھے۔ انہوں نے مڑ کر یہ بھی نہیں دیکھا کہ لوگ ان کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ یا نہیں۔ دیکھنے والے خود احمق بن گئے اور شا نے اس واقعے کو اتنا معمولی سمجھا جیسے وہ ہمیشہ سے اسی طرح پل سے پلیٹ فارم پر اُترنے کے عادی رہے ہیں۔

ان تمام باتوں کے باوجود شا بڑے ملنسار آدمی تھے۔ جن لوگوں کو وہ ملنے کے لیے چنتے تھے ان کے ساتھ نہایت مہربانی سے پیش آتے تھے۔ چسٹرٹن جب ان سے پہلی بار ملنے گئے تو وہ ایک معمولی درجے کے نوجوان تھے ان کی کوئی خاص حیثیت نہ تھی مگر اس کے باوجود شا اس بے تکلفی سے ملے کہ چسٹرٹن ان کے مرید ہو گئے۔ جوڈ اور دوسرے عقیدتمندوں نے بھی پہلی ملاقاتوں کے ایسے ہی نقوش بیان کیے ہیں۔ فرینک ہارس (جس سے بہ حیثیت سوانح نگار شا بہت حد تک متفق ہیں) لکھتا ہے کہ "جن دنوں میں پندرہ روزہ ریویو کا اڈیٹر تھا، ایک مضمون لینے کے لیے شا سے ملا۔ وہ مضمون سے زیادہ مجھ میں دلچسپی لینے لگے۔ وہ بڑی جلدی بے تکلف اور پُرتپاک ہو جانے کا فن جانتے ہیں۔ پانچ منٹ میں ان سے اتنی بے تکلفی ہو گئی کہ میں نے اپنی صحت کی خرابی کا ذکر کرتے ہوئے ان سے کہیں یہ بھی کہہ دیا کہ میں تیراکی کا فن جانتا ہوں (جس سے شا کو خود بھی دلچسپی تھی) شا نے میری گفتگو بڑے غور سے ڈاکٹر کی طرح سُنی اور پوچھنے لگے "کیا تم شراب پیتے ہو؟"

اصل میں شا نے اپنا مزاج اسی طرح ڈھالا تھا کہ وہ عام دستور کی پروا نہیں کرتے تھے آرائش کا خیال نہیں کرتے تھے۔ ایٹی کیٹ (اور آداب) کی فکر نہیں کرتے تھے بلکہ ہر

اس چیز کو اپنے مزاج میں داخل کر لیتے تھے جس میں افادیت اور سہولت ہو۔ کپڑوں سے لے کر لوگوں سے ملنے جلنے تک ان کا یہی اصول تھا اور یہی مزاج۔ چنانچہ اس کی وجہ سے دستور پسندوں کو وہ غلط فہمی ہوئی جس کی بنا پر شا کو "Spiritual Aristocrat" (روحانی طور سے خود کو ممتاز رکھنے والا) کہا گیا ہے۔

ذوق و شوق بھی عجیب عجیب تھے۔ موسیقی کا ذوق تو انہیں گھر سے ملا۔ ماں کی طرف سے فطرت میں موسیقی داخل ہوئی۔ اور لی جسے وہ اپنا غیر قدرتی باپ شمار کرتے ہیں، اس کی بدولت موسیقی کا ماحول طاری رہا اور موسیقی ان کی رگ رگ میں بس گئی۔ بعد میں انھوں نے اسی مہارت سے کام لے کر پہلی فنی حیثیت "آرٹ کے نقاد" کے طور پر قائم کی۔ ڈرامے پر تبصرہ کرتے ہوئے برنارڈ شا ہر ڈرامے کی موسیقی پر بڑی تفصیل سے بحث کیا کرتے تھے۔

بچپن میں یہی موسیقی کا ذوق تھا جو ان کے ہر دبے ہوئے جذبے کی تسکین کا سامان مہیا کرتا تھا۔ شا کی عمر بیس برس کی بھی نہیں تھی جب وہ کرایہ وصول کرنے کے کام پر ملازم ہو گئے۔ غریب کرایہ داروں سے جب وہ مکانات کا کرایہ وصول کر کے لاتے تھے تو اندر ہی اندر ظلم کے خلاف ایک نفرت، ظالم مالکوں اور بے رحم صاحب جائداد لوگوں کے خلاف غصہ کی آگ بھڑکتی تھی ("لاوارثوں کی بستی" ڈرامہ اسی سے ماخوذ ہے) اور وہ شام کو یا ایسے اوقات میں جب کہ لوگ آرام کرتے ہیں، شا اپنا پیانو چھیڑا کرتے تھے۔ وہ پیانو لے کر بیٹھ جاتے۔ اور اس کی شیریں آواز سے محلے کے شرفا کے آرام میں خلل ڈالتے تھے۔ اس حرکت سے انہیں بڑی تسکین ہوتی اور دن بھر کی ذہنی کوفت دھل جاتی تھی۔ ان کی ماں گھر سے جاتے وقت پیانو چھوڑ گئی تھیں اور وہ تنہائی

میں اس پیانو کی محبت سے لطف لیتے رہے۔

آگے چل کر وہ موسیقی کے ذوق کو ہر دوسرے ذوق پر ترجیح دیتے تھے۔ شاعری کی لفاظی سے جو انہیں نفرت تھی (اگرچہ ان کے بعض ڈراموں میں شاعرانہ اشاریت اور شاعرانہ زبان موجود ہے) اس کی وجہ سے موسیقی کی اہمیت ان کی نگاہ میں اور بڑھ گئی

"ہوراس کی نظمیں پڑھنے سے بہتر یہ ہے کہ بیتھوون (مشہور مغربی موسیقار) کے نغمے یاد کئے جائیں تاکہ انہیں گایا جا سکے"

یہ شا کا ذوق بھی تھا۔ اور ان کی تعلیم بھی۔ اور وہ زندگی بھر موسیقی سے دلچسپی لیتے رہے۔

تصویر کشی سے بھی ان کو دلچسپی تھی اور اگرچہ اس میں کوئی قابل ذکر مہارت وہ حاصل نہ کر سکے۔ لیکن فن سے واقف ضرور تھے اور اس پر ماہرانہ نظر رکھتے تھے۔

انہیں تیراکی کا بھی شوق تھا اور اسے بھی وہ افادی نقطۂ نظر سے دیکھتے تھے۔ گھونسہ بازی کا فن بھی سیکھا لیکن اس کا تجربہ کرنے کا زندگی بھر میں ایک موقعہ بھی نہیں ملا۔ کیونکہ وہ فطرۃً اور اصولاً اس آدمی کو زیادہ پسند کرتے تھے جو گھونسے کا جواب فوراً گھونسے سے نہ دے۔ فوٹوگرافی انہوں نے سیکھی اور اپنے طرح طرح کے فوٹو کھنچوانے کے علاوہ دوسروں کے فوٹو بھی کھینچے۔ جو احباب ان سے ملنے جاتے ان کا فوٹو لیتے اور اس کی خوبیوں اور کمزوریوں پر فنی آدمی کی طرح بحث کیا کرتے تھے۔ موٹر کے زمانہ میں بائیسکل چلانا بھی انہوں نے سیکھا اور پہلی بار وہ دوستوں کو گواہ بنا کر ان کے سامنے ایک بلند مقام سے سائیکل پر سوار ہوئے، لیکن سائیکل سنبھل نہ سکی اور وہ زمین پر کچھ اس انداز سے گرے کہ دیکھنے والوں سے قہقہے ضبط نہ ہو سکے۔

ایک شوق انہیں اور تھا ــ اپنا ڈرامہ لکھنے اور لکھ کر دوسروں کو سنانے کا شوق۔

ابتدا میں وہ اپنے عقیدتمندوں اور دوستوں کو جمع کر کے ان کے سامنے ڈرامے کا مسودہ پڑھ کر سُناتے تھے۔ بہت سنبھل سنبھل کر ایک ایک لفظ ادا کرتے تھے۔ ان کی آواز میں موسیقی اور انداز میں ایک خاص کیفیت ہوتی تھی۔ جن لوگوں نے اس طرح شاؔ کو ڈرامے سُناتے دیکھا ہے ان کا بیان ہے کہ شاؔ کا ڈرامہ اسٹیج پر دیکھنے میں جو لطف آتا ہے اس سے کہیں زیادہ لطف اس وقت آتا تھا جب شاؔ اپنا ڈرامہ خود سناتے تھے۔

جنسی تعلقات

شاؔ جس وقت لندن روانہ ہوئے وہ عمر کی اس منزل میں تھے جہاں ان کی جنسی زندگی شروع ہو جانی چاہیے تھی، لیکن اس وقت تک ان کے لیے محض ایک خیالی عورت کا وجود تھا۔ ویسے بھی ان کی ذہنی اُٹھان اس قسم کی تھی کہ عورتوں کی تلاش یا ان کی طرف رغبت شاؔ کو ہو نہیں سکتی تھی۔ اور پھر معاشی حالات ایسے تھے کہ وہ اس ڈگر پر دُور تک نہیں جا سکتے تھے۔

اس کمی کو وہ موسیقی، تصویر کشی اور مطالعے کی لذت سے پورا کر لیتے تھے اور مطمئن تھے۔ شاؔ کی تمام زندگی جنسی بدعنوانی سے پاک رہی۔ زندگی کا پہلا دور اس لیے کہ مادی حالات نے انہیں گمراہ نہیں ہونے دیا۔ درمیانی دور اس لیے کہ وہ تقریر دلی میں، تصنیفی سرگرمیوں میں بے حد مصروف رہے اور جذباتیت سے سخت نفرت کرتے رہے۔ یہاں تک کہ شاؔ کے ناولوں میں جو ہیرو اُبھرتے ہیں وہ اس قسم کا کردار پیش کرتے ہیں جنہیں عورتوں سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہوتی۔ رشک و حسد سے پاک ہوتے ہیں۔ اور وہ اس درجہ غیر جذباتی قسم کے معصوم ہوتے ہیں کہ اپنی محبوباؤں کو دوسرے مردوں سے شادی کرنے کی خود ہی ترغیب دیتے ہیں۔ ناولوں کے دور تک شاؔ کسی عورت کی محبت میں گرفتار نہیں ہوئے تھے اور عورتوں سے محبت کا تصور اس قدر

لطیف اور افلاطونی تھا کہ ان کا ایک کردار کہتا ہے

ارے تمہیں وہ سیاہ آنکھوں والی لڑکی رشیل روستری یاد ہے؟..... مجھے اس سے ایک بار محبت ہو گئی تھی۔ ایک رات ہم دونوں باغ میں ملے۔ اور ایک دوسرے کے گلے میں باہیں ڈال کر بڑی مصیبت سے ادھر اُدھر گھومتے رہے۔ چلتے وقت ہم نے ایک دوسرے کو بوسے کے ساتھ رخصت کیا۔ اس وقت بہت ہی شدت کے ساتھ ہم جذباتی ہو گئے تھے۔ اگر کہیں وہ محبت اسی طرح چلتی رہتی تو میں ایسا اُکتا جاتا کہ اکتاہٹ سے میرا دم نکل جاتا....

شادی سے پہلے چالیس سال کی عمر تک وہ کچھ "عصمتِ بی بی از بے چادری" کے ہاتھوں بھی جنسی معاملات سے دُور بھاگتے رہے۔ خود اُنہوں نے ۱۸۹۰ء کے زمانے کا ایک واقعہ بیان کیا ہے۔

آدھی رات سے زیادہ گزر چکی تھی۔ شا اپنا پُرانا بوسیدہ سوٹ پہنے ہوئے لندن کی مشہور شاہراہ پکاڈلی سے بونڈ اسٹریٹ پیدل جا رہے تھے کہ فٹ پاتھ پر کھڑی ہوئی ایک عورت ان کی طرف بڑھی اور ان سے التجا کے لہجے میں کہا کہ برومپٹن کی آخری بس جا چکی ہے اس لیے میں چاہتی ہوں کہ کسی بہتر جگہ مجھے شب بسر کرنے کی جگہ یا لفٹ مل جائے۔ میں بہت شکر گزار ہونگی۔ شا نے جواب دیا۔ افسوس کہ میں شادی شدہ ہوں۔ میری بیوی میرا انتظار کر رہی ہوگی اور آپ جیسی خوبصورت عورت کو دوسرا شریف آدمی مدد کے لیے مل جائیگا (اس وقت تک شا کی شادی نہیں ہوئی تھی) یہ جملے سنتے تھے کہ وہ گرویدہ ہو گئی کہ آپ جیسا شریف آدمی اور کون ہوگا، اور ان کے بازو سے لپٹ گئی۔ شا نے زبردستی اپنا بازو چھڑایا۔ اور اُسے جھٹکا دے کر وہاں سے

فرار ہو گئے۔ دُور جا کر اُنہوں نے بجلی کے کھمبے کی روشنی میں اپنی جیب سے بٹوا نکالا۔
اُسے اُلٹ پلٹ کر اشارۃً دکھایا اور جتایا کہ ہاتھ چھڑانے کی وجہ بیوی کی محبت نہیں
تھی بلکہ بٹوے کی بے بسی تھی۔ چنانچہ وہ عورت مایوس ہو کر وہاں سے غائب ہو گئی
شا کا فن جنسی ترغیب کی راہ میں کس طرح آڑے آتا تھا اس کا اندازہ اس واقعے
سے ہو سکتا ہے کہ جس زمانے میں برٹش میوزیم لائبریری میں بیٹھے ہوئے شا اپنا پانچواں
ناول لکھ رہے تھے۔ تو انہوں نے سامنے کی میز پر ایک عورت کو دیکھا جس میں بڑی کشش
تھی۔ نقوش بڑے صاف تھے۔ چہرے سے ذہانت ٹپکتی تھی۔ وہ عورت اپنی میز پر جھکی ہوئی
بڑی پابندی سے کچھ لکھتی رہتی تھی۔ غالباً وہ بھی کوئی ناول لکھ رہی تھی۔ شا اسے غور سے
دیکھتے رہے، اور اس کے خدوخال سے اس کے کردار کا اندازہ لگاتے رہے۔ اور اسے
دیکھ دیکھ کر انہوں نے اپنے ناول میں "اگا تھا وائلی" کا کردار تراش لیا۔۔ جو بعد میں
معلوم ہوا کہ اس عورت کا بالکل صحیح کردار تھا۔۔ اور جو واقعات ناول کے کردار کو
پیش آئے، تقریباً ویسے ہی واقعات اس عورت کو اپنی زندگی میں پیش آئے تھے اس
کے باوجود شا نے اس عورت سے کبھی گفتگو کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی، اور نہ اس نے
خاص توجہ کی۔

اس سے شا کے قیافے اور ذہانت کا ہی نہیں بلکہ ان میں جنسی معاملات کی طرف
سے بے اعتنائی اور بے نیازی کا بھی پتہ چلتا ہے۔

دو ایک بار انہیں بعض لڑکیوں کی طرف توجہ ہوئی۔ سوشلسٹ لیگ کے بانی
ولیم مورس اپنے وقت کے بڑے مقبول اور بڑے ذہین سوشلسٹ تھے۔ ان کے گرد اکثر
پڑھے لکھے نوجوانوں کا ہجوم رہتا تھا۔ اور وہ ان کے ساتھ باپ کا سا سلوک کرتے تھے

("کنڈیڈا" میں موریل کا کردار غالباً وہیں سے اخذ کیا گیا ہے) شا بھی اکثر ان کے ہاں آنے جانے لگے۔ اتوار کی شام کو وہیں ٹھہر جاتے اور رات کا کھانا کھا کر واپس آتے اور رات گئے تک بحثا بحثی میں اُلجھے رہتے تھے۔ مسز موریس کو ان بحثوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ان کی بجائے موریس کی چھوٹی لڑکی مے موریس میز پر موجود ہوتی تھی۔ وہ ان بحثوں میں بھی حصہ لیتی تھی۔

شا آہستہ آہستہ اس کے حسن، سلیقے لباس اور رکھ رکھاؤ سے متاثر ہونے لگے۔ ایک بار جب وہ رات گئے واپس ہونے کے لیے اُٹھے تو مے موریس انھیں رخصت کرنے آئی، اور بنگلے کے درمیانی ہال میں دونوں نے ایک خاص نظر سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ اور بغیر کسی اشارے کے گویا قول و قرار ہو گئے۔

لیکن اس کے بعد شا کترا گئے۔ انھیں خیال گزرا کہ موریس ایک دولتمند آدمی ہے اور اس کی بیٹی نے ہمیشہ اعلیٰ معیارِ زندگی کے ساتھ بسر کی ہے وہ شا جیسے غریب آدمی کے ساتھ زیادہ دن خوش نہ رہ سکیگی۔ چنانچہ وہ ہمیشہ اس سے بچتے رہے۔ لیکن ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب انھوں نے دیکھا کہ ایک اور کامریڈ ــــ جو شا سے بھی کم آمدنی رکھتا تھا ــــ مے موریس کا شوہر بن گیا۔

اس شادی کے بعد شا اس نئے جوڑے کے مہمان رہے اور ایک ناخوشگوار واقعہ پیش آیا۔ تاہم اُنھوں نے اپنی طرف سے بڑی احتیاط برتی اور یہ احتیاط مے موریس کے لیے زندگی بھر کی مصیبت کا سبب بن گئی۔ اسے اپنے شوہر سے جُدا ہونا پڑا اور تمام عمر بیوگی کی زندگی گزار دی۔

۱۸۸۵ء میں مسز جینی پٹرسن سے ان کی دوستی بہت مشہور تھی اور شا نے خود

اس کا اعتراف کیا ہے۔

چند ڈرامے لکھ چکنے بعد شا کو روپیہ کی تکلیف نہیں رہی تھی۔ اور ویسے بھی ان کا شمار صف اول کے لکھنے والوں میں ہونے لگا تھا۔ اعلیٰ سے اعلیٰ سوسائٹی میں ان کی جگہ پیدا ہو چکی تھی۔ اکتالیس سال کی عمر میں وہ سخت بیمار ہو گئے اور کافی عرصے صاحب فراش رہے۔ بیماری سے اُٹھنے کے بعد ان میں ایک رقّتِ قلب پیدا ہو گئی تھی۔ اسی زمانے میں انہوں نے مس ٹاؤن شینڈ سے شادی کر لی۔

زندگی کا آخری دور بھی انہوں نے اپنے متعلق کئی افواہوں کے باوجود نہایت پاکیزگی اور راست بازی کے ساتھ گزار دیا۔

لندن میں ان کے جنسی تعلقات کے بارے میں جن خبروں نے دبی چھپی افواہ کی شکل اختیار کی ان میں سے مورلیس کے علاوہ ایسا ڈوراڈنکن کے متعلق بھی ایک افواہ تھی۔ ایسا ڈوراڈنکن اپنے عہد کی سب سے بڑی رقاصہ تھی۔ اور اس کے بارے میں بات چیت کرتے ہوئے شا نے اپنے سوانح نگار پیرسن سے ایک بار کہا:

'... دھواں بغیر آگ کے نہیں اُٹھتا۔ اور میں یہ کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ میرے اور اس کے درمیان ایک ایسی صورتِ حال پیش آچکی تھی جس کے بعد واقعے نے شکل اختیار کی .... میں ایک مکان میں مہمان تھا۔ سامنے صوفے پر ایک عورت بیٹھی تھی۔ جس کا چہرہ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا شکر سے بنایا گیا ہو اور کسی نے اس کو چاٹ لیا ہے۔ ہم دونوں کا تعارف کرایا گیا۔ تعارف کے بعد اس نے ہاتھ پھیلا کر کہا — " اوہ تم ہو شا۔ میں عمر بھر تم سے محبت

کرتی رہی ہوں۔ آؤ ___ ادھر۔ میں اُس کے پاس جا بیٹھا۔ ہم دونوں قریب بیٹھے ہوئے ایسی حرکتیں کرتے رہے کہ دیکھنے والے سمجھے جیسے ہم کوئی ڈرامہ اسٹیج کر رہے ہیں۔ اس نے بعد میں مجھے دعوت دی اور یہ ترغیب بھی دلائی کہ اگر میں اس سے باقاعدہ وقت مقررہ پر ملنے جاؤں تو وہ صرف میری خاطر برہنہ رقص کریگی لیکن میں وقت مقررہ پر جانا ہی بھول گیا!"

اس سے عورتوں کے متعلق اور جنسی جذبات کے متعلق شا کا رویّہ صاف ہو جاتا ہے۔ ویسے انہوں نے بعض دیباچوں میں کچھ اور اشارے بھی کیے ہیں "کیپٹن بروسباؤنڈ کی ذہنی تبدیلی" ڈرامے کے متعلق انہوں نے مشہور ایکٹریس "ایلین ٹیری" کا نام لیا ہے کہ اگر وہ نہ ہوتی یہ ڈرامہ نہ لکھا جاتا۔

شا خود کو ذہانت کا پُتلا (Genius) تو سمجھتے ہی تھے اور جینیس (ذہانت کے پیکرون) کا جو رویّہ عورتوں کے متعلق اور جنسی معاملات کے سلسلہ میں ہونا چاہیے اسے انہوں نے ایک سے زیادہ موقعوں پر جتایا ہے۔

ان کی رائے ہیں "جینیس" کو قدرت اس لیے پیدا کرتی ہے کہ وہ چاہے زندگی بھر خطروں سے کھیلتا رہے، چاہے کتنے ہی مصائب کا سامنا کرے۔ لیکن زندگی کی موجودہ سطح کو بلند سے بلند تر کرنے کے لیے کوشش کرتا رہے۔ اس کے برعکس عورتوں کو قدرت سے یہ جبلّت ملی ہے کہ وہ نئی زندگی کی تخلیق کے لیے اور فطرت کے بقائی سلسلے کو جاری رکھنے کے لیے باقی تمام چیزوں کو نذر کر دے لہذا دونوں کا ٹکراؤ لازمی اور تقاضائے فطرت کے عین مطابق ہے۔ جس طرح ڈارون کیڑوں کا مطالعہ کرتا تھا اور انہی سے جی بہلاتا تھا، اسی طرح ذہانت کا پیکر

اور غیر معمولی صلاحیت کا انسان عورتوں کا مطالعہ کرتا ہے اور ان سے صرف جی بہلاتا ہے، وہ اپنی زندگی کو عورتوں کی ترغیب اور بچوں کے پالنے پوسنے تک محدود نہیں کرتا۔ بلکہ انہیں بھی اپنے مشن پر قربان کر دیتا ہے۔

شا اسی اصول پر کاربند رہے۔ انھوں نے اپنے خاکوں میں ایک جگہ لکھا ہے۔ "جہاں کسی نے رومال گرایا اور میں فرار ہوا" (یعنی جہاں عورتوں کی طرف سے ذرا توجہ بڑھی اور میں نے اپنا دامن بچایا۔

بے جا نہ ہوگا اگر ان کی خانگی اور جنسی زندگی کو ان لفظوں میں مختصر طور پر دہرا دیا جائے جو انہوں نے فرینک ہاریس کو "سوانح عمری میں جنسی حصّہ" کے عنوان سے لکھے ہیں۔

... تم پر تو جنس طاری ہے۔ اگر اس نظر سے سوانح عمری کو دیکھو گے تو خاک بھی سمجھ میں نہیں آئیگا ..... میں بھی بہر حال انسان ہوں۔ اگر تمہارے ذہن میں میری مردانگی کے متعلق کچھ شبہ ہو تو اسے ذہن سے نکال دو۔ نہ میں ناکارہ تھا۔ نہ قوت مردانگی سے محروم۔ اور نہ خلاف وضع فطرت جنسی رغبت کا شکار ...... نہ میں جنسی اختلاط کے متعلق کوئی غلط رائے رکھتا ہوں۔ اور نہ اس کا پجاری ہوں۔ پاکیزگی کو میں ویسا ہی ایک جذبہ سمجھتا ہوں جیسا ذہانت کو .... جب میں نے تم سے کہا کہ اُنتیسواں سال شروع ہونے سے پہلے میرے ساتھ کوئی جنسی واقعہ نہیں گزرا تو تمہیں تعجب ہوا تھا۔ اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ میری جنسی زندگی اس وقت شروع ہوئی تھی .... آسکر وائلڈ کے خیال میں ۱۲ سال کی عمر میں جنسی تحریک بیدار ہو جاتی ہے اور روسو کہتا ہے کہ پیدا ہوتے ہی اس کا

خون جنسی تحریک سے اُبلنے لگتا ہے، میرا ذاتی تجربہ یہ ہے کہ روسو ٹھیک کہتا ہے اور آسکر وائلڈ غلط۔ جس طرح مجھے کوئی ایسا زمانہ یاد نہیں جب کہ میں لکھ پڑھ نہ سکتا ہوں، اسی طرح مجھے ایسا کوئی دور یاد نہیں ہے جب کہ میں عورتوں کے بارے میں خیال آرائی نہ کرتا ہوں، لیکن میں نے اپنی عصمت محفوظ رکھی۔

شادی ۴۳ سال کی عمر میں ہوئی۔ اور اس سے چودہ برس پہلے ہمیشہ کسی نہ کسی عورت سے سابقہ ضرور رہا۔ میں نے ہر قسم کے تجربے کیے اور جو کچھ ان (عورتوں) سے سیکھ سکتا تھا، میں نے سیکھا۔ عورتوں کو رقم کبھی نہیں دی۔ کیونکہ میں روپیہ خرچ کرنے کے قابل ہی نہیں تھا۔۔۔ طوائفوں کی طرف مجھے کبھی رغبت نہیں ہوئی ... جب میں اچھے خاصے کپڑے پہننے کے قابل ہوا تو اس بات کا عادی ہو گیا کہ عورتیں میری محبت میں گرفتار ہو جایا کرتی تھیں ۔۔۔ میں نے عورتوں کا پیچھا نہیں کیا۔ عورتوں نے میرا پیچھا کیا.... اس سے پھر غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو جانا ۔۔۔ میرا پیچھا کرنے والی تمام عورتیں ہمیشہ جنسی اختلاط کی خاطر میری طرف نہیں آتی تھیں ۔۔۔ ... ان میں کچھ شادی شدہ تھیں اور خوب مطمئن۔ اور جانتی تھیں کہ جنسی معاملہ ہمارے درمیان نہیں ہو سکتا .... کچھ اس کے برعکس صرف مسرت کا تبادلہ کرنا چاہتی تھیں ..... اور کچھ ناقابلِ برداشت تھیں ۔۔۔ اور سب ایک دوسرے سے مختلف تھیں ۔ میں نے شادی کے پہلو سے جنسی تعلق کو کبھی نہیں سوچا ۔۔۔ اور چالیس برس کی عمر سے پہلے شادی کا بار اُٹھانے کے قابل نہیں ہوا۔

مختلف اثرات شا نے اگرچہ خود اپنے ذہن پر کارل مارکس کے اثر کا اقرار کیا ہے لیکن ان پر صرف کارل مارکس ہی نہیں بلکہ اس کے متضاد

اثرات بھی حائل تھے۔ کچھ ذاتی مطالعے اور مشاہدے کی بدولت، کچھ ماحول کے اثر سے، کچھ اپنی سہولت کی خاطر۔

ان میں شا کی سہولت کو بہت کم دخل ہے۔ مارکسی نقاد کاڈ ویل نے ان کے بارے میں ایک جملہ لکھا ہے کہ انہیں عملی زندگی میں قلاش رہ جانے کا ڈر تھا اس لیے وہ دولتمند اور کھاتے پیتے طبقے کے دامن سے لپٹ گئے۔ اور ذہنی طور پر انہیں پرولتاری انقلاب کے نظریے کو قبول کر لینے کا خطرہ نظر آ رہا تھا اس لیے وہ اصلاح پسندوں کی آغوش میں چلے گئے۔ یعنی دوسرے لفظوں میں شا نے ذہنی اور عملی راہ وہ اختیار کی جس میں انہیں زیادہ آسائش اور سہولت حاصل ہو سکے۔ اس جملے میں صداقت کا ایک پہلو ضرور موجود ہے۔

۱۳ ۔ نومبر، ۱۸۸۷ء کو جب لندن کے مشہور پبلک مقام "ٹرافلگر اسکوائر" پر مزدوروں کے جلوس کے ساتھ پولیس کی ٹکر ہوئی اور مزدور دہشت کی زیادتی اور تنظیم کی کمی کی وجہ سے بھاگ گئے تو چند سوشلسٹوں کو بڑا غصہ تھا۔ وہ اس دن کی شکست کا انتقام لینا چاہتے تھے۔ مسز اینی بیسنٹ اور ولیم مورس دوبارہ ویسا ہی مظاہرہ کرنا چاہتے تھے اور پولیس کا مقابلہ کر کے جلسۂ عام کامیاب کرنے کی تیاری میں لگے ہوئے تھے۔ مزدوروں میں بھی بڑا جوش و خروش تھا اور صاف نظر آ رہا تھا کہ اگلے اتوار کو "ٹرافلگر اسکوائر" پر سخت ٹکر ہو گی۔ شا نے پہلے تو مورس کو لکھا کہ مسز بیسنٹ کو سمجھائے وہ تیاری روک دیں۔ اور بعد میں خود اس جلسے میں پہنچے جہاں آخری تیاریوں کا فیصلہ ہونا تھا۔ اینی بیسنٹ کھڑی ہوئیں۔ ان جیسی آتش نوا تقریری مہارت شاید یورپ میں کسی کو نصیب نہ ہو گی۔ انہوں نے کھڑے ہوتے ہی مجمع میں آگ لگا دی۔

اور اس کے بعد مظاہرے کی مخالفت کرنا بالکل ناممکن ہو گیا۔

شا کے ایک حامی اٹھے لیکن ناکام ہو کر بیٹھ گئے۔ بعد میں شا اُٹھے اور انہوں نے مسز بیسنٹ کی تجویز میں ترمیم پیش کی۔ اور مجمع کو ٹھنڈے لہجے میں سمجھایا کہ پولیس سے جنگ کرنے کا کیا مطلب ہوتا ہے۔ کس طرح Barricades سڑک روکنے والی تدبیریں اختیار کی جاتی ہیں۔ کس طرح بسوں کو اُلٹ کر پولیس کا راستہ روکا جاتا ہے۔ اور تمام انتظامات کے بعد بھی اگر گولی چلی تو وہ پُرانے قسم کی بندوقوں سے نہیں چلیگی بلکہ نئی مشین گنوں کی بوچھار ہو گی جس سے ایک منٹ میں ڈھائی سو گولیاں نکلتی ہیں۔ اور اس طرح مزدوروں کو ان کی ناکامی کا منظر دکھایا کہ جب بعد میں ووٹ لیے گئے تو مسز اینی بیسنٹ کے علاوہ ہر شخص شا کی حمایت کر رہا تھا۔

واقعے کے بعد جب "ٹرافلگر اسکوائر" کا سب سے بڑا مجاہد گراہم ولاس جیل سے چھوٹ کر آیا اور اس سے کسی نے پوچھا کہ تم شا کو جانتے ہو؟ تو اس نے جواب دیا۔ "ہاں۔ یہ وہی شخص ہے جو ٹرافلگر کے معرکے میں سب سے پہلے بھاگا تھا"۔ شا نے اس کے جواب میں ایک شخص سے کہا۔ "گراہم ولاس تو بڑھا چڑھا کر میری تعریف کرتے ہیں۔ بھلا اس وقت میرے ہوش و حواس کہاں بجا تھے جو میں بھاگنے کی سوچتا"

یہ واقعہ اس قسم کے کئی اور واقعوں سے علیحدہ محض ایک حادثہ نہیں ہے۔ شا چونکہ ہوش و حواس، عقل و دلیل، اور قائل معقول کرنے کی قوت پر خاص زور دیتے تھے اس لیے اُنہوں نے سہولت اسی میں دیکھی ہو گی کہ وہ عملی سرگرمیوں کے شباب کے زمانے میں فے بین تحریک کو قبول کر لیں اور ان نظریات کی تبلیغ کیے جائیں جن کا منشا یہ تھا کہ سوسائٹی انقلاب کی بجائے رفتہ رفتہ سوشلزم کی طرف ترقی کرتی جائے

دوسرے مارکسی نقادوں نے۔ مثلاً رجنی پام دت اور الک ویسٹ لے کا ڈویل کی رائے سے اتفاق نہیں کیا۔ اتفاق نہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ شا کسی سیدھے خط کا نام نہیں ہے بلکہ دو متوازی (او رمتضاد) خطوط کے مجموعے کا نام ہے جو کبھی ایک دوسرے میں ضم نہیں ہوتے مگر ایک ہی سمت میں بڑھتے چلے جاتے ہیں۔

وہ سمت ان کے مطالعے نے، ان کے مشاہدے نے، ان کے حساس ذہن نے اور ان کی فن کارانہ بصیرت نے مقرر کی تھی۔

شا کی تربیت ایک کٹر مذہبی ماحول میں ہوئی تھی جہاں پہلی تعلیم یہ دی جاتی تھی کہ خدا خود پروٹسٹنٹ ہے، او کیتھولک فرقہ کو جہنم کا ایندھن بنایا جائیگا۔ کیتھولک فرقے کو معتوب اور سماجی لحاظ سے پست اور قابل نفرت سمجھنا آئرلینڈ کے ان "پروٹسٹنٹ شرفا" کا ایک دستور تھا۔ شا نے انجیل پڑھی تھی۔ اور معمولی مذہبی تعلیم بھی حاصل کی تھی، چنانچہ ان کا شعور سب سے پہلے مذہب کے متعلق شک و شبہ کے ساتھ بیدار ہوا۔ کیونکہ مشاہدہ یہ بتاتا تھا کہ موسیقی جیسے فن لطیف میں ان کی ماں کی آواز کے ساتھ جن لوگوں کی آواز ساتھ دیتی تھی وہ اکثر کیتھولک تھے۔

"میں نے سوچا کہ اگر مذہب وہ ہے جو انسان کو انسان سے وابستہ کرتا ہے اور لامذہبیت وہ ہے جو انہیں ایک دوسرے سے توڑ دیتی ہے تو میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ اپنے ملک کا مذہب میں نے موسیقی کے ذوق میں پایا اور لامذہبیت اپنے وطن کے گرجا گھروں اور بڑے آدمیوں کی نشست گاہوں میں دیکھی۔

یعنی شا کا ماحول اور ان کا مشاہدہ تھا جس نے انہیں سب سے پہلے متاثر

گیا اور مذہب کی رسوم و عقائد کے خلاف شک و شبہ کی لہر دوڑائی۔ ابھی کھیلنے کودنے کے دن تھے کہ انہوں نے شیلی، بائرن اور ٹینی سن جیسے نغماتی شعرا پڑھ ڈالے۔ اور وقت سے پہلے سوجھ بوجھ اور فکر کی قوت کو پیدا کر لیا۔

گرجا گھر میں بے لذت عبادت اور اس کے رسمی طول اور بے کیفی کے خلاف جذبات پختہ ہو چلے تھے۔ ایک شام ٹورکا پہاڑی کی کھلی فضا میں ٹہلتے ہوئے شا کو گرجا گھر کی محبوس فضا۔ اور حبسِ بیجا کا خیال آیا ہو گا کہ انہوں نے خود سے سوال کیا۔ جب مجھے اعتقاد نہیں ہوتا تو میں ہر رات عبادت کیوں کرتا ہوں؟۔۔۔ اور اس نتیجے پر پہنچے کہ محض وہم پرستی کی حرکتیں کرنے سے الگ رہینگے۔ چنانچہ اس رات نماز نہیں پڑھی۔ رات بھر چین نہیں آیا۔ اور ضمیر سے سوال و جواب ہوتا رہا۔۔۔ دوسرے دن ضمیر بھی مطمئن ہو گیا اس کے بعد سے انہوں نے خود کو دہریہ اور منکرِ خدا کہنا شروع کر دیا۔

وہ اس وقت تک زیادہ تر شیلی سے متاثر تھے۔ اور برطانوی جرنلسٹ بریلسفورڈ کا خیال ہے کہ شا کی تعمیر میں شیلی کا بڑا حصہ ہے۔

ڈبلن میں موسیقی کے اثر سے انہوں نے موسیقی کی نئی راہیں نکالنے والے عہد ساز موسیقار واگنر کا مطالعہ کر ڈالا۔ واگنر کے مطالعہ نے قدیم دستور کے خلاف ان میں بغاوت کی چنگاری اور بھڑکا دی۔ اور واگنر ان پر ایسا طاری ہوا کہ انہوں نے خود کو "A Perfect Wagnerite" (مکمل طور پر واگنر کا ماننے والا) کہا ہے، اس کے بعد ڈراموں اور ناولوں کی راہ سے وہ ابسن تک پہنچ گئے۔ اور ابسن نے ان کے اندر عقلیت پسندی اور استدلال دوستی کے جذبے کو اور آگے بڑھایا۔

کسی ایک راہ پر لگ جانے کا ضروری سامان مہیا ہو چکا تھا لیکن اس وقت تک شاؔ کی وہی حالت تھی کہ

چلتا ہوں تھوڑی دُور ہر اک راہ رو کے ساتھ :. پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

۱۸۷۹ء میں ایک دوست لندن کے بعض پڑھے لکھے نوجوانوں کی مجلس مباحثہ "Zetetical Society" میں لے گیا۔ جہاں کارلائل اور اسی قسم کے دوسرے آزادی کے مبلغوں کی تعلیمات پر، مذہبی روشن خیالی پر، سماج سُدھار کے مسائل پر بحثیں ہوا کرتی تھیں۔ وہاں شاؔ کے خیالات اور منجھ گئے۔ لیکن جب ۱۸۸۳ء میں جب ان کی عمر صرف چھبیس ۲۶ سال تھی سوشل ڈیموکریٹک فیڈریشن کے جلسے میں گئے اور وہاں حاضرین نے انہیں مارکس کی معاشیات سے بے خبر ہونے کا طعنہ دیا تو وہ عہد کر کے نکلے کہ سب سے پہلے مارکس کو پڑھ ڈالیں گے چنانچہ وہ دو ۲ برس تک لندن کے برٹش میوزیم ریڈنگ روم میں بیٹھے ہوئے مارکس کو پڑھتے رہے اور سوشل ڈیموکریٹک فیڈریشن کے جلسے میں حاضری دے کر، تقریریں کر کے اس مطالعہ پر صیقل کرتے رہے۔

مارکس کی بنیادی کتاب "داس کیپیٹل" تنہا کتاب تھی جس کا مطالعہ شاؔ نے ایک طویل عرصے تک اور بڑی محنت سے کیا۔ اور جب مطالعہ کر چکے تو انہوں نے کہا "جب تک مارکس نہیں پڑھا تھا میں ایک بزدل آدمی تھا۔ مارکس نے مجھے بچایا۔ مجھے کمیونسٹ بنایا اور مجھے ایک عقیدہ دیا"

مارکس کا نقش ایسا گہرا نقش تھا جو زندگی کے آخری لمحے تک ان پر طاری رہا اور ہزار نقابوں کے باوجود اپنی جھلک دکھاتا رہا، لیکن مارکس کا اثر بھی ان کے

یہاں سالم نہیں رہا۔ بعد میں انہوں نے ایک اور ماہر معاشیات، فلپ وکسٹیڈ کا نظریہ سُنا اور بالآخر جوائنس کے نظریہ "قدر" پر انہوں نے مارکس کے نظریے "قدر زائد" کو قربان کر دیا اور کم از کم تیس برس تک وہ اس شبہ میں مبتلا رہے کہ مارکس کا طبقاتی نظریہ صحیح ہونے کے باوجود عملی بھی ہے یا نہیں ؟

یہی شک و شبہ اور مزدور تحریک کی پس ماندگی ـــــ اور ان دونوں حقیقتوں سے بڑی حقیقت یہ کہ وہ خود کو پڑھے لکھوں کے درمیانی طبقے کا ایک فرد سمجھتے تھے اور اسی طبقے کے ماحول میں سکون اور سہولت محسوس کرتے تھے ـــ تینوں حقیقتیں انہیں فے بین تحریک کی جانب لے گئیں ـــ فے بین تحریک اگرچہ سوشلزم کی مدعی تھی لیکن اس میں اور دوسری سوشلسٹ تحریکوں میں ـــ جو ابھی پوری طرح جنم نہیں لے پائی تھیں ـــ فرق یہ تھا کہ فے بین تحریک میں شا کے بقول ذہین، ذی فہم، اور معقول نوجوان شامل تھے۔ سڈنی ویب ان کے ہم عمر تھے اور ہم طبقہ بھی۔ اولیور جسے خود شا بعد میں فے بین سوسائٹی کے اندر لائے، اس تحریک کے روح و رواں بن گئے۔ اور شا سوشلزم کے لیے براہ راست جنگ سے دور رہ کر بھی اپنے تمام ساتھیوں کے مقابلے میں سب سے زیادہ سوشلزم دوست اور انقلاب کے ہمدرد تھے۔ فے بین ازم کے سب سے بڑے مبلغ ہونے کے باوجود ان کی تحریروں میں وہ تضاد ملتا ہے جو ان کے سوشلزم اور فے بین ازم دونوں میں حائل تھا۔ اور جو برنارڈ شا میں زندگی اور ذہنی ارتقا کی علامت تھا۔

یہی دور تھا جس میں شا نے افلاطون کے فلسفے کا گہرا مطالعہ کیا۔ اور یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ افلاطون کی کتاب "ریپبلک" اور دوسری تحریروں نے شا کو کافی

متاثر کیا۔ عام آدمی کی انقلابی صلاحیتوں سے افلاطون کی مایوسی اور بیزاری شا کے ذہن پر گہرا نقش چھوڑ گئی۔ اس کے بعد جرمن فلسفی اور شاعر نطشے (Nietzsche) ان کے ہاتھ لگ گیا۔ افلاطون کے یہاں فرد کی اہمیت پر جو زور دیا گیا تھا نطشے نے اس پر ایک اور منزل تعمیر کی ..... "فوق البشر" کا خاکہ نطشے جیتے جی فوق البشر کا خواب پریشاں پیش کرتا رہا۔ مسیحیت کے خلاف ایک مبہم نفرت کا اظہار کرتا رہا اور برتر فرد کی صلاحیت کا پیغام سناتا رہا تھا۔ شا کو نطشے بہت برے وقت ملا۔ انہوں نے نطشے سے فوق البشر (سپرمین) کا دھندلا تصور لے لیا اور اپنی تحریروں سے اس کے نقش ذرا اجاگر کیے۔ نطشے کا ذہنی اثر تو شا کے ہاں صاف جھلکتا ہے لیکن شا نے اس کے آگے پوری طرح سپر نہیں ڈالی۔

اِدھر ڈارون کے نظریہ ارتقائے جسمانی کا بڑا چرچا تھا۔ اور فلسفے کی پوری کائنات اس میں الجھی ہوئی تھی۔ شا کے اندر افلاطونی روح اس نظریے میں صرف جسمانی ارتقا کی اہمیت سے مطمئن نہیں تھی۔ اتنے میں لیمارک اور ٹیلر کے نظریے آ گئے اور شا نے لیمارک کو قبول کر لیا۔ کیونکہ افلاطون اور اس کے بعد نطشے کے اثر سے شا کے ذہن کی زمین اس کے لیے تیار ہو چکی تھی۔

شا نے جن مفکروں کے نام گنائے ہیں ان میں ٹالسٹائی اور گاندھی جی کا بھی ذکر آتا ہے۔ لیکن مارکس پر تنقید کرنے کے باوجود تنہا مارکس ایسی شخصیت ہے جس کا نام وہ شکر گزاری کے ساتھ لیتے ہیں۔ اور بار بار لیتے ہیں۔

مارکس نے تاریخ اور تہذیب کی طرف میری آنکھیں کھولیں۔ مجھے کائنات

کا ایک بالکل تازہ اور زندہ تصور دیا اور میری زندگی کو مقصد اور مشن عطا کیا۔

۱۸۹۰ء سے پہلے جب دنیا کے دوسرے سرمایہ دار ممالک میں معاشی بحران کی لہر آئی تھی، بے روزگاری بڑھ رہی تھی اور صنعتوں پر زوال آگیا تھا، برنارڈ شا لندن کے اس سرے سے اُس سرے تک پھیلی ہوئی مزدور تحریک میں آگے بڑھ کر حصّے لیتے رہتے تھے۔ بعد میں جب وہ بحران کم ہوا اور بے روزگاروں کو روزگار ملنے لگا، تو مزدور تحریک کا سیلاب بھی رُک گیا۔ شا اس زمانے میں سڈنی دیب اور اسی قسم کے دوستوں کے اثر میں رہے۔ اور ویب کی یہ دلیل ان کی سمجھ میں آگئی کہ ناخواندہ، غیر منظم اور تہذیبی لحاظ سے پست مزدور انقلاب لانے کے نااہل ہیں۔ انقلاب تشدّد کے ذریعہ نہیں، بلکہ دھیرے دھیرے ترقی کے ذریعے آئیگا لیکن جب ۱۹۱۷ء میں روس کا انقلاب ہوا۔ تو شا پر اس کا گہرا ردِ عمل ہوا۔ انہوں نے فے بین تحریک سے ذہنی ناتہ توڑلیا۔ اور کل تک جن طریقوں کو وہ فضول کہتے تھے ان کی صداقت کی طرف جھکنے لگے۔ ان پر لینن کی شخصیت کا اثر پڑا۔ اور انہوں نے اس کا خیر مقدم کیا۔

۱۹۲۹ء میں جب اُنہوں نے سیب گاڑی لکھی ہے ۔۔ وہ پارلیمنٹری جمہوریت اور فے بین تحریک کی ذہنی اولاد، برطانوی لیبر پارٹی کی کارگزاری سے بالکل مایوس ہوچکے تھے۔

۱۹۳۵ء میں وہ سوویٹ روس گئے ۔۔ انہوں نے سُرخ فوج کو دیکھا۔ اسٹالن کو دیکھا۔ سوویت روس کی نئی زندگی کو دیکھا۔ اور کھل کر اتنی تعریف کی کہ تمام سرمایہ دارانہ نظام اس سے دہل گیا۔

وہی شا جو چند برس پہلے ہٹلر کو بے قصور کہہ چکا تھا، فاشزم کے خلاف نفرت کا اظہار کرنے لگا۔ اور اس نے کھلے لفظوں میں اعلان کیا:

"تمام دنیا کی نگاہوں کے سامنے سوویت روس اس بات کا نمونہ ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام کے مقابلہ میں سوشلزم کا (اشتراکی) نظام بے پناہ فوقیت اور برتری رکھتا ہے۔ معاشی لحاظ سے سوشل اعتبار سے اور سیاسی لحاظ سے غرض ہر طرح اشتراکی نظام کہیں زیادہ کامیاب اور اعلیٰ ہے"

استالین کی ذہانت، اس کی عملی قابلیت اور اس کے تدبر کے لیے جو الفاظ شا نے لکھے ہیں وہ انہوں نے زندگی میں کسی ایک شخص کے لیے کبھی نہیں لکھے یہ اثرات تھے جنہوں نے شا کی ایک خاص سمت مقرر کی اور صبح کے بھولے کی طرح شام کو پھر اشتراکیت کی منزل پر پہنچ گئے۔

شا

کیا ہے، کیا نہیں ہے؟

شا کے ناول

شا نے ساڑھے چار ناول لکھے "Immeturity" (ناپختہ کاری) "Irrational knot" (ناموزوں گرہ) "Love among the artists" (فن کاروں میں محبت) اور "Cashel Byron's Profession" (کیشل بائرن کا پیشہ)۔ پانچواں ناول "An Unsocial Socialist" (میل جول سے بچنے والا سوشلسٹ) وہ لکھنے بیٹھے تھے، لیکن ابھی صرف ابتدائی حصہ یعنی دو باب ہی ختم کیے تھے کہ "بیخبری اور نا اہلی کے ساتھ جی چھوڑ دیا"

لیکن یہ پانچواں ناول — جو نامکمل رہ گیا تھا، آگے چل کر سب سے زیادہ اہمیت اختیار کر گیا اور ایک مکمل ناول سمجھا گیا۔ شا کی کوشش تھی کہ سماج کے جو بنیادی مسائل ہیں ان کے لیے ایک ناول نہیں بلکہ "حرف آخر" لکھیں لیکن حرف آخر لکھ دینا اس برنارڈ شا کے بس کی بات نہیں تھی جو زندگی کے ہر علم کو، ہر فلسفے اور ہر نظریے کو، راستے کے ہر پتھر اور ہر ڈگر کو حرف اوّل سے تلاش کرنا شروع کرتا ہو۔ شا کو افسوس ہے کہ "ستائیس سال کی عمر میں ایک شخص سب کچھ نہیں جان سکتا" لیکن شا کے معاملے میں یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ اگر اُنھیں دو سَو ستر سال کی عمر ملتی تو شاید وہ اپنے اس ناول کو کبھی مکمل نہ کر سکتے ناول کی تکمیل کی راہ میں وہ خود سب سے بڑی چٹان تھے — "ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہے سنگِ گراں اور"۔

یہ سنگِ گراں کیا تھا؟ شا کے ناولوں میں کرداروں کا مصنوعی حد تک عجوبہ پن۔ ان کی حد سے زیادہ انفرادیت پرستی، خود پسندی، اور خود کو قدم قدم پر لیے دیے رہنے کی کوشش۔ جسے اُبھارنے کے لیے شا کو غیر متعلق حادثوں کی کڑیاں جوڑنی پڑتی ہیں۔

اپنے وطن ڈبلن سے نکلے ہوئے شا کو زیادہ دن نہیں ہوئے تھے جب اُنھوں نے سوچا کہ ناول لکھیں۔ ڈبلن سے جب وہ لندن آئے تو لندن میں نہ کوئی دوست تھا، نہ باقاعدہ ذریعۂ معاش تھا، نہ کوئی اور سہولت۔ گھربار کا کوئی سہارا نہیں تھا۔ انگلینڈ اس زمانہ میں ایک معاشی بحران سے گزر رہا تھا اور شا جیسے نوجوان کے لیے سوسائٹی میں اول تو یونہی جگہ مشکل تھی اور پھر خود شا کے گھریلو حالات نے ان میں بڑی جھجک اور احساسِ کمتری پیدا کر دیا تھا ایک ایسی شخصیت، جس کا نہ کوئی گھر رہا ہو، نہ گھر کا کوئی قابلِ ذکر ماحول۔ نہ بچپن کی مسرتیں ملی ہوں، نہ ماں باپ کی شفقت۔ نہ دوستوں سے مدد ملی ہو اور نہ آئندہ مدد ملنے کا یقین ـــــ جب وہ ناول لکھنے بیٹھتا ہے تو خود اس کا کردار پہلی تصویر تھی جو اس کی نظر کے سامنے آئی۔

"ناپختہ کاری" ناول ۱۸۷۹ء میں لکھا گیا۔ اس پورے ناول پر ایک علاحدگی، ایک بے رخی، بیزاری اور باغیانہ جذبات کے خاموش بہاؤ کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ ناول کا ہیرو رابرٹ اسمتھ ساری دنیا سے الگ تھلگ ایک ایسی عمارت میں چکر لگا رہا ہے جس کی تصویر کسی پرانے غیر آباد اور بھدے پتھریلے مکان کی شکل میں ابھرتی ہے۔ تھوڑی دیر وہ ادھر اُدھر ٹہلتا رہا۔ وہ مکان کے اِس حصے

کا مالک ہے لیکن اس میں مالکانہ جوش و خروش نظر نہیں آتا۔ بلکہ ایک سرد مہری دکھائی دیتی ہے جس طرح بوڑھے منطقی کو استدلال کے معاملہ میں ایک نہایت غیر جذباتی بے تعلقی کا تعلق رکھنا ہوتا ہے، وہی اس ہیرو کی حالت ہے۔ ہیرو کے سامنے اس کے بچپن کی یادگاریں، توپ کے کھلونے اور ٹین کا پستول پڑا ہے، مگر وہ انہیں اشتیاق سے نہیں اُٹھاتا۔ بلکہ نہایت خاموشی سے ان کھلونوں کی جگہ اُٹھا کر رکھ دیتا ہے۔ اس کی توجہ ادھر ہے کہ اگلے برس کے مصارف کا بجٹ تیار کرے۔ چنانچہ وہ کاغذ پر لائنیں کھینچ کر بجٹ لکھنا شروع کرتا ہے۔

شا نے ایک جگہ لکھا ہے کہ وہ اس ناول کے پانچ صفحے روزانہ بڑی پابندی کے ساتھ لکھتے تھے اور اگر کہیں پانچویں صفحے پر جملہ پورا نہیں ہو سکا ہو تو وہ آدھا ہی جملہ چھوڑ دیتے تھے اور دوسرے روز کے کوٹے میں اس کی تکمیل کرتے تھے۔ شا کے پہلے، دوسرے، تیسرے اور پانچویں ناول کے ہیرو بھی اتنے ہی پابند۔ اتنے ہی منطقی اور اتنے ہی ٹھنڈے مزاج کے سخت گیر اور اصول پرست انسان ہیں۔

رابرٹ اسمتھ کو کبھی کبھی مذاق سوجھتا ہے، وہ قہقہے لگانا چاہتا ہے لیکن فوراً ہی ایک ٹھوس اور خشک سی کتاب اُٹھا کر پڑھنا شروع کر دیتا ہے۔ "پاسبانِ عقل" سے شا کا ہیرو کبھی غافل نہیں ہونے پاتا۔

چوبیس سال کے نوجوان کے قلم سے اس قسم کا ہیرو اُبھرنا ایک خلاف معمول حقیقت ہے۔ لیکن یہ حقیقت شا کے پانچوں ناولوں کو ایک ہی منزل پر لے گئی۔ اور وہ منزل الک ویسٹ کے الفاظ میں یہ تھی کہ:

"ایک طرف تو یہ (تنہا پسندی اور عقلیت پسندی) اس جنگ کا ایک حصہ ہے جو ہیرو متوسط طبقے کے خلاف لڑتا ہے۔ سماج کے قوانین ایسے ہیں جو دنیا کو بزدلوں اور جھوٹوں مکاروں کے لیے سہولت بخش بنا دیتے ہیں..... لہذا ہیرو اسے اپنا مطمح نظر بنا لیتا ہے کہ وہ سماج کے ہر قانون، ہر نظریے اور ہر تقاضے کو دلیل اور معقولیت کی کسوٹی پر کس کر دیکھے...... ہیرو اپنے استدلال پر پورا بھروسہ رکھتا ہے اور کسی حالت میں بھی جذبات کی رو میں بہنے کو تیار نہیں کیونکہ جذبات کی رو اسے انہی لوگوں سے لے جاکر جوڑ دے گی جن کے نظریوں کو ہیرو کی عقلیت پسندی ٹھکراتی ہے۔ ہیرو کی عقلیت پسندی اس کی اپنی دیانتداری کا بچاؤ ہے کہ کہیں جذبات کا دھندلکا اس کے شعور پر نہ چھا جائے اور چیزوں کی جانچ پرکھ میں جس شعور کا وہ ثبوت دیتا ہے اُسے کہیں دُھندلا نہ دے.....

لیکن دوسری طرف یہی عقلیت اور استدلال سے جانچ کر چیزوں کو اختیار کرنے کی صلاحیت ہے جو ہیرو کو اسی طبقے میں رکھنے کا جواز پیش کرتی ہے جس طبقے کے نظریے سے وہ خود کو الگ تھلگ رکھتا ہے اور جس کے خلاف اپنے ماحول سے الگ تھلگ اور بے نیاز رہنے سے اظہار ہوتا ہے......

"شا کی معقولیت پسندی ایک ذریعہ ہے جس سے وہ ہیرو کی تصویر پیش کر کے، خود کو متوسط طبقے کی شرافت سے بھی الگ کرتا ہے اور مزدور طبقے سے بھی بے تعلق رکھتا ہے۔ یہ (غیر جذباتی استدلال پسندی) شا کی

اپنی سماجی پوزیشن کا اظہار ہے، یعنی جیسا کہ انہوں نے اپنے ناول "ناپختہ کاری" کے دیباچے میں کہا ہے، "انہیں غریبوں اور دولتمندوں کے درمیان الگ تھلگ اور تن تنہا چھوڑ دیا جائے"۔

دوسرے ناول میں شادی کے موجودہ بندھن کو غیر قدرتی بندھن دکھانے کے لیے شا نے نہایت دلچسپ پلاٹ تیار کیا ہے۔ ایک مثلث ہے جس میں ایک طرف ہیرو ایڈورڈ کونولی ہے، دوسری طرف میرین لینڈ۔ دونوں کے درمیان فوجی افسر شولٹو ڈگلس۔ میرین کی زندگی ناز و نعم میں بسر ہوئی، وہ جن تقاضوں کی عادی ہو وہ تقاضے کونولی جیسے معمولی گزر بسر کرنے والے ذہین نوجوان کے ساتھ شادی شدہ زندگی میں پورے نہیں ہو سکتے، وہ تفریح کے لیے گلاسگو جانا چاہتی ہے لیکن شوہر اس بار کے اٹھانے سے انکار کر دیتا ہے۔ چنانچہ وہ شوہر سے مایوس ہو کر ڈگلس کے ساتھ فرار ہو جاتی ہے۔ مگر وہاں محض ایک فوجی ہے، ایک لوچ دار ذہین نوجوان نہیں، چنانچہ پھر اُسے 'ناموزوں گرہ' کا احساس کھائے جاتا ہے۔ بعد میں ہیرو اپنی گم گشتہ بیوی کو واپس لینے پر آمادہ ہے، مگر وہ ڈگلس سے حاملہ ہو چکی ہے۔ لہذا ہیرو اس کی یہ تجویز مان لیتا ہے کہ شوہر اور بیوی کے رشتہ کو خوشی سے خیر باد کہہ دیا جائے۔

"میل جول سے بچنے والا سوشلسٹ" پانچواں ناول شا نے اس وقت لکھا جب وہ سوشلزم کی تحریک اور اس کی اقتصادیات و معاشیات سے باخبر ہو چکے تھے اور اس کا اثر قبول کر چکے تھے۔ چنانچہ یہاں بھی پورے ناول کا مرکز ایک ایسا کردار ہے جو خیالات کے اعتبار سے سوشلسٹ اور عملی لحاظ

سے تنہائی پسند اور ٹھنڈے مزاج کا نوجوان ہے۔

سِڈنی ٹِری فوسِنز اور بہت بڑے دولتمند کارخانہ دار کا بیٹا ہے لیکن مطالعے اور استدلال نے اسے اس نتیجے پر پہنچا دیا ہے کہ اس کی تعلیم و تربیت اس کے عیش و عشرت کا سامان اور اس کے گرد و پیش کی ہر شے غریبوں کے خون سے بنی ہے۔ اس نظام کی بنیاد ہی بے ایمانی اور بدعنوانی پر رکھی ہے۔ سفید زرق برق لباس پہننے والوں کا تن جتنا اُجلا ہے، ان کا من اتنا ہی مَیلا ہے۔ پھر کیا ہو؟ بغاوت! — چنانچہ بغاوت کے جذبے نے سر اُٹھایا۔ اس نے اپنی محبوب بیوی کو اس باغیانہ جذبے سے آگاہ کیا۔ بیوی کی محبت اس کا دامن نہ تھام سکی اور وہ سماج کے عالیشان مقام سے نکل بھاگا۔ اور بہت دور نکل گیا، جہاں مزدوروں کی بستی تھی۔ وہاں وہ خود بھی ایک مزدور بن گیا۔ اس نے اپنا نام بدل ڈالا، اپنی عادات بدل ڈالیں، مزدوری سے پیٹ بھرتا رہا اور مزدوروں کی ایک عظیم الشان تنظیم کے لیے محنت کرتا رہا۔ منطق اپنے نتیجے کو پہنچ چکی ہے کہ — اتنے میں ٹری فوسنز کی بیوی غم سے گھُل گھُل کر ہلاک ہو جاتی ہے۔ اور ٹری فوسنز پر واپسی کا دورہ پڑتا ہے۔ وہ مزدوروں کا ساگندہ لباس اُتار پھینکتا ہے اور اپنے پچھلے سماج میں واپس چلا آتا ہے۔ وہ سوشلزم سے دست بردار نہیں ہوا لیکن اب سوشلزم کی تحریک کو وہ مزدوروں میں رہ کر نہیں بلکہ دولتمند مل مالکوں میں رہ کر کامیاب کرنا چاہتا ہے۔ وہ دولتمندوں کو نوآبادیاتی نظام کے خلاف اُکساتا ہے۔ اور اس کے انجام سے آگاہ کرتا ہے۔ اور دوسری طرف اپنا گھر ایک الھڑ اور "امور خانہ داری میں مصروف" قسم کی لڑکی سے بسا لیتا ہے،

یعنی اس نے سوشلزم کی کامیابی کو انقلاب میں نہیں بلکہ ارتقا میں پالیا۔

اس ناول میں شا کا مقصد تو کافی اُبھر آتا ہے لیکن مقصد کو اُبھارنے والے حادثات اور واقعات کی پوری صورت نظر نہیں آتی۔ ہیرو کی انتہا پر پہنچی ہوئی انفرادیت پرستی اور اس کے خیالات میں بسی ہوئی سوشلسٹ تحریک کا ٹکراؤ کن کن واقعات کی شکل میں ہوا اور ہونا چاہیے تھا یہ کہیں نہیں دکھایا گیا۔ ناول میں واقعات کی کڑی سے کڑی ملتی جانی چاہیے تاکہ نفس موضوع دھیرے دھیرے اپنی راہ بناتا چلا جائے لیکن شا کے اس ناول میں بھی واقعات بالکل حادثے کی طرح اچانک نازل ہوتے ہیں اور حادثوں کے جوڑ سے کردار اور ان کی کہانی بنائی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہوگی جو برنارڈ شا بحیثیت ناول نگار کامیاب نہ ہو سکے۔

اس ناول میں ہیرو ٹری فوسنر جب مزدور کے بھیس میں اسمائی لاش کے نام سے مزدوری کر رہا ہے، وہاں اسے اس کی سابق بیوی ہنریتا پہچان لیتی ہے لیکن ادھر دونوں نے ایک دوسرے کو پہچانا اور ایک دم ایسے فرار ہوئے کہ پھر کبھی نہ ملنے کی کوشش کی، نہ ملے۔ حالانکہ یہ ایسا اچانک لمحہ تھا جو ناول کی جان بن سکتا تھا، لیکن وہ اچانک ناول میں شامل ہو گیا اور اچانک ہی غائب ہو گیا۔ اسی طرح دوسرا موقع ہے کہ ہیرو ایک لڑکی لینڈ سے کے ساتھ تعلقات قائم رکھتا ہے، ناز و نیاز کرتا ہے لیکن جب شادی کا سوال آتا ہے تو وہ اپنی محبوبہ کو ترغیب دیتا ہے کہ اسکن (ایک اور اُمیدوار) سے شادی کر لو۔

یہ حادثے ہیں جن کا کوئی جواز نہیں۔ کیونکہ جواز پیدا کرنے کے لیے منطقی نتیجے تک پہنچنا پڑتا ہے اور اپنے کرداروں کو تراشتے وقت شا ان کے منطقی انجام سے ڈرتے ہیں، اور اسے ٹال جانا چاہتے ہیں۔

"فن کاروں میں محبت" کا دیباچہ لکھتے وقت شا نے اس ناول کا مقصد یہ بیان کیا ہے کہ اس کے ذریعہ وہ سچے اور جھوٹے، اصلی اور نقلی فن کاروں کا فرق جتانا چاہتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کرداروں کے باہمی تضاد سے یہ فرق ابھرتا ہے لیکن بعض کرداروں کی شکل صورت انتہائی عروج کے لمحوں میں ایسی مسخ ہوتی ہے کہ انہیں ہیرو یا ہیروئن کی سی تعظیم دینے کے بجائے ان پر رحم کرنے کو جی چاہتا ہے۔ جیک ایک سچا فن کار ہے جسے فنی کاوش اتنی مہلت ہی نہیں دیتی کہ وہ اِدھر اُدھر جنسی ڈور پھیلا سکے اوریلی بھی ایسی ہی فن کار ہے۔ دونوں میں ایک جذباتی ربط ہے، لیکن جذباتی ربط جذباتی ترغیب سے اس درجہ پاک ہے کہ اوریلی کی شادی ہوگئی، بچہ ہوگیا مدت گزر گئی اور تب کہیں جیک کو ہوش آیا کہ وہ اس کے سامنے شادی کی تجویز پیش کرے۔ یہ بحویت بالکل غیر قدرتی اور مصنوعی معلوم ہوتی ہے۔

"ناپختہ کاری" میں ہیرو رابرٹ اسمتھ پہلے ایک رقاصہ کے خیال میں محو ہوتا ہے، پھر ایک پوشاک ساز عورت کے دام محبت میں گرفتار ہوتا ہے پھر اس کے آقا یا سیٹھ کی لڑکی ایسابیلا اس سے محبت کرتی ہے۔ لیکن رقاصہ سے جان پہچان بھی نہ ہوئی تھی کہ اس کا نقش مٹ گیا، ایسابیلا اور پوشاک ساز ہیریٹ نے اس سے مایوس ہو کر دوسروں سے شادی کرلی اور ہیرو کنوارا رہ گیا۔

یہاں پھر ہیرو کی خود پسندی اس کے کامیاب انجام کے درمیان حائل ہے۔ اپنے کردار کے رکھ رکھاؤ اور اپنی پاک دامنی، راست بازی کی وجہ سے وہ عورتوں کے لیے کشش کا سبب بنتا ہے مگر جیسے ہی وہ اس کی زندگی میں داخل ہونا چاہتی ہے وہ اپنے دروازے اندر سے بند کرلیتا ہے یا پھر خود رسّی تڑا کر بھاگ نکلتا ہے۔

"کیشل بائرن کا پیشہ" ایسا ناول ہی جس کے متعلق شا کے بہت بڑے نقاد لوئی اسٹونسن کی رائے ہے کہ فنی معیار سے یہ شا کی معراج ہے اور کبھی انہوں نے اس سے بہتر فنی نمونہ پیش نہیں کیا۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہوگی کہ تنہا اسی ناول میں ہیرو ایک جانا پہچانا جذباتی انسان ہے اور کم از کم دوسرے ناولوں کے عجوبہ کرداروں کی طرح اجنبی نہیں معلوم ہوتا۔ وہ ایک غریب معمولی گھرانے کا نوجوان ہے، لیکن اس کی شوخی، اس کی جذباتی بیقراری، اس کا جوش وخروش ایک نہایت دولتمند گھرانے کی دوشیزہ لڈیا کو اپنی طرف مائل کرلیتا ہے۔ اور لِڈیا اپنے پچھلے منگیتر کی طرف سے غافل ہو جاتی ہے لیکن یہاں آخر تک یہ پتہ نہیں چلتا کہ ہیرو میں جو کشش ہے وہ اس کی خوبصورتی، اس کی لاپروائی اور اس کی سیماب صفتی کے علاوہ کسی اور وصف کا نتیجہ بھی ہے یا نہیں۔ ورنہ ہیرو کو ہیرو سمجھ لینا بھی مشکل ہے۔

اس کے بعد دوسرا تضاد آتا ہے کہ یہی معمولی درجہ کا نوجوان جب لڈیا سے شادی کرنے کے بعد سماج میں ایک اونچے مقام کا مالک بنتا ہے، پارلیمنٹ کا ممبر ہو جاتا ہے اور حکمرانوں کے حلقوں میں اٹھتا بیٹھتا ہے تو اس کے لباس،

اس کی گفتگو، اس کی نشست و برخاست میں ایک چڑ چڑانے اور بھونڈاپن پیدا کرنے کا انداز پایا جاتا ہے۔ اس کے کوٹ کا کالر ہمیشہ بے ڈھنگا رہتا ہے۔ اس کی گفتگو کرخت ہوتی ہے اور شرفا کے ستھرے مذاق پر کھرونچ لگاتی چلی جاتی ہے۔

شا اس کردار سے غالباً یہ جتانا چاہتے ہیں کہ وہ شرفا کے طبقے کی مصنوعی شرافت پر اندر سے ضرب لگاتا ہے، اس سے نفرت کرتا ہے اور دولتمندوں کے چونچلے اس کی نگاہ میں ٹھکرا دینے کے قابل ہیں۔ صرف اسی ناول میں نہیں بلکہ دوسرے ناولوں میں بھی شا نے ایسی صورت حال کسی نہ کسی طرح ضرور پیش کی ہے، جیساکہ سرمایہ دار سماج کی جذباتیت اور اس کے چھچھورے پن کے خلاف گہرا طنز اور اس پر ایک وار پڑتا ہے لیکن یہ وار اوچھا رہ جاتا ہے کیونکہ وار کرنے والے کرداروں کے نہ ہاتھ صاف ہیں، نہ نگاہ بے باک ہے اور نہ انہیں وار کرنے کی لائن سے کوئی واسطہ ہے۔

شا کے ناولوں میں ہیرو ایک ایسے کردار کا نام ہے جو عورتوں کو جیتنے، میں، محبت کی خاطر مصائب جھیلنے میں اور روپیہ کمانے میں وقت نہیں گزارتا بلکہ سماج کے مقررہ اصولوں اور اس کے بندھنوں کے خلاف اپنی استدلال پسندی کے ہتھیار سے جنگ کرتا ہے اور اس کی پوری کوشش یہ رہی ہے کہ "اپنے من میں ڈوب کر پاجا سراغِ زندگی" اور اس کا من صرف تنہا پسندی اور اپنے سوا ہر ایک سے بے تعلقی کے جذبے سے معمور ہے۔ نتیجہ یہ کہ جن کرداروں میں مسرور، مطمئن اور فتمند زندگی کی خاطر سماج سے جنگ کرنے کا حوصلہ وہ پیدا کرتے ہیں، ان کی جنگ ایک فرد کی جنگ بن کر رہ جاتی ہے سماج کے خلاف۔

لیکن اس کے باوجود شا کے ناولوں نے جو کردار تراش کر نکالے ہیں وہ اوریجنل اور اچھوتے ہیں، ان میں ظلم کے خلاف بغاوت، قدامت کے خلاف جدت اور چھچھوری جذباتیت کے خلاف عقلیت کے اوصاف ملتے ہیں جو پڑھنے والے پر گہرا نقش چھوڑے بغیر نہیں رہتے۔

شاؔ کے دیباچے

"فن کاروں میں محبت" ناول کا ہیرو جیک جس انداز سے تراشا گیا ہے
وہ صاف بتا رہا ہے کہ میں جیک نہیں ہوں، جارج برنارڈ شا ہوں۔
شاؔ ــــ فن کار ــــ جس کے فن کے پیچھے ایک واضح مقصد ہے اور یہ مقصد ہے
جہاد۔ ظلم کے خلاف، پست اخلاقی کے خلاف اور فن برائے فن کے خلاف
جہاد۔

چنانچہ شاؔ کے ڈرامے صرف اپنے کرداروں کے ذریعے، اپنے مناظر
کے ذریعے اور اپنے مکالموں کے ذریعہ ہی اپنا مقصد بیان کرنے پر اکتفا نہیں
کرتے بلکہ شاؔ کے ذہن پر مقصد کی اہمیت اتنی طاری ہے کہ وہ ہر ڈرامے کا
ایک دیباچہ لکھتے ہیں کہیں کہیں یہ دیباچے اصل ڈراموں سے بھی بڑھ
جاتے ہیں۔ ایک بار ان کے ڈراموں پر طنز کرنے کے لیے ایک کارٹون بنایا
گیا تھا جس میں ہاتھی کی دُم ہاتھی سے کئی گنی بڑی تھی اور پیچھے کے بجائے
آگے کی طرف پھیلی ہوئی۔

شاؔ کے ڈراموں سے زیادہ ان کے دیباچوں کا حوالہ دیا جاتا ہے اور
ان کو شاؔ کے فلسفے، ان کے سیاسی نظریے اور ان کو سمجھنے کی بنیاد بنایا جاتا ہے۔
شاؔ کے نزدیک فن سے زیادہ فنی مقصد، ادب سے زیادہ سیاست، ہیئت
سے زیادہ موضوع اہم ہے اسی لیے وہ ڈرامے سے زیادہ دیباچے کو اہمیت دیتے

ہیں۔ اور ہر دیباچے میں وہ ڈرامے کے مقصد کے مختلف پہلوؤں سے بحث کرتے ہیں مثلاً :

"Widower's Honses" (رنڈووں کی بستی) کے دیباچے میں وہ لکھتے ہیں کہ اس ڈرامے کا مقصد یہ ہے کہ لندن میں جب آئندہ الکشن ہو تو لوگ اس تحریر سے متاثر ہو کر "ترقی پسند فریق کو ووٹ دیں" چنانچہ انہوں نے بتایا ہے کہ اس ڈرامے میں ٹرینچ، بلانچے، لِک چیز اور سارٹوریس وہ کردار ہیں جن کا وجود لوٹ کھسوٹ کے سماج میں اس طرح پلتا ہے جیسے مکھیاں گندگی اور غلاظت پر پلتی ہیں" وہ کہتے ہیں کہ جب تک سماج کی بناوٹ اس طرح رہیگی، دیانت دار ضمیر کی آواز دبتی رہیگی اور لوٹ کھسوٹ کرنے والے اس میں بےحس و حرکت اور مجبور پرزوں کی طرح اپنا کام کرتے رہینگے۔

اسی دیباچے میں انہوں نے خود اپنی کوشش پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ لوگ اسے پروپگنڈا پمفلٹ کہتے ہیں۔ ہاں اس ڈرامے کو میں پروپگنڈا مقصد کے لیے استعمال کرنے پر مجبور ہوں۔" اس سے یہ اچھا رہتا کہ میں "بارہ راتوں" کی طرح کا ایک حسین ڈرامہ لکھتا، یا کوئی اور شاندار ڈرامہ لکھ ڈالتا جیسے اور بہت سے شاہکار المیہ ڈرامے لکھے گئے ہیں لیکن صاف بات یہ ہے کہ مجھ سے یہ ہو نہیں سکتا تھا۔ موجودہ زمانہ جو تجارت پسندی (Commercialism) ہے وہ فن کے لیے بہت گرا ہوا اسکول ہے۔ یہ فنی تجارت پسندی تمام ڈاکہ زنی کی وارداتیں قتل و غارتگری، بدکاری و فحاشی کی تمام داستانیں بھر دینے کے باوجود ہم کو رحم اور وحشت کے اعلیٰ راستوں کی طرف حرکت نہیں دے سکتی۔ یہ طریق کار نفرت انگیز ہے

فضول اور احمقانہ ہے، ذلیل اور مضحکہ خیز ہے اور چاہے وہ کتنے ہی دعوے کرتا رہے لیکن نہ یہ کبھی انسانیت دوست، وسیع الخیال اور مفید ہو سکتا ہے نہ ہوگا۔ میرے پڑھنے والو! یہ میری غلطی نہیں ہے کہ میرا فن میرے ذوقِ حسن کا اظہار ہونے کے بجائے میری ذہنی اور اخلاقی گراوٹ کے ذوق کو پیش کرتا ہے، میری زندگی زیادہ تر بڑے بڑے شہروں میں بسر ہوئی۔ جہاں میرا ذوق حسن ہمیشہ تشنہ رہا ہے، اور میری ذہنی صلاحیتیں ایسے مسائل کی چوٹ کھا کھا کر کُند ہوتی رہیں جیسا کہ اس ڈرامے میں 'گندی بستی' کا مسئلہ ہے۔ یہاں تک کہ میں نہایت وحشت ناک طریقے سے اس بات کا عادی ہو گیا کہ ان گندگیوں سے کام لوں اور ایک فن کار کی حیثیت سے انھیں اپنے مضامین کا موضوع بناؤں"

چنانچہ اس ڈرامے میں جہاں شا نے لندن کے خوبصورت، مہذب اور آراستہ شہر کے ایک گندے کونے سے نقاب ہٹائی ہے ـــــ اور صرف نقاب ہٹانے کو اپنا مقصد قرار دیا ہے ـــــ موجودہ تجارتی و سرمایہ داری تہذیب کا گھناؤنا چہرہ نظر آتا ہے۔

محبت اور شادی کے مسئلہ پر "کنڈیڈا" ڈرامے سے زیادہ اس کا دیباچہ بحث کرتا ہے۔

"ناموزوں گرہ" ناول کے دیباچہ میں شا نے روپیہ اور افلاس کے سوال پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے "روپیہ ہی دنیا میں اصلی اور سب سے اہم طاقت ہے۔ تمام کامیاب اور مضبوط اخلاقیات کی بنیاد یہی ہونی چاہیے جو مبلّغ یا رہنما

اس حقیقت سے انکار کرتا ہے یا اس حقیقت کو دباتا ہے وہ زندگی کا دشمن ہو۔ جب تک سوشلزم قائم نہیں ہوتا جس میں سب لوگوں کی بنیادی ضرورتیں پوری ہو جائیں اس وقت تک "خالص مذہب" کی کوئی گفتگو نہیں ہو سکتی۔ اس وقت تک مذہب صرف پولس کے مددگار کے فرائض انجام دے گا"

"میجر باربرا" ڈرامہ اس کے دس سال بعد لکھا گیا۔ اس کا موضوع سخن بھی یہی ہے۔ چنانچہ روحوں کے نجات دینے والی بیٹی اور باپ کے درمیان گفتگو کو شا نے اپنے دیباچہ میں خاص اہمیت دی ہے اور بتایا ہے کہ لوگوں کو غربت پر قناعت کرنے کی تعلیم دینا اور انہیں آسمانی نجات کے خواب دکھانا دراصل موت اور تباہی کا دھندا کرنے والوں کے ہاتھ مضبوط کرتا ہے۔

لیکن کہیں کہیں شا کو اس مصیبت سے بھی گزرنا پڑا کہ اپنے دیباچوں میں اُنہوں نے جو مقصد بیان کیا تھا ڈرامے کا مجموعی اثر اس مقصد سے بالکل دور چلا گیا یا بالکل ہی فوت ہو گیا۔ "بشر اور مافوق البشر" (Man & Super man) کے دوسرے اڈیشن کے دیباچے میں انہیں شکایت ہے کہ جہنم کا جو منظر ہے اس کو اسٹیج سے الگ کر کے پورے ڈرامے کا رخ بدل دیا گیا اور اس کی روح فنا ہو گئی۔

شا نے بعض دیباچوں میں یہ بھی شکایت کی ہے کہ جن موقعوں پر جو اثر وہ حاضرین میں پیدا کرنا چاہتے ہیں بعض اوقات اس کے بالکل برعکس اثر پیدا ہوتا ہے اور ڈرامے مقصدی اعتبار سے ناکام ہو جاتے ہیں "Apple cart" (سیب گاڑی) کے دیباچے میں وہ لکھتے ہیں کہ

"جمہوریت اور شاہ پرستی کا جو تصور ہمارے خیال پرستوں کے دماغ میں بھرا ہوا ہے، میرا یہ ڈرامہ ان دونوں تصورات کی بے حقیقتی کا پردہ چاک کرتا ہے"
پھر انھوں نے اسی دیباچے میں ڈرامے کے پڑھنے والوں اور اسے اسٹیج پر دیکھنے والوں کی غلط فہمی دور کرنے کی کوشش کی ہے اور بتایا ہے کہ ڈرامے میں وزیروں کے مقابلے پر بادشاہ کی کامیابی سے کہیں یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ میں شاہ پرست ہو گیا ہوں۔ ڈرامہ اصل میں یہ نکتہ پیش کرتا ہے کہ

"جھگڑا جمہوریت اور شاہ پرستی کے درمیان نہیں ہے بلکہ اس جھگڑے میں ایک طرف تو شاہ اور جمہوریت ہیں، دوسری طرف بڑے بڑے طاقتور دولتمندوں کا طبقہ (Plutocracy) جس نے جمہوریت کا بہانہ کرکے اُدھر تو بزور بازو شاہی قوت واختیارات کا خاتمہ کر دیا اور ادھر جمہوریت کو خرید کر اسے نگل لیا"

وہ اسی پر بس نہیں کرتے بلکہ دیباچے کو مغربی طرز کی پارلیمنٹری جمہوریت کے خلاف ایک پمفلٹ بنا دیتے ہیں۔ اور اس میں اپنی وہ تقریریں، وہ گفتگوئیں اور وہ یادداشتیں بھی سُناتے ہیں جو اُنھوں نے وقتاً فوقتاً پارلیمنٹری جمہوریت کے خلاف لکھی یا سنائی ہیں۔

شا کے دیباچے اصل ڈراموں سے الگ ہونے کے باوجود اس سے اتنا گہرا سمبندھ رکھتے ہیں کہ ڈراموں کا مقصد اور مقصدی مسائل کو سمجھنے کے لیے ڈراموں کے ساتھ ان کا دیباچہ پڑھنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ جو بحث ڈرامے میں تمام نہیں ہوتی وہ دیباچے میں تمام کی جاتی ہے۔ اور اس طرح ڈرامے بقول

چسٹرٹن" اگر یہ دو طرفہ بحثیں ہیں تو دیباچے ان بحثوں پر قول فیصل۔

جن موضوعات پر ان دیباچوں میں بحث کی گئی ہے، ان موضوعات پر اکثر دیباچے ضخیم کتابوں سے زیادہ معلوماتی اور مفید ہیں۔

مثلاً "Back to methnselah" کے دیباچے میں موضوع بحث علم حیات (biology) ہے۔ اس دیباچے کے متعلق عہد حاضر کے بہت بڑے بائولوجسٹ پروفیسر جے ڈی برنال کا خیال ہے کہ اسے بائولوجی کے ہر ایک طالب علم کے نصاب میں داخل کر دینا چاہیے کیونکہ اس میں علم حیات کی ضخیم معلومات کا ہی ذخیرہ نہیں بلکہ آئندہ امکانات کی جھلکیاں بھی موجود ہیں۔

اسی طرح "ڈاکٹرس ڈلیما" کے دیباچے میں شا نے علم طب و جراحت کی کمزوریوں کو بے نقاب کرتے ہوئے ٹیکہ لگانے کی جو مخالفت کی ہے پروفیسر برنال کی رائے میں اتنی قیمتی رائے ہے کہ بعد میں طب و جراحت کے عالموں نے بھی اس سے اتفاق کیا اور مانا کہ ٹیکہ یا انجکشن ہر مرض کا واحد علاج نہیں ہے

شا کے دیباچے ان اعتراض کرنے والوں کے ہاتھ میں ایک کارآمد حربہ ہیں جو کہتے ہیں کہ شا ایک فن کار یا مصنف نہیں بلکہ ایک پمفلٹ باز ہے۔ اور یہ ایسا اعتراض ہے جس کا نشانہ تمام وہ ادیب اور فن کار رہے ہیں جنہوں نے کسی موہچے سے نظام سرمایہ داری کے خلاف جہاد کیا ہے۔ چاہے ان میں گورکی ہو، ایلیا اہرنبرگ ہو یا جارج برنارڈ شا۔ اور

ان میں کسی کو اپنی "پمفلٹ نگاری" پر شرم نہیں بلکہ اعتراف ہے، اور وہ
اس پر فخر کرتے ہیں۔

شا تنقید نگار

شا کے قلم نے تنقید کی انگلی پکڑ کر چلنا سیکھا۔ خود شا کے قول کے مطابق وہ بنیادی طور پر تنقید نگار تھے۔ ڈرامے پر تنقید لکھنے والوں کا ایک مجمع تھا، جہاں ان سے تقریر کرنے کے لیے کہا گیا ـــ وہ کھڑے ہوئے اور تقریر شروع کی ـــ "خواتین و حضرات! میں خود بھی ایک تنقید نگار رہوں ...."

ان کی پہلی تحریر جو شائع ہوئی وہ ایک تنقید ہے۔ ۳ اپریل ۱۸۷۵ء کو جب وہ ڈبلن میں ہی تھے انھوں نے ایک تنقید لکھی جو "پبلک اوپنین" میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد ۱۸۸۵ء میں "پال مال گزٹ" میں انھیں فنی تنقید نگار کے فرائض سپرد ہو گئے۔ ولیم آرچر نے بعد میں انھیں "ورلڈ" رسالے کے مخصوص تنقید نگار کی حیثیت سے ملازم کرا دیا اور اس کے بعد "ٹرتھ" (حقیقت) اور "Ouc Cornec" میں وہ فنی تنقید نگار کی حیثیت سے شامل ہو گئے۔ انھی ابتدائی چار پانچ برسوں میں شا نے بحیثیت تنقید نگار، خاصا مقام پیدا کر لیا تھا۔ اور چونکہ ان کی تنقیدوں کا اسٹائل بالکل انوکھا تھا اور ڈراموں پر تنقید کرتے وقت جو نکتے وہ پیش کرتے تھے وہ بالکل اچھوتے ہوتے تھے اس لیے شا بہت جلد لندن کے فن کار حلقوں سے روشناس ہو گئے۔

ان کے دوست مگر نظریاتی طور پر ان کے مخالف مسٹر چیسٹرٹن کا بیان

ہے کہ

"جب شا نے کام شروع کیا تو انھوں نے تین فنونِ لطیفہ کے راستوں سے اپنی راہ تلاش کی وہ فن کے نقاد تھے، ڈرامے کے نقاد تھے اور موسیقی کے نقاد تھے۔ اور ان تینوں میں وہ ..... نئے سے نئے اور انقلابی سے انقلابی انداز کے لیے جد و جہد کرتے رہے۔"

شا کے نزدیک کسی ایکشن اور کسی عمل کو جانچنے کا اصول یہ نہیں ہونا چاہیے کہ وہ کسی مقررہ آئیڈیل کے مطابق ہے یا نہیں، بلکہ یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ عام مسرت پر اثر انداز ہوتا ہے یا نہیں" اور اگر فن کے کسی نمونے سے انسانی مسرت و راحت حاصل ہوتی ہے تو وہ یقیناً بہتر نمونہ ہے۔

تنقید کرتے وقت شا کا رویہ خود ان کے ہی لفظوں میں یہ ہوتا ہے کہ:

"..... میں پڑھنے والوں کو ہوشیار کیے دیتا ہوں کہ آپ یہ (تنقید) جو پڑھنے والے ہیں، یہ کوئی غیر جانبدارانہ فیصلوں کا سلسلہ نہیں ہے .....

"میں نے ہر شخص کو، ہر مصنف کو، ہر ایکٹر کو، منیجر کو صرف ایک کسوٹی پر آزمایا ہے۔ اور کسوٹی یہ ہے کہ آیا وہ لوگ میرے راستے پر آتے ہیں یا پرانی روش میں ہی الجھے ہوئے ہیں .....

اصولی میرا طریق کار یہ ہے کہ میں اپنا ایک معیار رکھتا ہوں کہ ڈرامہ کیا ہونا چاہیے، اور اسے کس طرح پیش کیا جانا چاہیے اور اس کے

بعد اپنے فن سے کام لے کر دیکھتا ہوں کہ کون شخص کہاں کہاں
اس معیار سے ہٹ گیا ہے، کس نے کہاں ٹھوکر کھائی ہے
اور کس نے اس معیار کو قبول کرنے سے کس جگہ انکار کیا ہے۔
بس یہی غلطیاں مجھے مضحکہ خیز اور قدامت پسندانہ نظر آتی ہیں"
جب شا نے فنی تنقید لکھنی شروع کی تو اس وقت تنقید نگاری کا ڈھچر
یہ نہیں تھا۔ تنقیدیں بھی فن کی طرح انفعالی اور داخلی (Subjective)
ہوا کرتی تھیں۔ شا کے ایک ہمعصر فلسفی کے بقول تنقید نگار کا فرض یہی تھا کہ وہ پہلے
خود کو مصنف کی پوزیشن میں رکھے۔ اس کی آنکھوں سے دیکھے اور اسی کے دل و
دماغ کو اپنا دل و دماغ سمجھے" اور پھر دیکھے کہ مصنف کے ہاں کس جگہ کیا کمی
رہ گئی اور کیا خوبی پیدا ہوئی۔ شا نے تنقید کے اس انداز کو قطعی قدامت پسندانہ
قرار دیا۔ اور اپنا انداز خارجی (Objective) رکھا۔ وہ مصنف کے معیار
سے نہیں، اپنے معیار سے جانچتے ہیں اور اپنے دل و دماغ کے جانچے پرکھے
اصولوں کو فن کی کسوٹی قرار دیتے ہیں۔

تنقید کا یہ رویہ بہر حال تنقید کے معاملے میں ایک انقلابی قدم تھا۔
اور اسی انقلابی اقدام نے اس عہد کی فنی و ادبی دنیا میں ہنگامہ برپا کر دیا۔
ہنگامہ برپا ہونے میں شا کے انداز بیان اور طرز تنقید کو جتنا دخل تھا
اتنا ہی اس کا دوسرا سبب بھی تھا کہ شا نے اپنی تنقید کے لیے شکسپیر کے
فن کو چن لیا تھا جو تین سو سال گزر جانے کے بعد انگریزی زبان و ادب کا دیوتا
بن چکا تھا اور قدامت پرست فضا اس کے خلاف ایک انگلی بھی --- اور وہ

بھی ایک آرٹسٹ کی انگلی ـــــ اٹھتے نہیں دیکھ سکتی تھی

شا کی جدت پرست انقلابی فطرت اور مہم پسند ذہانت کب گوارا کر سکتی تھی کہ وہ چھوٹے موٹے بتوں کے ناک کان توڑتے رہیں اور سب سے بڑے دیوتا کو سلامت چھوڑ دیں۔ چنانچہ انہوں نے شکسپیر پر وار کیا اور یہ وار بھرپور پڑا۔

غالبؔ نے قتیل کی تنقید لکھ کر اتنی مصیبت مول نہیں لی تھی جو شا کو شکسپیر کی تنقید سے سہنی پڑی۔ انگریزی ادب کے تمام نقاد شا پر ٹوٹ پڑے اور انہوں نے شکسپیر کے مقابلے میں شا کو ڈھنڈورچی کہنا شروع کر دیا۔

شکسپیر پر شا کی تنقید کے پیچھے یہ شعوری کوشش ضرور تھی کہ شکسپیر کو ہر عیب سے بری سمجھنے کی جو ایک ادبی روایت بن چکی ہے، یہ روایت ان کی روایت دشمنی کے حملے سے کہیں بچ نہ جائے۔ اور اس کوشش کے ساتھ انہوں نے یہ تنقیدی اصول (غالباً ادب کی دنیا میں پہلی بار) وضع کیا کہ فن کا موضوع (Content) ہر زمانے میں یکے بعد دیگرے بدلتا رہتا ہے لیکن اس کی ہیئت (form) باقی رہتی ہے، اسی اصول کے پیشِ نظر انہوں نے شکسپیر کے متعلق یہ نتیجہ نکالا کہ شکسپیر کے خیالات، اس کے کرداروں کا مقصد حیات اور اس کے ڈراموں کی روح مردہ اور بے معنی ہو چکی ہے، البتہ اس کی زبان، انداز بیان اور شکسپیر کی "لفظی موسیقی" آج بھی زندہ اور جاندار ہے۔ شا نے شکسپیر پر ایک جگہ ہیں اس طرح تنقید کی کہ "صرف ماہرین موسیقی کو ہی شکسپیر پر تنقید کی اجازت ہونی چاہیے" ـــ اور

ظاہر ہے کہ شا خود کو ماہر موسیقی سمجھتے ہیں۔

شکسپیر پر تنقید کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ شکسپیر کو ان کرداروں سے جانچنا چاہیے جن میں اس نے اپنی روح ڈالی ہے۔ اور ایسے کردار مجہول قسم کے کردار ہیں۔ اس کے ہیرو کا عمل زیادہ تر تجارتی مقصد اپنی نگاہ میں لیے ہوئے ہوتا ہے۔ شکسپیر کے متعلق ان کی رائے ہے کہ اس کے ڈرامے فن کا ادنیٰ نمونہ ہیں، کیونکہ (۱) جو فضا ان میں پیش کی جاتی ہے وہ رومانوی ہوتی ہے اور اسے حقیقت سے بہت کم لگاؤ ہوتا ہے۔ جو خیالات ان ڈراموں میں پیش کیے جاتے ہیں وہ رسمی اور قدامت پسندانہ ہوتے ہیں اور جو مزاج اُبھرتا ہے وہ قنوطیت پسند اور حسرت و یاس کا مارا ہوتا ہے۔

چنانچہ شکسپیر کے ایک شاہکار "مرچنٹ آف وینس" کے متعلق ان کی رائے ہے کہ وہ بالکل بچکانہ حرکتوں سے بھرا ہوا ہے۔ شا کے خیال میں فنی لحاظ سے ٹریجیڈی (المیہ) کے مقابلے میں کامیڈی (طربیہ) کمتر اور گھٹیا چیز ہے۔ اور شکسپیر کے یہاں یہی زیادہ ہے۔

شکسپیر پر تنقیدیں لکھ کر شا اپنا خم ٹھونکتے ہیں۔

"جب میں نے لکھنا شروع کیا تو شکسپیر ایک الوہی اور آسمانی وجود تھا اور بار گزرتا تھا۔ لیکن اب وہ ہماری جیسی ایک عام مخلوق ہے"!

دوسرا بڑا دیو جو شا کی تنقیدی زد میں آیا اُنیسویں صدی کا سب سے بڑا ڈرامہ نگار ابسن (Ibsen) ہے لیکن ابسن ان کے نزدیک محبوب ہے۔

وہ اسے اپنا پیشرو سمجھتے ہیں۔ کیونکہ ابسن بھی مقصدی ڈرامے لکھنے کا قائل ہے
ابسن بھی دستور پسندی اور رسم پرستی کا دشمن ہے۔ اس کی نگاہ بھی فرد کے
جذبات سے گزر کر سماج کے ڈھانچے پر پڑتی ہے اور وہیں سے اپنے ڈراموں
کی روح لاتی ہے۔ شا کے نزدیک ابسن میں تین بڑی خوبیاں ہیں۔ ایک تو
اس نے پہلی بار "سنجیدہ" ڈرامے لکھے، فرضی اور رومانوی ہنگاموں کی جگہ
اصلی اور حقیقی حادثات دکھلائے اور فنی انداز سے ایک اچھوتا پن قائم رکھا۔
"Quintessence of Ibsonism" (ابسن ازم کی تنقیحات) میں
شا نے ابسن کو نظریاتی سطح پر جہاں بہت سراہا ہے وہاں اس کے فنی مقام کی کمزوریاں
بھی دکھائی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ خود ابسن کے حامیوں نے شا کی تنقیدوں پر
سخت حملے کیے۔

شا کے متعلق عام طور پر مشہور رہی کہ وہ خود کو شکسپیر سے بڑا ڈرامہ نگار کہتے
ہیں لیکن خود شا نے اپنی کسی تحریر میں اس قسم کا دعویٰ نہیں کیا، بلکہ انہوں نے
اس دعوے کی تردید کی۔ البتہ وہ ابسن کو اپنی تنقیدوں کے ذریعہ شکسپیر سے بہتر
ڈرامہ نگار قرار دیتے ہیں۔

شا حقیقت پسند ظرافت نگار

شا خیال پرستی کے مقابلہ میں حقیقت پسند ہیں۔ اپنے فن میں، اپنی تنقیدوں میں، اور اپنی تقریروں میں انھوں نے بار بار اسی پر زور دیا ہے کہ فن کی بنیاد خیال نہیں بلکہ حقیقت کو ہونا چاہیے۔ موسیقی میں Wagner کو اور ڈرامے میں Ibsen کو پسند کرنے کی بنیاد بھی یہی ہے کہ یہ لوگ اپنے فن میں خیال پرستوں کے خلاف اور حقیقت پسندی کے حامی ہیں۔

شا کا دعویٰ ہے کہ وہ جو کردار تراشتے ہیں وہ محض ان کے خیال کی پیداوار نہیں ہوتے بلکہ خارج کی دنیا میں ان کے چلتے پھرتے نقشے موجود ہیں "Widower's House" میں سارٹوریس کے متعلق ان کا کہنا ہے کہ ڈرامہ دیکھنے والے حاضرین میں ہر شخص سارٹوریس کو پہچان سکتا ہے اسی طرح ڈاکٹر ہیری ٹرنچ کا وجود قدم قدم پر ملتا ہے۔ حاضرین محسوس کرتے ہیں کہ ان میں سے کتنے ہی لوگ ڈاکٹر ہیری ٹرنچ ہیں۔

کئی بار تنقید نگاروں نے شکایت کی کہ ان کے ایک شاہکار ڈرامے "ہتھیار اور انسان" جو بزدل سپاہی کی تصویر پیش کی گئی ہے وہ حقیقت کے خلاف ہے۔ فوجی سپاہی اتنے بزدل نہیں ہوتے ہیں جتنے شا نے پیش کیے ہیں، تو شا نے اس کے لیے فنی ضرورت کا سہارا نہیں لیا بلکہ اپنے دعوے پر قائم رہے اور فوجی سوانح سے مثالیں چن چن کر پیش کیں جن سے

یہ ثابت ہوتا تھا کہ ایسے بزدلوں کا وجود فوجوں میں جا بجا ملتا ہے۔ اسی طرح "سینٹ جون" میں جون آف یارک کا جو نقشہ برنارڈ شا نے پیش کیا ہے اس کے متعلق انہیں یقین ہے کہ تنہا ان کے قلم نے جون آف یارک کی صحیح تاریخی تصویر دکھائی ہے، ورنہ دوسرے ڈرامہ نگاروں میں سے کسی نے اس کو ایک حسینہ کا روپ دے دیا ہے، کسی نے اسے ضرورت سے زیادہ نرم اور خدا پرست بنا دیا ہے۔

اپنے ہم وطن اور اس عہد کے سب سے بڑے ظرافت نگار افسانہ نویس اوسکر وائلڈ کو شا اسی لیے پسند نہیں کرتے کہ اوسکر کی کامیڈی ایک Farce یا خیالی ڈھانچہ ہوتی ہے جسے حقیقی زندگی کی بنیاد پر تعمیر نہیں کیا جاتا۔

لیکن حقیقت پسندی کے اس گہرے یقین اور دعوے کے باوجود شا کا سنجیدہ اور بے مروت دماغ کسی صورت بھی قہقہوں سے بے نیاز نہیں ہونے پاتا۔ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ ظرافت اور سنجیدگی دو متوازی لائنیں ہیں جو ایک دوسرے سے ملنے نہیں پاتیں۔ شا کے یہاں معاملہ برعکس ہے ان کے یہاں یہ دونوں تار فن کے تانے بانے تیار کرتے ہیں۔ وہ انتہائی کشمکش اور سخت ترین سنکٹ کے لمحے میں ناگہانی قہقہہ لگا دیتے ہیں اور لوگ منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ بلکہ سچ پوچھیے تو ان کی رگ ظرافت پھڑکتی ہی اس وقت ہے جب کشمکش اپنے عروج پر پہنچ چکی ہو اور فضا پر گمبھیر تناؤ چھایا ہوا ہو۔ ایسے نازک لمحے میں شا اپنے قہقہے کو ضبط نہیں کر سکتے۔

تالستائی نے ایک بار شا کے متعلق لکھا کہ وہ زندگی کو مذاق سمجھتے ہیں، شا نے فوراً جواب دیا — ہاں زندگی مذاق تو ہے ہی مگر میں اس مذاق کو خوشگوار اور اچھا مذاق بنانا چاہتا ہوں۔

شا کی ظرافت نے اس سوال کو اور اہم بنا دیا ہے کہ آیا ان کے ہاں Wit (بامعنی چھیڑ چھاڑ اور جملہ بازی) ہے یا Humour (مذاق اور محض ظرافت)۔ عام طور پر شا کو ظریف نہیں بلکہ کچوکے دینے والا ادیب (Witty) سمجھا جاتا ہے۔ اور ان دونوں میں فرق ہے۔

کچوکے دینا اور مذاق کرنا، ادب کے دو شعبے ہیں۔ اور ان میں اس طرح امتیاز کیا گیا ہے کہ الفاظ، محاورات، تراکیب، خیالات اور مختلف نظریوں میں جو تضاد ہوتا ہے، ان میں جو بے جوڑ پن ہوتا ہے اس سے کچوکے Wits پیدا کیے جاتے ہیں اور مختلف جذبات اور کرداروں کی بے تکی حرکتوں اور مختلف حرکتوں کے بے تکے پن سے مذاق و ظرافت کا خمیر تیار ہوتا ہے جی کے چسٹرٹن نے اس فرق کو صرف دو جملوں میں مختصر کرنے کی کوشش کی ہے "وہ شخص جو مختلف چیزوں میں ایک تسلسل اور لگاؤ دیکھتا ہے — وہ Wit ہے (اور کچوکے دیتا ہے) لیکن جو شخص مختلف چیزوں میں کوئی تسلسل کوئی مناسبت نہیں پاتا وہ ظریف ہے.... شا کی چھیڑ چھاڑ، اس کے کچوکے کبھی اس کی کمزوری نہیں ہوتے۔ چنانچہ ان میں محض ظرافت اور ہنسی مذاق کا مفہوم نہیں ہوتا۔ کیونکہ چھیڑ چھاڑ اور جملہ کسنے کا تعلق ہمیشہ اس خیال سے ہوتا ہے کہ حقیقت بالکل سامنے

ہے اور بالکل واضح۔ جبکہ ظرافت اور مذاق کی بنیاد ہمیشہ یہ خیال ہوا کرتا ہے کہ حقیقت بہت ہی پھسلواں اور مبہم چیز ہے اور اس کے بارے میں غلط فہمی کا امکان ہمیشہ رہتا ہے .....''

چنانچہ وہ شا کے بارے میں فیصلہ کرتے ہیں کہ ''وہ ظریف نہیں ہے۔ بلکہ بہت اعلیٰ درجے کا جملہ کسنے والا اور پھبتی دینے والا (Wit) انسان ہے''

شا سے کسی جرنلسٹ نے سوال کیا کہ مذاق کے بارے میں ان کی کیا رائے ہے؟ انھوں نے جواب یہ لکھا کہ ''مذاق ہر وہ بات ہے جس سے آدمی ہنس پڑے لیکن بہترین مذاق وہ ہے جو قہقہے کے ساتھ آنکھوں میں آنسو بھی لے آئے۔

شا کے مزاج میں اور ان کی تحریر میں مسکراہٹیں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہیں لیکن یہ واقعہ ہے کہ وہ ارادۃً اپنے قہقہوں کے ساتھ آنسو کا جوڑ لانا چاہتے ہیں اور فنی کاوشوں کو عبرت انگیز قہقہوں سے معمور رکھنا چاہتے ہیں۔

شا کو اس سے انکار ہے کہ وہ طنز نگار یا ظریف ہیں۔ لیکن ان کے فن سے طنز کی لہریں اٹھتی ہیں اور ان کے انداز بیان میں ظرافت کی رچی ہوئی چاشنی موجود ہے۔

ایک جملہ بازی تو محض جملہ بازی کے لیے ہوتی ہے جس سے صرف لطف لینا مقصود ہوتا ہے، پروفیسر جوڈ کے خیال میں انگلینڈ کی بحالی (Restoration perica) کے زمانے میں ظرافت اور پھبتی دینے کا رجحان محض لطف لینے اور جملہ بازی کرنے کے لیے وقف ہو گیا تھا۔ اور یہ اس وقت ہوتا ہے جب خیال میں گہرائی نہ ہو۔ کوئی اچھوتا خیال پیش کرنے

کے لیے نہ ہو تو تحریر میں لذت پیدا کرنے کی خاطر جملہ بازی اور لفظی ہیر پھیر سے کام لیا جاتا ہے لیکن شاؔ کے ہاں مزاح اور جملہ بازی صرف ہیر پھیر کے لیے نہیں بلکہ ایک مقصد کے لیے ہوتی ہے۔ وہ مذاق کے لیے مذاق نہیں کرتے بلکہ کوئی کارآمد بات کہنے کے لیے چھیڑ چھاڑ کرتے ہیں۔

شادی، محبت، مذہب، سوسائٹی، نظام سرمایہ داری، روایات ادبی قدامت پسندی، غرض ہر قدیم ادارے کے خلاف شاؔ کے پاس ایک بغاوت ہے، غصّہ ہے، بیزاری ہے اور یہ بیزاری ان کے جملوں سے پھوٹ پڑنے کے لیے قدم قدم پر بیتاب رہتی ہے۔ چنانچہ وہ خود بخود شاؔ کے یہاں Wit اور نوکیلے جملے پیدا کرتی چلی جاتی ہے۔

مثال کے طور پر ان کے ڈرامے "بشر اور فوق البشر" میں جاؔن ٹینر کی گفتگو کے کافی حصّے زہر میں بجھے ہوئے تیروں کی طرح ایک چابک دست کمان انداز کی چٹکی سے چھوٹتے رہتے ہیں۔ "وہ شخص جو کر سکتا ہے کام کرتا ہے — جو کر نہیں سکتا وہ تعلیم دیا کرتا ہے" بظاہر یہ جملہ صرف لفظی ہیر پھیر معلوم ہوتا ہے لیکن اس ایک نوکیلے جملے کے پیچھے کتنی بڑی حقیقت پوشیدہ ہے۔ یا مثلاً "گھر — لڑکی کا قید خانہ اور عورت کا کارخانہ ہے" یہاں "قید خانے" اور "کارخانے" کے الفاظ سے عبارت کی چاشنی مقصود نہیں بلکہ "شریف گھرانوں" کی گھریلو زندگی کے جبر اور اندرونی گھٹن کو صرف ایک جملے میں پیش کرنے کی ایک بے پناہ فن کاری ہے۔

شاؔ اپنے کرداروں سے مزاح پیدا کرنے کے بجائے ان کی گفتگو سے

کام کی باتیں نکالتے ہیں۔ ان کے خاص خاص کردار عموماً نہایت تیز اور حاضر جواب اور بلا کے ذہین لوگ ہوتے ہیں اور ان کی زبان سے مسکت جواب کہلوانا شا کے لیے آسان ہو جاتا ہے۔ بلکہ یوں سمجھنا چاہیے کہ شا کی ذہانت، ان کی حاضر جوابی اور ان کی زہر خند پسند طبیعت ایسے کردار تراش کر رکھتی ہے جن کی زبان سے وہ اپنی بات کہہ سکے اور یہ باتیں۔۔۔ صرف باتیں نہیں ہوتیں بلکہ wit اور معنی خیز جملہ بازی ہوتی ہے۔

"میجر باربرا" میں انڈریو انڈرشفٹ کا کردار۔ ایک تو خود اس نام میں ہی چھیڑ کا پہلو موجود ہے۔ انڈریو کے لفظ میں مذہبی تقدس کی روایت پوشیدہ ہے، اور شا نے اس روایت پر حملہ کرنے کے لیے یہ نام چنا ہوگا۔ اور پھر انڈرشفٹ کے برجستہ جملے، اس کے خاموش کرنے والے جوابات ایسے ہیں جو اپنے خالق (برنارڈ شا) کی حاضر جواب اور کاٹ کرنے والی ذہانت کا آلۂ کار ہیں۔

شا کی ظرافت میں مضحکہ خیزی اور ہیومر یوں بھی نہیں ہے کہ ان کے ڈراموں میں کرداروں کی حرکات و سکنات، کو دپھاند اور حادثات کو زیادہ دخل نہیں ہوتا۔ بلکہ مکالموں کے ذریعے ڈرامے کی عمارت چنی جاتی ہے۔ چنانچہ ان کے ہاں wit زیادہ ہے جو خالص ذہنی اور دماغی جولانگاہ ہوتا ہے۔

لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ شا کے یہاں ظرافت کا پہلو محض جملہ بازی اور چرکے دینے تک محدود نہیں ہے۔ وہ اس

سے آگے بھی چلتے ہیں، جیسا کہ ان کے ایک ناقد نے کہا ہے ۔ شا کے اکثر ڈراموں میں اگرچہ سطح پر نوکیلے جملے (wit) نظر آتے ہیں لیکن ان کی تہ میں مزاح ہوتا ہے ۔ یہ اور بات ہے کہ یہ مزاح زندگی کے مختلف حقائق میں بے جوڑپن دکھانے کے لیے پیش کیا جاتا ہے ۔ وہ اس طرح قہقہہ لگاتے ہیں جیسے کوئی شخص کسی بھلے آدمی کو سر کے بل چلتے دیکھ کر بے اختیار ہنس پڑے ۔

ایک کردار کی وہ تعمیر کرتے ہیں، اسے آہستہ آہستہ ایک ہی لائن پر آگے بڑھاتے ہیں اور ناگہانی اس کی راہ بدل دیتے ہیں ۔ مثال کے طور پر "میجر باربرا" میں یونانی ادب کے پروفیسر کا کردار ۔ انڈرشفٹ سے اس کی گفتگو میں جملہ بازی ہے، بامعنی چھیڑ چھاڑ ہے، لیکن جب وہ پروفیسر ایک دم انڈرشفٹ کے سامنے گھٹنے ٹیکتا ہے اور اپنی ناجائز ولادت کا ثبوت پیش کرتا ہے تو اس تضاد پر مزاح کا سیلاب پھوٹ نکلتا ہے ۔ شا کا مقصد اگرچہ یہاں حاضرین یا ناظرین کو ہنسانا نہیں ہے لیکن اس کے باوجود انھوں نے اپنے اس کردار کو سر کے بل کھڑا کرکے قہقہوں کا انبار لگا دیا ہے ۔

سیاست اور علم طب کے ماحول سے شا نے مزاح کا سب سے زیادہ مسالہ حاصل کیا ہے، مڈیکل سائنس سے انھیں للّٰہی بیر معلوم ہوتا ہے چنانچہ وہاں وہ صرف نوکیلے جملوں پر اور ذہنی کچوکوں پر بس نہیں کرتے بلکہ ایسی صورت حال پیدا کرتے ہیں جہاں بے اختیار قہقہے لگانے کو جی چاہتا ہے ۔ مثلاً ان کے ڈرامے "Doctor's dilemma" میں ڈاکٹر مارامو

کی مایوسی، جب اسے یہ معلوم ہوا کہ جس مہلک اور خوفناک مرض کی لاجواب دوا تحقیق کی تھی، وہ مرض وجود ہی نہیں رکھتا تو انسانیت کی فلاح پر خوش ہونے کے بجائے وہ غم سے بیٹھ جاتا ہے — "ہائے کیسی دردناک خبر ہے کس قدر خوفناک خبر ہے ..... میری ساری عمر کی کمائی لٹ گئی۔ یا ایسا ہی دوسرا ماحول ہے جہاں مریض کے سرہانے ڈاکٹروں کی کانفرنس ہو رہی ہے۔ ہر ایک ڈاکٹر نیا مرض اور اس کی الگ دوا تجویز کرتا ہے۔ اور ایک دوا دوسری دوا کے خلاف جاتی ہے۔ فیصلہ دشوار ہو گیا ہے۔ یا تو سب کے سب ڈاکٹر بکواس کر رہے ہیں یا سب کے سب صحیح ہیں — اور دونوں حالتوں میں مریض کا بچنا ناممکن۔

اس طرح شا کے یہاں مزاح اور نوکیلے جملے صرف عبارت کی چاشنی کے لیے نہیں بلکہ ان کی تبلیغ کے لیے ایک حربہ ہیں — تیز اور دھاردار حربہ۔

شا فلسفی

شا سے کسی نے کہا کہ امریکہ میں آپ کی مقبولیت بہت زیادہ ہے اُنھوں نے فوراً سوال کیا — کس قسم کی مقبولیت ؟ میں ناول نگار ہوں ماہر عمرانیات ہوں، نقاد ہوں، مدبر ہوں، ڈرامہ نگار ہوں، فقہی انسان ہوں اور فلسفی ہوں۔ اس لیے میری مقبولیت کی سات قسمیں ہیں"

گویا برنارڈ شا خود کو ایک فلسفی بھی شمار کرتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو فلسفی اس معنی میں سمجھتے ہیں کہ فلسفے کے جو اسکول ان کے عہد میں قائم تھے۔ شا نے ان میں سے کسی ایک کو بھی جوں کا توں نہیں اپنایا۔ بلکہ ہر ایک فلسفہ سے اُلجھے اور اس سے ہو کر اپنا ایک راستہ بنانے کی کوشش کی۔

شا کی یہ ایک ایسی حیثیت ہے جسے سب سے کم سراہا گیا۔ فلسفے کے ہر پہلو سے زندگی بھر اُلجھے رہنے کے بعد بھی وہ بحیثیت فلسفی اپنا کوئی مقام پیدا نہ کر سکے۔ اور انھیں کسی فلسفے کا پیش رو نہیں سمجھا گیا۔ فرینک ہاریس کے بقول:

"سموئیل بٹلر اور برگسان جیسے فلسفیوں نے "تخلیقی ارتقاء" (Creative Evolution) کا جو نظریہ رکھا تھا، اسی کو برنارڈ شا نے ایسی ادبی اور تھیٹریکل آتشبازی کے ذریعہ چمکا دیا کہ جو لوگ اس کے متعلق کافی

علم نہیں رکھتے، ان کے نزدیک برنارڈ شاہی "تخلیقی ارتقاء" کے موجد سمجھے جا سکتے ہیں"۔

برنارڈ شا بحیثیت فلسفی کے اپنے آپ کو فلسفے کی دنیا سے نہ منوا سکے، اس کی کئی وجہیں ہیں، ایک تو یہی کہ شا کی اور کئی حیثیتیں ایسی تھیں جن کے ہوتے ہوئے عام طور پر سمجھا گیا کہ وہ فلسفے کو اتنا وقت اور اتنی محویت نہیں دے سکنے جو فلسفے کا تقاضا ہے۔ دوسرے یہ کہ انہوں نے جس فلسفیانہ نتیجے پر زور دیا، وہ ان سے پہلے اور خود ان کے عہد میں مختلف صورتوں سے فلسفیانہ حلقوں کے سامنے آچکا تھا۔ "تخلیقی ارتقاء" کا نظریہ ان کے ہمعصر برگساں نے پیش کیا، الگزینڈر نے پیش کیا، ان سے پہلے لیمارک نے پیش کیا۔ اور یہ فلسفی اپنے اس فلسفے کی بنیاد مابعد الطبعیات (Meta Physics) کو قرار دیتے تھے، ان کے نتائج بھی شا کے نتائج سے مختلف تھے۔ پھر شا نے اس سے بھی رخ موڑا اور جن لوگوں کی نظریں ان کے فلسفے پر تھیں، وہ شا کی ہر لحظہ تبدیلی سے مایوس ہو گئے۔ اور سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ شا کا فلسفہ خود اپنے تضاد کو نہیں سلجھا سکتا تھا، اور نہ اپنے عملی نتائج کا کوئی حل پیش کر سکتا تھا۔ ایک طرف تو وہ "مابعد الطبعیات" سے اس حد تک انکار کرتے ہیں کہ خود کو کبھی بنیادی طور پر اکانومسٹ (معاشیات پسند) کہتے ہیں اور کبھی "Biologist" (علم حیات کا ماہر) ـــــ لیکن جب علم حیات کی بنیاد پر وہ انسان کی رفتہ رفتہ ترقی کا نظریہ پیش کرتے ہیں تو بعض اہم کڑیوں کو ـــ روحانیت پرستوں کی طرح یہ کہہ کر چھوڑ دیتے

ہیں کہ "ان کے بارے میں کوئی حقیقت بیان نہیں کی جاسکتی" نتیجہ یہ کہ نہ روحانیت پرست انہیں لازمی طور پر مابعد الطبیعیاتی فلسفی مانتے ہیں اور نہ مادیت پرست انہیں طبیعیات کا فلسفی۔ اور اس طرح شا اپنے فلسفے "تخلیقی ارتقا" کو گورکھ دھندا بنا کر رکھ دیتے ہیں اور خود اس گورکھ دھندے میں اس طرح اُلجھ جاتے ہیں کہ خود اپنے ہیرو کی زبان سے کہتے ہیں:

("Too true to be good")

میں عمر اور نوعمری کے درمیان کھڑا ہوں، اس شخص کی طرح جس کی گاڑی نکل گئی ہو... پچھلی گاڑی پر دیر سے پہنچا اور آنے والی گاڑی کے لیے بہت پہلے آگیا۔ میری فطرت میں اور میری قسمت میں مبلّغ ہونا بدا ہے۔ میں نئی کتاب اور نئی تعلیمات لے کر آیا ہوں، لیکن میرے پاس کوئی بائبل نہیں ہے، کوئی مسلک نہیں ہے......

میں بے خبر ہوں، میری روح کھوئی گئی، اور میں خوف زدہ ہو گیا۔ صرف اتنا جانتا ہوں کہ مجھے زندگی کی راہ تلاش کرنی چاہیے۔ اپنے لیے اور ہم سب کے لیے، ورنہ ہم سب بالکل تباہ ہو کر رہ جائینگے، پھر بھی قدرت سے جو صلاحیت مجھے عطا ہوئی ہے وہ ابھی مجھ پر حاوی ہے، مجھے تبلیغ کرتے رہنا چاہیے تبلیغ، تلقین، تلقین۔ کوئی پروا نہیں۔ خواہ کتنی ہی دیر ہو چکی ہو، خواہ دن کتنا ہی مختصر کیوں نہ ہو--- اور چاہے مجھے

کچھ بھی نہ کہنا ہو .....‘‘

یہ آخری جملہ کہاں تک صحیح ہے، شا کے فلسفے کی بنیادی کڑیاں دیکھنے کے بعد فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔

ان کی ابتدا، پیورٹن گھرانے، پیورٹن ماحول اور پیورٹن تعلیم سے ہوئی تھی۔ خود شا کے لفظوں میں پیورٹن نظریہ اپنے اور خدا کے درمیان کسی اور کو حائل نہیں دیکھنا چاہتا۔ وہ خدا کو جسم اور جسمانیات، رسوم و عبادات، مکان اور مکانیات سے بالکل پاک سمجھتا ہے۔ ان کے خیال میں ’’جسمانی حُسن ایک دھوکا ہے، اور وہ ہمارے حواس کے لیے ایک ایسی فرضی علامت ہے جو خیال محض کے اور اس ذات کے درمیان، جس کی خیال محض سے پوجا کی جاتی ہے، حائل ہو جاتا ہے۔ انسانی دماغ کو ہر لمحے ایسی آگ سے تپتے رہنا چاہیے جو تمام رسمی بتوں کو پھونک کر اتنا لطیف بنا دے کہ وہ محض شیشے کی طرح ہو کر رہ جائیں‘‘ (اور دماغ اور خالق کے درمیان حائل نہ ہوں)

’’پیورٹن تصور یہ ہے کہ خدا کی عبادت اس کے براہ راست تصور سے ہی ہو سکتی ہے۔ صرف اپنے دماغ سے ہی اس کی عبادت کیجیے۔ یہ بیہودہ حرکت ہے کہ اس کی عبادت میں خاص قسم کی جذباتیت کو، جسمانی حرکات و عادات کو، یا اشاروں کو، یا خوبصورتی کی فطری تحریک کو شامل کر لیا جائے۔ چنانچہ یہ بھی غلط ہے کہ رقص کے ذریعے یا موسیقی کے ذریعے مقدس

شرابیں پی کر، خوبصورت آراستہ گرجے بنا کر اس کی عبادت کی جائے
یا اس طرح کہ آنکھیں نیند سے بند ہوئی جا رہی ہیں اور لبوں سے
عبادت کے الفاظ جاری ہیں" (چسٹرٹن)

اس طرح پیورٹن تصور نے رسمی عبادت اور رسمی حرکات کے خلاف بغاوت کے پہلے جراثیم شا کو ودیعت کر دیے تھے۔ یہ بغاوت انگلینڈ کے سرمایہ دارانہ نظام میں سماج کی لوٹ کھسوٹ اور جبر و ظلم دیکھ کر اور پختہ ہوئی اور اس نے شا کو رسمی خدا کے وجود سے انکار کی منزل تک پہنچا دیا۔ اب وہ Rationalist ہو گئے۔ ہر مسئلے کو عقل کی کسوٹی پر جانچ پرکھ کر فیصلہ کیا جائے۔ اس منزل پر انہوں نے Reason اور استدلال کو ایک ایسی قوت قرار دیا جو سچائی کو فوراً تلاش کر لیتی ہے۔ ان کے نزدیک سچائی کا تصور یہ ہے کہ وہ واضح ہے، صاف ہے، بالکل سامنے کی چیز ہے اور قابل بیان ہے۔ اس منزل پر جان مِل اور بنتھم کا بنیادی نظریہ شا پر طاری ہے۔ وہ بھی سمجھتے ہیں کہ حقیقت، اتنی واضح اور کارگر چیز کا نام ہے کہ جب آپ اسے محسوس کر لیں تو دوسروں تک ویسے کا ویسا ہی پہنچا سکتے ہیں۔ اور اس طرح ہر شخص اس بات کو مانتا چلا جائیگا جو عقل و استدلال کی کسوٹی پر پوری اترے۔ چنانچہ سماج اور فرد کی ترقی ہوتی چلی جائیگی۔ اور یہ ترقی صرف معقولیت اور استدلال (Rationalism اور Reason) کی بنیاد پر ہو سکتی ہے۔

استدلال کا فلسفہ اختیار کرنے کے بعد شا پر شوپنہار (Shaupenhauer

اِبسن (Ibsen) اور نطشے (Nielzehe) کا اثر پڑا۔ شوپنہار کے ہاں انہیں فلسفے کے دو مرکزی خیال ملے۔ ایک یہ کہ زندگی کی محرک قوت عقل و استدلال نہیں ہے بلکہ قوتِ ارادی (یا خودی) ہے اور دوسرے یہ کہ زندگی قطعی طور پر ناکام ہے، اس درجہ ناکام کہ جینے کے قابل نہیں۔ نطشے کے یہاں بھی انہیں یہی عقل و استدلال کا توڑ ــــ قوتِ ارادی (Will) نظر آئی۔ چنانچہ شا نے نطشے کی طرح شوپن ہار کے یہاں سے فلسفے کی ڈور کا پہلا سرا انجام لیا۔ اور دوسرا تراش کر پھینک دیا۔ انہوں نے کہا کہ زندگی بہرحال جینے کے قابل ہے اس کی کو ہم عقل و استدلال سے نہیں جانچ سکتے، کسی اور پیمانے سے نہیں ناپ سکتے۔ بلکہ انسان میں زندہ رہنے کی ایک نامعلوم تمنا ہے اور زندگی کا یہی بنیادی جواز سمجھنا چاہیے۔ چنانچہ "Sanity of art" میں شا ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

"زندگی کسی اخلاقی قانون کی تکمیل یا تعمیل نہیں ہے اور نہ کسی استدلال کا نتیجہ ہے، بلکہ یہ ہمارے اندر اس اندرونی خواہش کی تسکین کا نام ہے جس کے متعلق ہم کچھ نہیں بتا سکتے۔"

شوپن ہار کے یہاں قوتِ ارادی 'Will' ایک وحشت ناک حقیقت تھی شا کے یہاں زندگی اور سماج کو بہتری اور ترقی کی طرف لے جانے والی قوت ہے، اور ہمت افزا حقیقت ہے۔ شوپن ہار کے ہاں جو بنیادی قوت زندگی سے مایوس کرنے والی ہے، وہ برنارڈ شا کے یہاں آ کر امید افزا بن جاتی ہے اور سماجی ارتقا کا سامان بہم کرتی ہے۔

وہ کہتے ہیں کہ ہر اخلاقی فلسفے کی بنیاد اس اصول کو بنایا جائے کہ

"زندگی بہرطور جاری وساری رہنی چاہیے۔

یہ ہے وہ منزل جہاں برنارڈ شا "Man & Superman" لکھنے کے وقت پہنچ چکے تھے۔ یہ ڈرامہ ۱۹۰۱ء ۱۹۰۳ء میں لکھا گیا۔ یہ ڈرامہ ہی ایک فلسفیانہ بساط نہیں ہے۔ بلکہ اس کے دیباچے کو شا نے اپنے فلسفہ کا پہلا اور اہم باب بنانے کی کوشش کی ہے۔

جب اُنہوں نے "انسان اور فوق الانسان" ڈرامہ لکھا، اس وقت ڈارون کا فلسفہ بحث کا موضوع بنا ہوا تھا، ڈارون نے جو اجسام کی مسلسل ترقی اور تسلسل، کا نظریہ پیش کیا تھا اس پر فلسفیوں کے ایک، گروہ کو اعتراض تھا کہ ڈارون اصل میں انتخاب فطرت کا قائل ہے۔ وہ اجسام کے تسلسل اور رفتہ رفتہ ترقی کے متعلق جو صورت اختیار کرتا ہے اس کی روشنی میں انسانی دماغ اور انسانی شعور کی کوئی حیثیت ہی نہیں رہتی اور انسانی زندگی کا ارتقا محض ایک اتفاقی حادثہ بن کر رہ جاتا ہے۔ اس بحث میں شا نے لمارک اور بٹلر کی حمایت کی۔

فرانسیسی فلسفی لمارک ڈارون سے ذرا پہلے اپنا نظریہ پیش کر چکا تھا اس کا مرکزی خیال یہ تھا کہ تمام زندہ اجسام بدلتے گئے ہیں کیونکہ وہ تبدیلی چاہتے تھے۔ شترگاؤ کی گردن اس طرح لمبی ہوئی کہ وہ لمبی گردن کی خواہش اور کوشش کرتا تھا ڈارون کے یہاں جسمانی ارتقا کے پیچھے کسی غیر جسمانی قوت کا نہیں بلکہ مادے کے حادثات اور اتفاقات کا نتیجہ ہے۔ لمارک کے یہاں جسمانی ارتقا کے پیچھے انسانی شعور اور انسانی دماغ کی قوت بھی کارفرما ہے۔ لمارک ہر زندہ وجود میں دماغ اور روح کی قوت کو لازمی مانتا ہے۔ چنانچہ شا کے یہاں بھی "تخلیقی ارتقا" ایک ایسی غیر جسمانی

قوت ہی جو اجسام پر اپنا عمل کرتی رہتی ہے۔ شا نے ڈارون کے مقابلے میں لمارک کی تائید کی۔ دوسرے لفظوں میں انہوں نے مادے کی قوت کے مقابلے میں دماغ کی میکانزم کے مقابلے میں روح کی اور فطری جوڑ توڑ کے مقابلے میں شعور اور قوت ارادی کے جوڑ توڑ کی حمایت کی۔ ڈارون اسکول پر ان کا بنیادی اعتراض یہ تھا کہ :۔

"... انتخابِ فطرت نے زندگی کو ہمارے کرہ کی ضروریات کے مطابق ڈھالنے میں بہت اہم کام دیا ہوگا (مگر آخری فیصلہ صرف انتخاب فطرت کے ہاتھوں میں نہیں بلکہ قوتِ ارادی کے ہاتھ میں رہا ہے) لیکن ہمارے اندر ایک لگاتار خواہش جو رہی ہے کہ زیادہ علم اور زیادہ قوت حاصل کریں اس خواہش کے مطابق ہمارے کرہ کو ڈھالنے والی قوت "تخلیقی ارتقا" ہی ہے" (انتخاب فطرت نہیں)۔

چنانچہ "مین اینڈ سپرمین" کے ڈرامے اور دیباچے کے علاوہ ان کے تین اہم مضامین سے شا کا جو فلسفہ اخذ کیا جاسکتا ہے اور جو کم از کم بیس بائیس سال تک جوں کا توں ان پر حاوی رہا وہ چند لفظوں میں یہ ہے کہ

شا کے نزدیک، کائنات دو حقیقتوں کا مجموعہ ہے۔ حیات اور مادہ۔ مادہ حیات کا دشمن ہے۔ حیات اپنا اظہار چاہتی ہے اور مادہ کو اظہار کی واحد صورت سمجھ کر اس میں داخل ہوتی ہے لیکن اسی کو وہ اپنے قابو میں کرنے کے لیے بیتاب ہے کیونکہ جب تک وہ اپنے اس دشمن کو قابو میں نہ لائے، حیات کی بھرپور قوت اُجاگر نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ حیات مادے کی مختلف شکلوں میں نمودار ہوتی ہے اور ان شکلوں کو برابر آگے بڑھاتی رہتی ہے۔ یہی حیات ہے جس پر قوت ارادی

کا دار و مدار ہے۔ اور قوت ارادی کی نشو و نما کے ذریعے مادہ پر جات کا غلبہ بڑھتا جاتا ہے۔

("مثلاً آپ کو مزید اعضا کی ضرورت ہے۔ یا جتنے اعضا آپ کے پاس موجود ہیں، ان کے موجودہ استعمال کے علاوہ مزید استعمال آپ چاہتے ہیں۔ یعنی مزید عادتیں چاہتے ہیں۔ تو آپ انہیں حاصل کر لیتے ہیں۔ کیونکہ آپ ان کی خواہش اور ارادہ کرتے ہیں اور ان کی برابر کوشش کرتے رہتے ہیں بالآخر آپ کو وہ مزید اعضا، یا ان کا مزید استعمال حاصل ہو جاتا ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ یہ کیونکر ہوا۔ کوئی نہیں کہہ سکتا، کیسے ہوا۔ ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ ایسا بہر حال ہوا۔ ہم بُری طرح کوشش پر کوشش کرتے رہے، یہاں تک کہ جو پچھلے اعضا تھے ان میں ترمیم ہوگئی یا نئے پیدا ہو گئے۔ ایک دم سے جو چیز ناممکن تھی، وہ ممکن ہوگئی، اور عادت یا دستور بن گئی ....")

چنانچہ تخلیقی ارتقا میں وہ قوت ارادی کی اہمیت جتاتے ہوئے کہتے ہیں:

"اگر تمہارے پاس آنکھیں نہیں ہیں اور تم دیکھنا چاہتے ہو اور برابر دیکھنے کی کوشش کرتے رہو تو بالآخر تمہیں آنکھیں مل جائیں گی"۔

زندگی مجموعی طور پر لافانی ہے۔ اور اپنے دشمن مادے پر غلبہ پانے کے لیے بیتاب ہے۔ اس کے لیے وہ بہتر سے بہتر انسان پیدا کرتی رہتی ہے۔

"بہتر اور برتر انسان (مادے سے) اپنی غلامی کے خلاف لڑتا ہے۔ اور جب اس کا وجود مادے سے آزاد ہو جاتا ہے ـــــ اس حادثے سے جسے موت کہتے ہیں ـــــ تو زندگی کی پاکیزہ لہر کی طرف پھر رجوع کرتا ہے، اور زندگی اُسے عطا

بوئی تھی، اُسے وہ اصل مع سود کے لوٹا دیتا ہے، اور اس طرح زندگی کا جو معیار
پہلے سے تھا وہ اور بہتر اور زیادہ اونچا ہو جاتا ہے۔"

زندگی کا معیار اسی طرح اونچا ہوتا جائیگا اور "فوق البشر" یا "Superman"
پیدا ہو جائیگا، اب مادہ حیات کے قابو میں آجائیگا اور موت کا صفایا کر دیا جائیگا۔
(جو مادے کے ہاتھ میں زندگی کے خلاف ایک حربہ تھا)

"آخر وہ دن آئیگا جب انسان نہیں رہ جائینگے، صرف خیال
رہ جائیگا، پاکیزہ اور مادے سے برتر خیال"

نطشے کے ہاں "فوق البشر" یا "سپرمین" کا تصور محض ایک مبہم تصور تھا،
اور اس کی بنیاد مابعد الطبیعیاتی (Meta Physical) تھی ـــ وہ زیادہ سے
زیادہ اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ جس طرح بندر نے بالآخر انسان کو پیدا کر دیا۔ اسی طرح
ہم انسان ایک روز انسان سے برتر کوئی وجود پیدا کر دینگے، اور یہ "سپرمین" ہوگا۔
شا نے اس فلسفے کے لیے طبیعیاتی اور مادی بنیادیں بنانے کی کوشش
کی اور اس کے نقوش اور اُبھارے۔

شا نے طبیعیات اور مابعد الطبیعیات کی معجون مرکب تیار کرنے کی جو کوشش
کی ہے۔ اس کی بنیاد سمجھنے کے لیے اس حقیقت کو مدنظر رکھنا چاہیے کہ شا انسانی
سماج میں ترقی کے خواہشمند ہیں۔ اور زندگی میں انسانیت کے لیے ایک ہمت افزا
امید پاتے ہیں۔

سماجی ترقی کی اس خواہش نے جو فوری انقلاب کی اُمید ابتداء میں قائم
کی تھی، وہ امید پوری نہ ہوئی تو وہ انقلاب کے نظریے سے دھیرے دھیرے خود

کو ارتقا کی اُمید کی طرف لانے لگے، اگرچہ ان کے یہاں اس کے خلاف بیانات بھی ملتے ہیں، مثلاً ایک دیباچے میں انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ آج کا ۹۹ فیصدی انسان بالکل ویسا ہی ہے جیسا اُس وقت کا ۹۹ فیصدی انسان تھا جب وہ غاروں میں رہا کرتا تھا۔ لیکن ایک فیصدی انسان میں پھر بھی بڑی گنجائش ہے اور وہ اس میں اس میں رفتہ رفتہ ارتقا کے امکانات دیکھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ انسان میں ترقی اور بہتری کا جذبہ سب سے بنیادی جذبہ ہے۔ یہ اس کی جبلت میں شامل ہے۔ باقی سارے جذبے اور ساری خواہشات بعد کی باتیں ہیں۔

انسانی تاریخ کو انہوں نے اپنے اس فلسفہ کی کڑیاں جوڑنے کے لیے ترقی کے تین زینوں یا تین منزلوں میں تقسیم کیا ہے۔ اعتقاد کی منزل۔ استدلال اور عقلیت پسندی کا دور، اور قوتِ ارادی (WILL) کا دور۔

پہلا دور — اعتقاد (Faith) کا دور وہ ہے جب حاکم اور محکوم ایک دوسرے کا ہاتھ بٹاتے ہیں اور اس تعاون سے ایسی سماجی زندگی اور سماج کا ایسا ڈھانچہ بنتا ہے جو سماج کو ایک رشتہ میں جوڑے رکھتا ہے

دوسرا دور۔ عقلیت اور استدلال کا دور ہے جس میں سرمایہ دار اُٹھتے ہیں اور اعتقاد کی جگہ استدلال کا حربہ اور عقلیت پسندی کا نعرہ لگا کر صنعتی سرمایہ داری قائم کرتے ہیں۔ دیوتاؤں کا اور سرمایہ داروں کا تعاون ہوتا ہے اور دونوں مل کر عوام کو لوٹنے کی سازش کرتے ہیں۔ پہلے دور میں انسان سوچتا تھا کہ اس کی قوت دراصل کسی بیرونی قوت کا نتیجہ ہے، چنانچہ وہ اس سے ڈرتا تھا اور اس کی عبادت کرتا تھا۔ اعتقاد کی اس منزل سے جب اس نے ترقی کی تو وہ دلیر ہوگیا اور عقل و

استدلال کی بنیاد پر اس نے اعتقاد باللہ کو خیرباد کہہ دیا۔

تیسرا دور، قوتِ ارادی کا دور ہے جب انسان کو اور زیادہ قوت حاصل ہوئی۔ اس نے دیکھا کہ عقلیت پسندی (Rationalism) کا فلسفہ خود اسی کے خلاف استعمال ہوتا رہا ہے۔ چنانچہ انسان نے اس سے بھی بغاوت کی۔ اور اپنے اندر قوت ارادی کے سرچشمے کو دریافت کرلیا۔ (یعنی ارتقا کی ایسی منزل آئیگی جب انسان صرف قوت ارادی کو اپنی اخلاقیات، اپنے سماج اور اپنی سوشل زندگی کی بنیاد بنائیگا۔)

"تخلیقی ارتقا" کا دارومدار قوت ارادی پر ہے، پہلے خواہش کرو۔ پھر اس کا تصور کرو۔ اس کے بعد قوتِ ارادی سے کام لو۔ اور بالآخر تخلیق ہو جائیگی۔

نطشے کہتا تھا، انسان اگر یہی ہے جو موجود ہے، تو یہ اتنا ناکارہ ہے کہ اس سے برتر وجود پیدا ہونا چاہیے۔

شا کہتے ہیں، انسان دھیرے دھیرے ترقی کرتا رہا ہے تخلیقی ارتقا کا اصول زندگی کے ہر شعبے میں، انسان کی بناوٹ اور اس کے شعور میں کارفرما رہا ہے، اور یہی اصول موجودہ انسانوں سے بہتر انسان پیدا کر کے رہیگا۔ البتہ ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم "Life force" (قوت حیات) کی راہ میں حائل نہ ہوں بلکہ اسے اپنا فرض ادا کرنے میں مدد کریں، اس کا ہاتھ بٹائیں تاکہ قوتِ حیات بہتر اور برتر انسان جلد سے جلد وجود میں لاسکے۔ "قوتِ حیات" کی مدد کیسے کی جائے؟ اس کا جواب انہوں نے (Man & Superman) میں مختلف پہلوؤں سے دینے کی کوشش کی ہے۔

"مین اینڈ سپرمین" میں انہوں نے دکھایا ہے کہ زندگی، عورت سے مرد کی تخلیق کا کام لیتی ہے تاکہ بہتر سے بہتر مرد پیدا ہو کر زندگی کا معیار اونچا کرتا چلا جائے۔

"جنسی لحاظ سے عورت کا وجود، قدرت کی ایک تدبیر اور حکمت ہے جس سے بہت سلیقے کے ساتھ قدرت کے تقاضوں کی تکمیل کی جا سکے۔ عورت فطری طور پر یہ جانتی ہے کہ ارتقا کے کاروبار میں کبھی نہ کبھی عورت نے ہی مرد کو جنم دیا تھا، اس کی تخلیق، اور اس کی ایجاد اور تمیز قائم کی تھی، تاکہ کوئی ایسی چیز وجود میں آسکے جو اس وجود سے بہتر ہو جسے صرف ایک جنس (تنہا عورت) کی کوشش پیدا کر سکتی تھی"

چنانچہ قوت حیات نے عورت کو اپنا براہ راست اور زیادہ قریبی ذریعہ بنایا ہے۔ قوتِ حیات چونکہ مرد اور عورت کے بہتر سے بہتر جوڑے کے ذریعے بہتر سے بہتر نسل اور برتر انسان پیدا کرنا چاہتی ہے اس لیے اس نے عورت کو اپنا زیادہ ہوشیار 'ایجنٹ' بنایا ہے۔ ۹۹ فیصدی موقعوں پر فتح عورت کی ہوتی ہے اور وہ ۹۹ فیصدی مردوں کو ایک مہم پسند، موجد، صنّاع، ماہر فن یا محقق بننے کے بجائے اپنا پجاری اور اپنے بچوں کا رکھوالا بنا ڈالتی ہے۔ ایک فیصدی مرد اس طرح شکار ہونے سے بچتے ہیں۔ 'تخلیقی ارتقا' کی مشین میں پرزہ بن جانے کے باوجود وہ صرف عورت کے پجاری اور اس کے بچوں کا پیٹ بھرنے والے کماؤ شوہر ہی بن کر نہیں رہ جاتے بلکہ اپنی ذہانت، اپنی دوراندیشی، اپنی فنّی صلاحیت، اپنی قوت ایجاد سے کام لیتے ہیں اور اسی فرض میں لگے رہتے ہیں۔ ایسے لوگ Genius یا ذہانت وعقل کا پُتلا ہوتے ہیں۔ اور ان کی ذات ایسی ذات ہے

"جسے قدرت نے اسی کام کے لیے چنا ہے کہ وہ ذہنی بیداری، خیالات اور دماغ کی قوت کو خود اسی کی تعمیر کی خاطر تعمیر کرتے رہیں"

وہ اپنے فن اور اپنی تحقیق کی خاطر عورت کو اور بچوں کو قربان کر دینگے لیکن خود "قوت تخلیق" کا وہ اصل پرزہ بنینگے جن سے سماج ترقی کریگا اور انسان بہتر سے بہتر ترقی یافتہ شکل میں ڈھلتا جائیگا۔

شا کے تخلیقی ارتقا کے اس فلسفے سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ شا میں ایک طرف سماجی ترقی کا تقاضا، اور دوسری طرف عوام، خصوصاً محنت کش عوام کی جدوجہد سے بے تعلقی کا کیا نتیجہ نکلا، پہلے ان کی تمام ذہنی اور عملی کوششوں کی بنیادی اینٹ یہ تھی کہ فرد کو بہتر بنانے کے لیے سماج کو بدلا جائے، اور سماج کے بیرونی حالات کو بہتر بنایا جائے۔ یعنی وہ سماجی ترقی کا (Objective) خارجی نظریہ رکھتے تھے، لیکن بیسویں صدی شروع ہوتے ہوتے عوام کی انقلابی قوت پر سے ان کا بھروسہ اٹھتا گیا، اور وہ فرد کی اندرونی تبدیلی اور اندرونی ترقی کو سماج کی ترقی کا زینہ سمجھنے لگے۔ دوسرے لفظوں میں ان کا فلسفیانہ نظریہ (Subjective) داخلی ہوگیا۔

یہ صحیح ہے کہ "لوگ اپنی مشکلات پر قابو پاسکتے ہیں بشرطیکہ وہ مشکلات پر قابو پانے کے لیے اٹل ارادہ کریں" مگر سوال یہ ہے کہ قوتِ حیات جیسے مبہم تصوّر کی تسکین کے لیے اٹل ارادہ کریں کیوں؟ اور ارادہ کریں تو انہیں عملی طور پر کیا کرنا چاہیے۔

یہ اور ایسے ہی دوسرے سوالات کا کوئی حل شا کے پاس نہیں ہے۔

بیس بائیس سال تک "تخلیقی ارتقا" کا پرچار کرتے رہنے کے بعد معلوم

ہوتا ہے کہ خود شا کے اعتماد میں بھی کمی آگئی۔ اور انہوں نے اپنے فلسفے میں کچھ رد و بدل کیا "Back to methuselah" جوان کا سب سے زیادہ طویل ڈرامائی سلسلہ ہے، شا کے فلسفے میں قوتِ تخلیق کی ایک اور تازہ قلم لگاتا ہے۔ سُپرمین (فوق الانسان) کی آمد پر اب بھی انہیں بھروسہ ہے لیکن اس کا طریقہ نسل کشی ہی نہیں بلکہ عمر بڑھانا اور زندگی کی میعاد کو تین سو سال تک لے جانا بھی ہے۔ اب وہ اپنے فلسفے کو اس نتیجے پر پہنچاتے ہیں کہ انسانوں کی عمر کا موجودہ اوسط تخلیقی ارتقا کی راہ میں حائل ہے۔

"آدمی اس وقت جیسا کچھ ہے وہ بالکل ناکارہ ہے، قوتِ حیات اس کو ٹھکرا دیگی، جب تک اس کی عمر نہ بڑھے، وہ ایسا ہی ناکارہ رہیگا۔ کیونکہ فی الحال ہوتا یہ ہے کہ انسان جیسے ہی اپنی حماقتوں سے، اپنی کوتاہیوں سے، اپنی اُڑان کی کوششوں سے اور اپنی غلط کاریوں سے اُکتانے لگتا ہے تو اس کی عمر کا دروازہ ہی بند ہو جاتا ہے۔ یعنی جب موجودہ انسان اس قابل ہوتا ہے کہ اپنے پچھلے تجربوں سے کام لے کر زندگی کی ایسی رہنمائی کرے جو قوتِ حیات کے شایانِ شان ہو، تو زندگی ہی تمام ہو جاتی ہے چنانچہ قوت حیات کے منشا، کی تکمیل کے لیے اور "سُپرمین" (فوق البشر) کو وجود میں لانے کے لیے انسانی عمر کا اوسط تین سو سال ہونا چاہیے"۔

اور جب تک اوسط عمر تین سو سال نہ ہو، کیا قوت تخلیق منتظر رہے؟ اس کا جواب ان کے پاس یہ ہے کہ قوتِ ارادی سے کام لو۔ خواہش کرو یہاں تک کہ

عمر کا اوسط بڑھ جائیگا۔ فوق البشر وجود میں آئیگا اور سماج بہتر ہو جائیگا۔ کائنات کے وجود کا ابتدائی زمانہ ہے۔ حوا (جس سے مراد وہی عورت ہے جس نے "آدم کو اپنے اندر سے جنم دیا، کیونکہ وہ تنہا تھی اور نئے وجود کی تخلیق کے لیے بیچین) ایک سانپ کے وجود کا احساس کرتی ہے (سانپ یہاں فلسفی اور مبلغ ہے شا کی طرح) سانپ انہیں کائنات کی حقیقت سمجھا رہا ہے۔

"ہر ایک شئے، لاشے سے بنی ہے، اپنے مضبوط بازو پر گوشت کی موٹی تہہ دیکھو۔ وہ ہمیشہ سے یہاں نہیں تھی۔ جب میں نے پہلی بار تمہیں دیکھا تو تم درخت پر نہیں چڑھ سکتی تھیں لیکن تم نے ارادہ کیا اور کوشش کی۔ پھر ارادہ کیا اور کوشش کی۔ تمہارے ارادے نے لاشے سے تمہارے بازو پر یہ گوشت کی تہ چڑھا دی .... اب تم ایک ہاتھ کی مدد سے اپنے آپ کو اوپر کھینچ سکتی تھیں اور اس ٹہنی یا گدے پر بٹھا سکتی تھیں جو تمہارے سر سے بھی اونچی تھی ...."

جسم اور دماغ، دونوں میں تخلیقی ارتقا اسی طرح قوت ارادی سے کام لیا ہے "تخلیقی ارتقا" کے پیچھے جو "قوتِ حیات" کام کر رہی ہے، اس کا کوئی اور چھور نہیں۔ اس کی کوئی ابتدا ریا انتہا نہیں۔

"زندگی کا کوئی منتہا نہیں۔ اگرچہ زندگی کی کروروں سر بفلک عمارتوں میں ابھی بہت سی عمارتیں خالی پڑی ہیں۔ اور کتنے ہی محل ابھی بنے بھی نہیں۔ اور اس کی بے پناہ وسعتیں اگرچہ آج بھی بیابان کی طرح اُجاڑ ہیں، لیکن ایک

روز یہ بیابان میرے بچوں سے بھر جائیگا۔ اور انتہائی حدوں تک مادے پر غالب آجائیگا۔ اس سے جس طرح چاہیگا کام لیگا۔ اس کے بعد کیا ہے (ماوراء) للیتھ کی نگاہ نہیں دیکھ سکتی۔ بس یہی کافی ہے کہ ماوراء کا وجود بھی ہے" (مادے کے پرے بھی کچھ ہے)

یہ آخری آواز ہے جو آدم و حوّا سے پہلے کے وجود للیتھ کے لبوں سے آرہی ہے اور اسی پر "Back to Methuselah" کا پردہ گر جاتا ہے۔

یہ ہے شا کا وہ فلسفہ جس کی بنا پر وہ خود کو علم حیات اور معاشیات کا ماننے والا (Biologist Economist) کہتے ہیں۔ اور جس پر دو طرف سے حملے ہوئے ہیں۔ ایک طرف مابعد الطبیعیات کے ماننے والے پروفیسر جود، چسٹرٹن، ارک بنٹلی، ہاریس، اور کولبورن جیسے شا کے قدردان شامل ہیں۔ جنھوں نے اُسے مابعد الطبیعیات کے ساتھ مادیت پرست کہا ہے، اور دوسری طرف مادیت پرست مارکسسٹ، کرسٹوفر کاڈویل اور الک ویسٹ ہیں جو اُسے ایسا عینیت پسند کہتے ہیں جس کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ ——

"قلبِ او مومن دماغش کافر ست"

شاؔ، سیاست داں

شاؔ کی ایک نقاد Erie Bentley نے اچھا جملہ کہا کہ "سپرمین" برنارڈ شاؔ کی سیاست اور ان کے مذہب (فلسفے) کے درمیان غالباً سب سے اہم کڑی ہے"۔

شاؔ کے سپرمین (فوق البشر) کا نظریہ سامنے رکھنے کے بعد ان کی سیاست اور اُس کے اُتار چڑھاؤ کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ لندن آنے کے چند سال بعد ۱۸۸۲ء سے شاؔ کی سیاسی جد وجہد شروع ہو جاتی ہے۔ ان کے پہلے ناول کا موضوع قطعی طور پر سیاسی ہے۔ اور جیسا کہ وہ خود دعویٰ کرتے ہیں ان کے فن کا مقصد بھی سیاسی ہوتا ہے۔ اپنے پہلے ڈرامے "لاوارثوں کی بستی" کے متعلق ان کا کہنا ہے کہ میں اس سے یہ پروپیگنڈا کرنا چاہتا ہوں کہ لوگ آئندہ الکشن میں ترقی پسند فریقوں کو ووٹ دیں"

شاؔ کو خود جن حالات سے گزرنا پڑا انہوں نے اور بھی یہ یقین پختہ کر دیا کہ موجودہ سماج میں اخلاقی، روحانی، فنی اور ادبی، تخلیقی کوشش کا پنپنا مشکل ہے۔ سماج کو بہتر بنانے کی جو سیاسی اور معاشی جد وجہد تھی، شاؔ اس میں کود پڑے، اور ابتداء میں ہی اُنھوں نے یہ یقین کر دیا کہ سیاسی اور سماجی انقلاب دروازے پر دستک دے رہا ہے۔" اپنے سوٗلہ خاکے" میں انھوں نے ۸۲-۱۸۸۱ء کے زمانے کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جب کوئی برسر عام پوچھتا "اگر تمہیں اختیار دے دیا جائے تو انگلینڈ

میں سوشلزم کب تک قائم ہو جائیگا؟ میں کہتا کہ "بس چودہ دن میں" اور نوجوانوں میں ایسا جوش وخروش تھا کہ وہ سمجھتے تھے، انقلاب اگلے برس تک آرہا ہے۔

لیکن "اگلے برس" انقلاب نہیں آیا، کئی اگلے برس گزر گئے اور انگلینڈ میں انقلاب نہیں آیا۔ یہیں سے شا کے سیاسی خیالات اور طریق کار میں انقلاب آنا شروع ہوا۔

انہوں نے کارل مارکس پڑھا تھا لیکن وہ اس زمانے کے مارکسی حلقے سوشل ڈیماکریٹک فیڈریشن میں شامل نہیں ہوئے، جس کی وجہ شا کی خود نوشت سوانح عمری سے یہ ظاہر ہوتی ہے کہ وہ اس حلقے میں اپنا طبقاتی جوڑ نہیں پاتے تھے، البتہ ۱۸۸۴ء میں فے بین سوسائٹی (Fabian Society) میں چلے گئے۔ جس کی بنیاد اسی وقت رکھی جارہی تھی۔ فے بین تحریک جس کی داغ بیل ڈالنے والوں میں شا کے عزیز دوست سڈنی ویب، ان کی بیوی بیٹرس ویب اور خود شا کا نام شامل ہے۔ اس اصول کی نیم سوشلسٹ سوسائٹی تھی کہ سوشلزم کی تحریک کو حرارت کے بجائے روشنی کی زیادہ ضرورت ہے۔

ان خوبصورت لفظوں کے پیچھے یہ حقیقت پوشیدہ ہے کہ سوشلزم لانے کے لیے طبقاتی جدوجہد اور مزدوروں کی جنگجو تنظیموں کی وہ اہمیت نہیں ہے جو سوشلزم کے نظریوں کی تبلیغ اور ذہنی طور پر سوشلسٹ بن جانے اور بنا دینے کی اہمیت ہے۔

فے بین تحریک یہ نام ایک رومن کونسل "Fabius" کے نام پر رکھا گیا تھا۔ جب ہنی بال کے خلاف، رومن سپاہی لڑ رہے تھے، اور ہنی بال پر حملہ کیا جاسکتا

تھا فے بیئن نے حملہ نہیں کیا۔ تنقیدیں سنتا رہا، خاموش رہا اور ضبط کا دامن نہیں چھوڑا۔ یہاں تک کہ جنگ ختم ہو گئی۔ اس طرح تاخیر، ضبط اور مناسب وقت کے انتظار میں حملہ روکے رکھنے کی صفات کی بنیاد پر اس کا نام ضرب المثل بن گیا اور "انتظار کیے جاؤ" کی پالیسی والے نیم سوشلسٹ نوجوانوں نے اسی نام سے اپنی تحریک کو وابستہ کیا۔ کیونکہ ان کی بنیادی پالیسی بھی یہی تھی کہ گھوڑے کو عین اُس وقت کنارے جب وہ پیاس سے بیتاب ہو۔ بالفاظ دیگر عوام کو سوشلزم اس وقت دو جب، وہ سوشلزم کے لیے اتنے تیار ہو چکے ہوں کہ اس کے بغیر نہ رہ سکیں (یہ اور بات ہے کہ فے بین شہسوار اپنے گھوڑوں کو کبھی پانی نہ پلا سکے)

"فے بین" تحریک ان نوجوان دانشوروں کی تحریک بنتی چلی گئی جو انقلاب کو ایک تاریخی جبر (Historical Determinism) سمجھتے تھے اور جن کا خیال تھا کہ جد و جہد کی کیا ضرورت ہے۔ صنعتی سرمایہ داری خود وہ صورت اختیار کر چکی ہے جہاں وہ سوشلزم کے موڑ پر آ جائیگی۔ اس سوسائٹی میں اوپر سے نیچے تک تمام سفید پوش "درمیانی طبقے کے پڑھے لکھے نوجوان" بھرے ہوئے تھے۔ ایک تو ان کا یقین تھا کہ سوشلزم کی تحریک کا کام صرف سوشلزم کا پرچار ہے۔ ادھر پرچار ہوگا، مزدور اس نظریے میں اپنی فلاح دیکھینگے، اور سب اسی طرف جھک جائینگے، اور اُدھر پیداواری قوتوں کے تقاضے سے سرمایہ دار طبقہ بھی مجبور ہو گا کہ موجودہ نظام کی جگہ سوشلزم کا بہتر نظام اختیار کرلے جس میں مفلوج عناصر کا وجود نہ رہے اور مزدوروں کی آمدنی، ان کی تعلیمی حالت، ان کی اخلاقی سطح بھی بدرجہا بہتر ہو جائے۔

اس زمانے میں — اگرچہ مزدور طبقہ نے بین سوسائٹی کے قریب نہیں آیا لیکن — شا نے مزدوروں کے جلسوں میں حصّہ لیا، جا بجا، سڑکوں پر، باغوں میں، کارخانوں کے دروازوں پر، مزدور بستیوں میں تقریریں کیں اور سوشلزم کا پرچار کیا۔ یہ پرچار جاری تھا کہ ۱۸۸۷ء میں لندن کے مشہور تاریخی جلسہ گاہ ٹرافلگر اسکوائر میں پولس کے لاٹھی چارج سے جلسہ منتشر ہوگیا اور شا پر عوام خصوصاً مزدور طبقے کی انقلابی قوت سے مایوسی طاری ہونی شروع ہوئی۔

اگرچہ وہ اس کے بعد بھی اپنے ڈراموں میں اور اپنی تقریروں میں انقلاب، تشدّد، اور بزور بازو اختیارات چھین لینے کا ذکر کبھی کبھی کرتے رہے، لیکن یہاں سے ان کا ذہن دوسری ڈگر کی طرف مڑنے لگا۔ دوسری ڈگر یہ کہ سماج کی ترقی جاہل، کندۂ ناتراش، غریب، پس ماندہ اور بے حوصلہ عوام کے ہاتھوں ہونا دشوار ہے، بلکہ ترقی کا راستہ یہ ہے کہ موجودہ معیار سے بہتر انسان پیدا ہوں اور وہ اپنی قوت ارادی اور اپنی صلاحیت سے سماج کو سدھار دیں۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اسی زمانے میں شا پر افلاطون کے سیاسی نظریے اور اس کی شہرہ آفاق کتاب "ریپبلک" کا اثر پڑا۔ شا خود اگرچہ اس کے اثر کا اعتراف نہیں کرتے، لیکن شا کے تازہ موڑ میں اور افلاطون کے سیاسی نظریے میں بڑی مشابہت ہے۔

دونوں جذباتیت کے مخالف ہیں، دونوں حقیقت پسندی کے حامی ہیں اور دونوں عوام کی انقلابی قوت یا ان کے تنظیمی شعور اور ان کی سوجھ بوجھ پر بھروسہ نہیں رکھتے۔ افلاطون کے یہاں بہتر سماج کے لیے حل یہ ہے کہ ایک فلسفی

بادشاہ" عقلِ محض اور استدلالِ محض کے بل پر حکومت کی باگ ڈور سنبھالے۔ اور عام لوگوں کے مفاد کا خیال رکھے۔ شاؔ کے یہاں اس حکمراں طاقت کا نام "فلسفی بادشاہ" نہیں بلکہ "سُپر مین" ہے۔

البتہ ایک بنیادی فرق ہے، شاؔ اس ڈگر پر چلنے کے باوجود مابعد الطبیعیات کو بنیاد بنانے سے پرہیز کرتے ہیں اور اسی لیے وہ سُپرمین کے لیے بہتر نسل کشی کو ذریعہ بناتے ہیں۔ جس طرح انہوں نے فلسفے میں شوپن ہار سے اس کی قوتِ ارادی (Will) کا مغز لے لیا تھا اور اس کی قنوطیت ٹھکرا دی تھی۔ اسی طرح یہاں غالباً افلاطون کے یہاں سے انہوں نے عام انسانوں سے بہتر اور برتر انسان کا تصور لے لیا اور اس کا غیر مادّی چھلکا اتار کر ایک طرف رکھ دیا۔

افلاطون کے یہاں فلسفیِ محض قسم کا حکمراں تیار کرنے کا نسخہ یہ ہے کہ تعلیم و تربیت پر زور دیا جائے۔ شاؔ کو اس پر اعتراض ہے کہ یہ ایسی ہی بات ہوئی جیسے تعلیم و تربیت کے ذریعے شکاری کتوں کی اعلیٰ درجے کی نسل تیار کی جائے۔ جو بالکل بے معنی ہے۔ چنانچہ شاؔ اپنے "غیر معمولی انسان" کو وجود میں لانے کے لیے بہتر نسل کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ اور ان کے غیر معمولی انسان کی سب سے اہم صلاحیت یہ ہوگی کہ وہ اپنی قوتِ ارادی سے کام لے کر بہتر سماج کی تعمیر کریگا۔

بہتر نسل پیدا ہونے کا ایک لازمہ یہ بھی ہے کہ لوگوں کا معیارِ زندگی بلند ہو۔ غربت دور کی جائے۔ کیونکہ جب تک غربت کا وجود ہے، اس وقت تک عام طور پر مناسب جوڑوں میں شادی نہیں ہو سکتی۔ دولت اور غربت کے امتیاز کی

وجہ سے سماج کے اندر کھلی شادیاں نہیں ہوسکتیں۔ چنانچہ "سپرمین" کے وجود میں آنے کے لیے غربت اور نسلی امتیاز کا دور ہونا بھی ضروری ہے۔ لیکن جب تک "سپرمین" نمودار نہ ہو اس وقت تک کے لیے کیا کیا جائے؟ اس وقت تک موجودہ حکمرانوں میں بہتر لوگ تلاش کیے جائیں اور ان کی تائید کی جائے (نپولین کے کردار کو ڈرامے کا لباس پہنانے کی ایک ضرورت یہ بھی ہوگی) انتخابات میں ترقی پسند فریقوں کو ووٹ دیے جائیں۔ اور موجودہ سماج کی گندگی کے خلاف پروپگنڈا اتنا عام کیا جائے کہ لوگ ذہنی طور پر بیدار ہو جائیں۔ ظلم، جبر دباؤ، جہالت اور غربت کے خلاف ان میں نفرت بھڑک چکی ہو اور ہمیشہ بہتر سے بہتر سیاسی قوت کا ساتھ دینے پر آمادہ رہیں۔

شا اگرچہ شروع میں تبلیغ اور تعلیم کی فیصلہ کن قوت کے قائل تھے اور جیسا کہ خود انہوں نے کسی جگہ کہا ہے، جان اسٹوارٹ مل کے اس نظریے کو مانتے تھے، لیکن مارکس نے انہیں یہ حقیقت بھی ذہن نشین کرا دی تھی کہ انسان اپنے ماحول کا ایک کیڑا ہے۔ افراد کا معیار اور انسانی سماج کی ترقی کے لیے بیرونی ماحول بدلنے کی بھی ضرورت ہے۔ شا نے "میجر باربرا" لکھنے کے وقت تک ۱۹۰۵ء اس حقیقت کی طرف سے بالکل آنکھیں بند نہیں کی تھیں۔ "مین اینڈ سپرمین" ۱۹۰۱-۳ء میں اگرچہ انہوں نے نظریے میں اس اصول کی طرف سے آنکھیں بند کر لینے کا اظہار کیا لیکن پھر بھی سرمایہ دارانہ سماج کے خلاف اور اس کی پیدا کی ہوئی غربت کے خلاف نفرت کی آگ ان کے یہاں بھڑکتی رہی۔

"غربت، تمام جرموں میں سب سے بڑا جرم ہے ...." اس لیے غربت و افلاس کے خلاف جدوجہد ہونی چاہیے۔ لوگوں کی آمدنی بڑھنی چاہیے جب تک مساوی آمدنی نہ ہو۔ اس وقت تک کوئی تہذیب اور کوئی تمدن زندہ نہیں رہ سکتا۔

پہلے وہ غربت کا علاج یہ بتاتے تھے کہ غریبوں میں جاگرتی پیدا کر کے ان کے کثیر ووٹوں کے ذریعے ایسے نمائندے اختیارات کی مسند، دارالعوام (ہاؤس آف کامنز) میں بھیجے جائیں جو وہاں اپنی اکثریت کے بل پر سوشلسٹ طریق کار اختیار کریں۔ ذرائع پیداوار کی منصوبہ بندی کر کے انہیں اس طرح بڑھایا جائے کہ بہتر، مناسب تر اور زیادہ مفید طور پر دولت کی تقسیم ہو سکے، جس کے لیے پہلی شرط قومی ملکیت کا اصول ہے۔

لیکن شا نے انقلاب سے منہ موڑ کر بتدریج ترقی کا نظریہ اور محنت کش طبقے کو نظر انداز کر کے پورے عالمِ انسانیت کا علم اُٹھایا اس نے انہیں متضاد نظریوں میں گم کر دیا۔

غربت کا علاج کیا ہے؟ زیادہ روپیہ کماؤ، زیادہ روپیہ کیسے کمایا جائے؟ پیداوار دس گنی بڑھاؤ۔ لیکن پیداوار کے ذرائع جن کے ہاتھ میں ہیں کیا وہ دس گنی پیداوار بڑھنے کے بعد غریب محنت کشوں کی غربت دُور کر دینگے؟ میجر باربرا کا مصنّف اس سوال کا کوئی جواب نہیں دیتا۔ وہ مبہم طور پر صرف یہ کہتا ہے کہ "زندگی اور موت دونوں کے ذریعوں پر قبضہ کر لو بغیر اس کے نہ غربت دور ہو سکتی ہے، نہ اختیارات کی باگ ڈور سنبھالنے اور جمہوریت کے نعرے لگانے

سے کچھ حاصل ہے۔ کیونکہ موجودہ جمہوری (مغربی جمہوریت کی) حکومتیں دراصل کروڑپتیوں اور کارخانہ داروں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلیاں بنی ہوئی ہیں

شا کی نظر سماج کے اندرونی مرض تک پہنچتی ہے۔ وہ دیکھتے ہیں کہ جمہوریت کے نام پر امن و تہذیب کے نام پر مغربی سرمایہ داری نے کیا اندھیر مچا رکھا ہے اور قانون کی حفاظت کے نام پر کیسی لاقانونیت پھیلی ہوئی ہے۔

کوئی ایک مجرم شیطنت پھیلانے میں اتنا طاقتور نہیں ہو سکتا اور جرم کرنے میں اتنا بے لگام نہیں ہو سکتا جتنا ایک منظم قوم ہو سکتی ہے کیونکہ وہ اپنے جرائم کو قانوناً جائز قرار دیتی ہے۔ اپنے لیے راست بازی اور حق بجانب ہونے کے سرٹیفکیٹ تیار کر لیتی ہے۔ پھر یہ کہ جو لوگ اس کے صحیح کردار کو بے نقاب کرتے ہیں ان کو سخت سزائیں اور اذیتیں دی جاتی ہیں ....."

لیکن اس کا توڑ کیا ہے؟ کیا حکمراں طبقے کے خلاف جمہوریت اور سوشلزم کی قوتوں کو منظم کیا جائے اور فیصلہ کن جنگ کی جائے؟ شا خاموش ہیں۔ وہ سامراجی مشین کی گندگی ضرور دیکھتے ہیں:

"ہر شخص کو صاف دکھائی دیگا کہ ہمارے سامراجی حملے اور زور زبردستی کا جو موجودہ نظام ہے ..... اور جس نظام میں ہوتا یہ ہے کہ نئی آبادیاں بسانے اور نئے ذرائع دریافت کرنے کے نام پر آگے آگے بحری لٹیرے جاتے ہیں، ان کے پیچھے ہمارا جھنڈا ہوتا ہے، جھنڈے کے پیچھے تجارت، اور آخر میں سب کے پیچھے تبلیغ کرنیوالے پادری ـــ یہ نظام اسی روز بیٹھ جائیگا جس دن ہماری فوجوں کی باگ ڈور سرمایہ دار طبقوں کے ہاتھ سے نکل کر عوام کے ہاتھ میں آئیگی"

سامراجی استحصال کی حقیقت اور اس کے مقدر پر اس سے زیادہ مختصر اور جامع تبصرہ کبھی نہ ہوا ہوگا۔ لیکن وہی برنارڈ شا افریقہ میں برطانوی سامراج کے حملے کو (جنگ بوئر ۱۹۰۰ء) بحری لٹیروں کے پیچھے یونین جیک کو نہ صرف خاموشی سے برداشت کرتے ہیں بلکہ اس کی تائید کرتے ہیں، جبکہ لائڈ جارج اور گلبرٹ چسٹرٹن جیسے غیر سوشلسٹ (بلکہ انٹی سوشلسٹ) بھی اس جنگ میں خونریزی اور تباہ کاری کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں۔ کیونکہ شا کی رائے میں یہ سامراجی حملہ افریقہ میں اندھیرے کی قدیم چٹانوں میں شگاف ڈالنے والا تھا اور نئے ذرائع پیداوار، نئی دریافتیں، نئی تہذیب اور نئے علوم پہنچانے والا تھا۔

"میں تاریخ فطرت کا طالب علم ہوں۔ مجھے راک فیلر (امریکی اجارہ دار) اور رہوڈس پر اس سے زیادہ غصہ نہیں آتا جتنا اس کتے پر جو لومڑی کے شکار کو دوڑ رہا ہو۔ میں سرمایہ دار کو جانتا ہوں۔ وہ بدبخت بیچارہ روپیے کے پیچھے فطرۃً دوڑتا ہے جب کہ اسے اپنی خبر اتنی بھی نہیں ہوتی کہ وہ شکاری درندہ ہے یا صنعت کا رہنما"

(یعنی وہ بدبخت بیچارہ کچھ بھی ہو مگر مجرم نہیں ہے کیونکہ لاشعوری طور پر اور فطرت کے تقاضے سے مجبور ہو کر سرمایے کا تعاقب کرتا ہے)

یہ اس خط کی عبارت ہے جو انھوں نے انگلینڈ کے مشہور مارکسی رہنما اور سوشلسٹ لیڈر ہینڈ مین کو لکھا تھا۔ لیکن "تاریخ فطرت" کے طالب علم کے سینے میں ظلم کے خلاف نفرت اور لوٹ کے خلاف غصے کی چنگاری پھر بھی سرد نہیں ہوئی اور وہ ہر بڑے حادثے کے جھونکے سے سُلگ سُلگ کر زندہ رہی۔

۱۹۱۴ء میں جیسے ہی جنگ عظیم شروع ہوئی، شا پہلے ادیب تھے جنہوں نے اس جنگ کے خلاف آواز اٹھائی۔ انہوں نے "جنگ کے متعلق عام باتیں" لکھ کر صاف طور پر کہا کہ جہاں تک حق و انصاف کا تعلق ہے، نہ وہ انگریز کے ساتھ ہے، نہ جرمنی کے ساتھ دونوں اسلحہ کی دوڑ لگا رہے ہیں، دونوں بازار کے لیے لڑ رہے ہیں۔ "انگریز بھی جرمنوں سے کچھ کم، آدم کی گنہگار اولاد نہیں ہیں۔ انگریز کوئی پردار فرشتے نہیں ہیں" دونوں ظالم ہیں اور دونوں برابر کے خونریز اور جنگ باز۔ اس لیے دونوں فریقوں کے عام سپاہیوں کو چاہیے کہ وہ اپنے اپنے افسروں کو گولی مار دیں اور گھر چلے آئیں۔

لیکن دونوں فریقوں نے اپنے افسروں اور حکمرانوں کا حکم مانا اور ایک دوسرے کو گولی مارتے رہے۔ البتہ طنز، تحقیر اور غصے کی باقی گولیاں شا کے سینے پر پڑیں اور وہ خاموش ہو کر بیٹھ رہے۔

پہلی جنگ عظیم ختم ہوئی (۱۹۱۸ء) تو دنیا میں ایک نئے قسم کا انقلاب نمودار ہوا اور نئے طرز کی اسٹیٹ تعمیر ہوئی۔ شا نے اس واقعے کی اہمیت کو سمجھا۔ شا کو یہ دوسرا بڑا موقعہ ملا تھا جب وہ اس مبہم اُمید کی طرف لوٹ سکتے تھے۔ جس سے اُنہوں نے بیسویں صدی شروع ہوتے ہوتے مایوسی اختیار کر لی تھی۔ لیکن جمہور کی قوت، اور مزدور طبقے کی "سوجھ بوجھ" سے ان کی ہمدردانہ مایوسی اتنی گہری تھی کہ واپسی میں شا کو جھجک محسوس ہونے لگی۔

طویل خاموشی کے بعد انہوں نے "سوشلزم اور سرمایہ داری پر ایک ذہین عورت کا ہدایت نامہ" (۱۹۲۸ء) لکھا جس میں پھر ایک بار سوشلزم کا مقدمہ لڑا گیا

تھا۔ کیونکہ سوشلزم پر ان کے نیم جان یقین کو سودیت سوشلسٹ انقلاب سے نئی زندگی مل گئی تھی۔ پہلی جنگ عظیم اور سوشلسٹ انقلاب ۱۹۱۷ء کے بعد سے ایک طرف تو وہ سوشلزم کی طاقتوں میں دم خم دیکھنے لگے تھے، دوسری طرف عوام کی صلاحیت پر شک وشبہ اور سپرمین کی آمد کا انتظار بھی تھا، اور دونوں کی کڑیاں جوڑنے میں انہیں خود اپنی سیاسی لائن پر ضرب پڑتی نظر آتی تھی ۔

۱۹۲۴ء کے ایک غیر مطبوعہ مضمون میں انہوں نے لکھا تھا "...... مختصر یہ کہ ہمیں سوشلزم کا مذہب اختیار کر لینا چاہیے۔ سوشلزم کے لیے ہمیں اپنی قوت ارادی پر ڈٹ جانا چاہیے۔ اور دلیل واستدلال سے صرف یہ کام لینا چاہیے کہ سوشلزم کے لیے کیا طریق کار اختیار کیا جائے"

شا اپنے جس سوانح نگار کو سب سے زیادہ مستند قرار دیتے ہیں وہ آرکیبلڈ ہنڈرسن ہیں۔ ہنڈرسن سے ۱۹۲۴ء میں گفتگو کرتے ہوئے اُنہوں نے کہا:

"میں آپ سے کہہ تو چکا ہوں کہ میں کمیونسٹ ہوں اور پھر بھی آپ پوچھے جا رہے ہیں کہ کیا میں سوشلسٹ ہوں۔ گویا کوئی شخص سوشلسٹ ہوئے بغیر بھی کمیونسٹ ہو سکتا ہے ..... ہر آدمی، اگر وہ عادی مجرم نہیں ہے تو کسی حد تک یا تو وہ کمیونسٹ ہے اور یا پھر سوشلسٹ ...."

کمیونزم سے ان کی مراد اس جملے سے ظاہر ہے کہ "امریکہ کی سڑکوں پر کمیونزم کے طریقے سے روشنی کی جاتی ہے۔ لیکن خود امریکی اس حقیقت سے ناواقف ہیں۔ وہ کمیونزم، سوشلزم، انارکزم .... کو گالی کے طور پر استعمال کرتے ہیں..."

وہی شا جس نے مارکس کو یہ کہہ کر ایک طرف رکھ دیا تھا کہ مجھے اس کے

معاشی نظریے سے جیوون کا معاشی نظریہ زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ اور جس کی تصنیف کیپٹل (سرمایہ) کو انہوں نے "ہنگامہ خیز پرانی حدیثیں" کہہ کر رد کر دیا تھا، انقلاب روس کے بعد پھر اسی سیاسی لائن کی طرف جھکتے ہیں۔

"جو سوشلسٹ بنیادی اور لازمی طور پر مارکسی نہ ہوں، کسی طرح سوشلسٹ نہیں ہو سکتے۔"

ایک طرف وہ سوشلسٹ انقلاب کو اندھیرے میں نئی شعاع سمجھ کر دیکھ رہے تھے، دوسری طرف تمام یورپ اور امریکہ میں جمہوریت کے پس پردہ انہیں اجارہ دار کروڑپتیوں کا تماشا نظر آرہا تھا اور پارلیمنٹری جمہوریت محض ایک ڈھونگ۔ اسی زمانے میں (۱۹۲۹ء) انہوں نے "سیب گاڑی" ڈرامہ لکھا۔ اس ڈرامے کو اور اس کے دیباچے کو انہوں نے پارلیمنٹری جمہوریت کے خلاف زبردست حملے کی شکل دے دی۔

جن لوگوں نے "سیب گاڑی" کا مطلب یہ سمجھا کہ وہ جمہوری طریقے سے چنے ہوئے وزیروں کے خلاف موروثی بادشاہ کی حمایت کر رہے ہیں، ان کو جواب دیتے ہوئے شا نے لکھا کہ "ٹکراؤ دراصل بادشاہی اور جمہوریت کا نہیں ہے" بلکہ یہ دونوں ایک طرف ہیں اور سرمایہ داری دوسری طرف۔

"روپیہ بولتا ہے، روپیہ چھاپتا ہے، روپیہ نشر و اشاعت کرتا ہے، روپیہ حکومت کرتا ہے، اور بادشاہ سے لے کر مزدور لیڈروں (وزیروں) تک، سب کو صرف دستخط کرنا ہوتے ہیں۔"

"بڑے بڑے پختہ عقائد والے کٹر سوشلسٹ وزیر بھی

(ڈرامے کی ایک اجارہ دار صنعتی کمپنی) Breakage Ltd کی
گرفت میں بالکل بے بس ہیں۔ اس طرح کہ باقاعدہ اس کے ایجنٹ
معلوم ہوتے ہیں۔"

اور اسی سلسلے میں وہ اپنے سیاسی نظریے کی وضاحت کرتے ہیں:
"ہمیں دو ناقابل تقسیم مسائل کو سلجھانا ہے۔ ایک اقتصادی سوال
یہ کہ ہم اپنی ضروریات کا سامان کیسے پیدا کریں اور کیسے تقسیم کریں
دوسرا سیاسی سوال۔ یہ کہ ہم اپنے حکمراں کیسے انتخاب کریں۔ اور
ان پر نگرانی رکھیں کہ وہ اپنے اختیارات کو اپنی ذات یا اپنے مذہب
کے مفاد میں غلط استعمال نہ کرنے پائیں۔ اقتصادی مسئلے کا
حل ہم نے سرمایہ دارانہ نظام نکالا ہے جو پیداوار میں تو معجزے
کر دکھاتا ہے لیکن اس کی مناسب تقسیم کرنے میں تباہ کن حد تک
ناکام رہتا ہے۔ یا پھر وہ سماجی ضروریات کے مطابق پیداوار
کرنے میں اتنا ناکام ہوتا ہے کہ اسے ہمیشہ معطل ہو جانے کی شکایت
پیدا ہوتی رہتی ہے۔ اور وہ بھی ان اشیا کی "زیادہ پیداوار" سے معطل
اور مفلوج ہونے میں مبتلا ہوتا ہے جن اشیاء کی ہمارے کروڑوں انسانوں
کو انتہائی ضرورت باقی رہتی ہے۔
"سیاسی مسئلے کا حل ہم نے یہ نکالا ہے کہ ہر ایک کو ووٹ کا حق دیا
جائے اور ہر مختار کار کو ووٹ کے ذریعے چنا جائے۔"

یہ دونوں طریقے غلط اور ناکام ہیں۔ اوّل تو الکشن اتنا بے ڈھنگا

ہوتا ہے کہ اگر سب سے زیادہ ووٹ پانے والوں کی جگہ سب سے کم ووٹ پانے والوں کو اختیارات سپرد کردیے جائیں، تب بھی صورت حال میں کوئی فرق نہیں آئیگا۔ دوسرے یہ کہ اس طریق انتخاب سے پورے اختیار غیر ذمہ دار اور پرائیویٹ کاروبار کے ہاتھوں میں آگئے ہیں اور وہ اسے عوام کے مفاد کے خلاف، اپنے مفاد کےلیے استعمال کرتے ہیں۔ تیسرے یہ کہ بہتری ہو ہی نہیں سکتی۔ وزارت کو بہتری کی تدبیریں کرنے کی مہلت ہی نہیں ملتی۔ انہیں تو صرف پارٹی کا اعتماد حاصل کرنا اور جوڑ توڑ کرنا ہوتا ہے۔ اور اگر وہ کچھ کرنا بھی چاہیں تو پارٹی سسٹم اور کیبنٹ سسٹم ایسا ہے کہ تیس منٹ کا کام تیس سال میں ہوتا ہے۔ اور جب پھر تیس سال کے کام کا انبار لگ جاتا ہے تو وہ تیس منٹ میں اندھا دھند نبٹا دیا جاتا ہے، نتیجہ دونوں صورتوں میں غلط کاری اور سماجی ترقی کے امکانات کا خاتمہ۔

پروفیسر جوڈ اور ان کے علاوہ شا کے بعض اور قدردان بھی سمجھتے ہیں کہ جمہوریت پران کا یہ حملہ محض اس لیے ہے کہ وہ جمہور سے بیزار ہیں لیکن اس کی دوسری وجہ بھی ہے اور وہ ہے سودیت روس میں غیر پارلیمنٹری جمہوریت یا مزدور طبقے کی ڈکٹیٹرشپ کی کامیابی اور خوش حالی کا منظر۔

۱۹۳۱ء میں شا سودیٹ گئے اور وہاں سے واپس آئے تو ان کی بات بات میں سوشلسٹ سودیت اسٹیٹ کے نظم ونسق کی تعریفیں اور سماجی ترقی کے

متعلق بڑی اُمیدیں پائی جاتی تھیں۔ اگرچہ وہاں سے واپسی پر وہ اپنے ساتھ یہ دریافت بھی لائے کہ لینن خود بھی "فے بین" ہے۔ تاہم لینن کی تخلیق سوویٹ اسٹیٹ کی ٹھوس بنیاد اور فے بین ازم کے کھوکھلے پن اور اس کی موت دو ایسی حقیقتیں تھیں جن میں شا کی نگاہ امتیاز کرسکتی تھی۔ واپسی کے فوراً بعد جو انھوں نے سیاسی تقریر کی اس میں اُنھوں نے حاضرین کو آگاہ کیا کہ روس میں انقلاب کی کامیابی نے نئے امکانات کا دروازہ کھول دیا ہے۔

"اب تک آپ کے پاس فے بین تحریک تھی، سوشل ڈیماکریسی تھی، اجتماعیت تھی، اور سوشلزم وغیرہ تھا، مگر اب وہ سب کچھ گیا گزرا سمجھیے۔ کمیونزم کے سوا اب کچھ نہیں ہے۔ اور آئندہ اپنے آپ کو فے بین (Fabian) کہتے پھرنا بالکل فضول ہے۔" اور اب یا تو آپ کمیونسٹ ہیں یا شہنشاہیت پسند وغیرہ....

اسی زمانہ میں اُنھوں نے امریکہ کے نام براڈ کاسٹ کرتے ہوئے کہا:
"تم سمجھتے ہوگے میں سٹھیا گیا ہوں۔" لیکن دنیا میں جو یہ حیرتناک نئی طاقت" سوویت روس پیدا ہوئی ہے، یہ وہ طاقت ہے کہ "تم نے جو آزادی کا فرضہ دیا تھا اور اپنے جوانوں کا خون دیا تھا" یہ اس کی قیمت ہے۔ "خدا تمھیں یہی دینا چاہتا تھا" تم اسے قبول کرلو۔

لیکن شا اسے پوری طرح قبول نہ کرسکے، "برتر انسان" کا نظریہ اور فرد کی "قوت ارادی" کا فلسفہ ان کے سیاسی شعور کو اب بھی اُلجھائے ہوئے تھا۔ چنانچہ مسولینی کے معاملے میں ان کا رویہ وہی ہے جو اقبال کا ہے۔ انہیں تھوڑی دیر کے لیے محسوس ہوتا ہے کہ "سُپرمین" کے امکانات پیدا ہو رہے ہیں۔ اور وہ

مسولینی کی فسطائیت کو سامراج کے جواب میں خوش آمدید کہتے ہیں۔ ہٹلر کا اقتدار بھی ان کے "برتر انسان" کو لبھاتا ہے۔

یہ ہے شا کا سیاسی تضاد۔ جو ان کے فکری پیچ و خم سے پیدا ہوا وہی شا جو سوویت روس، سُرخ فوج کو تہذیب و تمدن کا حیرتناک مرکز کہہ کر پکارتے ہیں، ہٹلر اور مسولینی کے فاشزم میں بھی تہذیب کے ارتقا کا سامان دیکھتے ہیں۔ شاید اس کا ایک سبب یہ بھی ہو کہ "فاشزم درمیانی طبقے کا بالشوزم ہے" اور شا خود کو جیتے جی درمیانی طبقے کا فلسفیانہ نمائندہ بنائے ہے۔

شا کا سیاسی نظریہ ابھی دو مقابل کی کشتیوں پر سوار تھا کہ دوسری جنگ عظیم کے آثار نظر آنے لگے۔ انہوں نے اس بار پھر اپنا ہتھیار نکالا۔۔ "Unoommonsense ubout war" (جنگ کے متعلق غیر معمولی باتیں) لکھ کر انہوں نے پھر اس کے اسباب پر بحث کی۔ اور بعد میں یہ تجویز بھی رکھی کہ ہٹلر کو آدھا پولینڈ دے کر خاموش کر دیا جائے لیکن فاشزم کے خلاف بڑھتے ہوئے غصے کی رو دیکھ کر شا خود ہی خاموش ہو گئے۔

۱۹۴۳ء میں انہوں نے پیشگوئی کی تھی کہ "جنگ کے نتائج کچھ زیادہ امید افزا نہیں ہیں۔ کیونکہ اگر ہم ہار گئے تو جیتنے والے کے ہاتھوں ہمارا سارا خون بہہ جائیگا اور اگر جیت گئے تو ہم اپنے ہاتھوں اپنا خون بہا لینگے۔۔۔" ان جملوں میں شا کی سیاسی فکر سے قطع نظر کتنی دور رس نگاہ ملتی ہے۔

شا خود کو سوشلسٹ کہتے تھے۔ اور آخر تک سوشلسٹ کہتے رہے۔ لیکن

ایک طرف تو ان کی انفرادیت پسندی انہیں سوشلزم کی عام صفوں سے دور دور کھینچتی رہی اور دوسرے، انگلینڈ میں سوشلسٹ تحریک خصوصاً لیبر پارٹی کی مجہول سیاست نے ان کی سیاسی فکر کو ایسے جھٹکے دیے اور اتنا مایوس کیا کہ وہ سوشلزم اور فسطائیت کے دو متضاد نظریوں کا شکار ہو کر رہ گئے۔ اور آخر تک فیصلہ کن مرحلے پر نہ آسکے۔

تاہم شا کی سیاست سرمایہ دارانہ اور سامراجی نظام کے خلاف بہت کارگر حربہ ہے اور اس کے قلب میں سوشلزم کی فتح کے لیے ہمدردی کے جذبات اور حرارت موجود ہے۔

شاؔ کے ڈرامے

شاؔ کے ڈرامے لکچر روم کے مباحثے ہیں اور اس لحاظ سے یہ کہنا بے جا نہیں کہ شاؔ کا کوئی ایک اہم ڈرامہ پڑھ لیجیے، آپ نے گویا شاؔ کی پوری ڈرامہ نگاری کو سمجھ لیا۔

شاؔ کے ڈراموں کے متعلق زیادہ تر یہ تنقید کی جاتی ہے کہ ان میں جو بات کہی جاتی ہے وہ دو رخی ہوتی ہے۔ اس کا ایک ظاہری مفہوم ہوتا ہے ایک باطنی۔ یہ تنقید ان کے بعض طنزیہ جملوں کے متعلق تو صحیح ہے لیکن ڈراموں کے بارے میں صحیح نہیں کیونکہ وہ سیدھے سادے انداز میں اپنا صرف ایک ہی مفہوم پیش کرتے ہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ جن لوگوں کو شاؔ سے 'ایسی بات' سننے کی توقع نہیں ہوتی، وہ اسے حافظ شیرازی کے تصوّف کی طرح دوسرے معنی پہناتے ہیں اور شاؔ کے پورے ڈرامے کو محض طنز کہہ کر اس کی تعبیر کرتے ہیں۔

شاؔ نے ڈرامے لکھے ہی نہیں ہیں بلکہ ان کی ہیئت، ان کا ڈھانچہ اور ان کی روح بدل کر رکھ دی ہے۔ چیخوف نے ڈرامے کی صرف شکل صورت بدلی تھی اور ابسن نے بقول شاؔ ڈراموں میں بحث چھیڑ کر ان کی محض روح بدلنے کا قدم اُٹھایا تھا۔ شاؔ نے یہ دونوں ذمہ داریاں اپنے سر لے لیں۔ انہوں نے اپنے فن پر پمفلٹ اور جرنلزم، پروپگنڈا اور اشتہار بازی کا طعنہ سُنا اس کے جواب میں اپنے ڈراموں کو پروپگنڈے کی تحریر کہہ کر پیش کیا، اور میدان جیت لیا۔

"کوئی بات نہیں ... جرنلزم یہ دعویٰ کرسکتا ہے کہ وہ ادب کی سب سے اعلیٰ شکل ہے۔ کیونکہ تمام اوّل درجہ کا ادب، بہترین ادب جرنلزم ہی ہے ..... میں بھی جرنلسٹ ہوں۔ مجھے اس پر فخر ہے۔ جان بوجھ کر میں اپنی تحریر سے وہ حصّہ کاٹ دیتا ہوں جو صحافت (جرنلزم) نہیں ہوتا۔ مجھے پورا یقین ہے کہ جو چیز جرنلزم نہیں ہے وہ ادب کی طرح زیادہ عرصہ زندہ نہیں رہیگی۔ اور اگر زندہ رہی بھی تو اس کا زندہ رہنا نہ رہنا برابر ہے۔ اس کا کوئی فائدہ نہیں ...."

فن وادب خواہ جرنلزم یعنی سیدھے سادے نثری انداز کی ہی شکل میں کیوں نہ ہو، اس کا کوئی نہ کوئی فائدہ اور کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہونا چاہیے۔ یہ رویہ ہے جسے اختیار کرکے شا نے ڈرامے لکھے۔ چنانچہ ان کے ڈرامے ان کے فلسفہ سیاست کی کھونٹیوں پر فن کارانہ لباس کی طرح ٹنگے ہوئے ہیں۔

"میرے ڈراموں کے پیچھے خوب سوچا سمجھا عمرانی فلسفہ (Sociology) ہوتا ہے۔ جو میرے ڈراموں کو لازمی طور پر ایسے ڈراموں سے ممتاز کرتا ہے جن کے مصنفوں کو سوسائٹی کا اس سے زیادہ علم نہیں ہوتا کہ مٹر کی ترکاری چھری کانٹے سے نہیں کھانی چاہیئے"

اس پر فخر کرتے ہیں اور اپنے بھائی کو ایک خط میں لکھتے ہیں:-

"میں کوئی معمولی ڈرامہ نگار نہیں ہوں، میں عبرت انگیز، کفر آمیز اور غیر اخلاقی ڈرامے لکھنے میں کمال رکھتا ہوں۔ میری شہرت اور مقبولیت

کی بنیاد یہی ہے کہ میں پبلک کو لگاتار اس پر مجبور کرنے کی کوشش کرتا رہا ہوں کہ وہ اپنے اخلاق اور اخلاقیات پر پھر سے نظر ڈالے میں ڈرامے لکھتا ہوں اچھی طرح اس مقصد کو پیش نظر رکھ کر کہ جنسی اور سماجی مسائل پر قوم کو اپنی رائے اور اپنے خیالات کی طرف لاؤں۔ ڈرامے لکھنے کا اس کے سوا اور کوئی مقصد اور کوئی ترغیب نہیں ہے۔ کیونکہ میں گزر اوقات کی خاطر ڈرامے لکھنے پر مجبور نہیں ہوں" (فنی تنقیدیں لکھ کر بھی زندہ رہ سکتا ہوں)

اس بیان کے پیش نظر شا کے ڈراموں کو چار قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(۱) وہ ڈرامے جن میں شا نے سماج کے بنیادی مسائل کو کھرچا ہے۔
(۲) وہ ڈرامے جنہیں شا نے اپنے فلسفیانہ نظریات پیش کرنے کا بہانہ بنایا۔
(۳) وہ ڈرامے جو محض فرمائش پوری کرنے کے لیے یا تفریح طبع کے لیے لکھے
(۴) وہ ڈرامے جو تاریخی کرداروں سے افسانوی جالے چھڑانے کے لیے لکھے۔

پہلی تقسیم میں شا کے وہ تینوں ڈرامے شامل ہیں جنہیں شا نے ناگوار ڈراموں کا لقب دیا۔ میجر باربرا بھی اسی قسم میں شامل ہے۔ یہ بالکل سیاسی ڈرامے ہیں اور اسی لیے زیادہ ہنگامہ خیز ثابت ہوئے کیونکہ ان میں عوام کو جھنجھوڑنے کی قوت پوشیدہ تھی۔ یہ اتفاقی امر نہیں ہے کہ اس قسم کے ڈرامے شا نے اپنی تصنیفات کے ابتدائی دور میں لکھے جب وہ سوشلزم کی تحریک سے براہ راست تعلق رکھتے تھے، "فے بین" سوسائٹی کی طرف سے مباحثوں میں

حصہ لیتے تھے، سوشلسٹ گروہوں کے ساتھ متحدہ محاذ قائم کرنے کی گفتگو کرتے تھے اور عملی جدوجہد میں آگے آگے تھے۔ اور پھر اسی قسم کے چند ڈرامے ۱۹۲۰ء کے بعد لکھے، جب دنیا میں پہلا انقلاب کامیاب ہو چکا تھا۔

دوسری قسم میں "بشر اور فوق البشر" (Man & Superman) ڈاکٹر کی مصیبت (Doctor's delimma) "کیپٹن بروسباؤنڈ"، "کنڈیڈا"۔ "ہتھیار اور انسان" "Back to methuselah"، "سیب گاڑی" اور چٹانوں پر (On therocks) جیسے ڈرامے لکھے

آخری ڈرامے کے متعلق شا کے بعض نقادوں کا خیال ہے کہ یہ ڈرامہ ہر وہ شخص لکھ سکتا تھا جو ۱۹۳۱ء میں سویت روس کی زندگی دیکھ آیا ہے لیکن ایسا ڈرامہ ہر شخص نے نہیں لکھا، شا نے لکھا اور مغربی جمہوریت کے مقابلہ پر بالشویزم کے دیش کی روز افزوں کامیابی کا خیر مقدم کیا تو صرف اس وجہ سے کہ شا کے نظریات کو اس میں ایک تسکین اور اپنے خواب کی تعبیر نظر آتی تھی۔

"سیب گاڑی" کی خصوصیت بھی اسی میں پوشیدہ ہے کہ اس کے ذریعے وہ "شاہی، روپیہ اور جمہوریت" کا مثلث بنا کر روپے (سرمایہ داری) کا زبردست ہاتھ دکھاتے ہیں اور عوام کی بے بسی اور لاچاری جو ان کے فلسفۂ سیاست کا اہم ترین جزو ہے۔

"بیک ٹو میتھوسلاہ" ان کا سب سے زیادہ طویل ڈرامہ ہے اور اس ڈرامے کو شا کے فلسفے، سیاست اور مذہب کا آخری سنگم سمجھنا چاہیے معلوم ہوتا ہے، یہ ان کے مابعد الطبیعیاتی ذوق کے بجھتے ہوئے چراغ کی آخری لو تھی جو معمول سے زیادہ بھڑک گئی۔ یہ ڈرامہ ۱۹۲۱ء میں لکھا گیا۔ اس کے ستائیس

برس بعد تک شا نے ڈرامے لکھے، لیکن اس کے بعد سانپ، آدم، حوا، للیتھ ماورا، عالم پُراسرار سے کردار (Mystic) اور سپرمین کی علامتیں نہیں ملتیں بلکہ زیادہ سے زیادہ حقائق کا انبار ملتا ہے۔

اس آخری دور میں ان کے ڈراموں کے پیچھے یہ رجحان ملتا ہے کہ عام لوگ بالکل ہی کندۂ ناتراش اور نااہل نہیں ہوتے، صرف جاہل اور بے خبر ہوتے ہیں۔ اگر ان کی بے خبری کو دور کرنے کے لیے حقائق پیش کیے جائیں تو انہیں اپنے حقوق کا شعور دیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اُنہوں نے ایک موقع پر لکھا ہے کہ "میں جب اس فن کار کی طرح ڈرامہ نہیں لکھتا جسے کسی خیال نے لکھنے کی تحریک کی ہو، تو میں سیاسی نصاب لکھا کرتا ہوں، جس میں کسی اِزم کی تعلیم نہیں ہوتی بلکہ مقصود یہ ہوتا ہے کہ ان حالات کی طرف سے اپنے پڑھنے والوں کی آنکھیں کھولوں جن حالات میں وہ زندگی گزار رہے ہیں"

حقائق کی طرف سے آنکھیں کھلوانے کی اس کوشش کو زیادہ پسند نہیں کیا گیا کیونکہ لوگوں کا خیال تھا کہ شا کو اب ڈرامے کے فنی حسن سے بھی کوئی دلچسپی نہیں رہ گئی ہے۔ اب وہ ہیئت کی زیادہ پروا نہیں کرتے۔ اور نہ ڈرامائی کشش پیدا کرنے کی فکر کرتے ہیں اور اس خیال کے پیچھے ایک سچائی موجود ہے۔ شا فن کی اور عمر کی — اس منزل پر پہنچ چکے تھے جہاں فنی گلکاری اور اس کے تقاضے فن کار کے مقام سے پیچھے رہ جاتے ہیں۔

یہ بات کروڑپتی عورت (Millionatress) ۱۹۳۶ء سے ظاہر ہے۔

تیسری قسم میں بھی شا کے کئی ڈرامے آتے ہیں۔ جو انہوں نے کسی کی فرمائش

یا اپنے کسی جذبے کی تسکین کے لیے یا فضا کے تناؤ کو دیکھتے ہوئے محض وقت ٹالنے کے لیے لکھ دیے ہیں۔ اگرچہ ایسے ڈراموں کی تعداد پانچ چھ سے زیادہ نہیں ہے۔

مثال کے طور پر "you never can tell" (تم کبھی نہیں کہہ سکتے) ایک ایسا ہی ڈرامہ ہے یا "Heart break House" جو ۱۹ء میں لکھا گیا۔ لندن کے تھیٹر، شا کے پانچ چھ ڈرامے شائع ہونے کے بعد ان سے نئے ڈراموں کے آرزو مند تھے۔ مثلاً ان سے فرمائش کی جاتی تھی کہ دو چار ڈرامے ایسے بھی لکھیں جن میں بھاری بحثیں نہ ہوں بلکہ لوگوں کے مذاق موسیقی کی تسکین کا سامان ہو جائے۔

اسی طرح "Constancy Unrewarded" (استقلال، جس کا کوئی انعام نہ ملا) ڈرامہ ہے جو انہوں نے اپنی فتح کا علم بلند کرنے کے لیے لکھا۔ تمام پبلشر، تھیٹروں کے منیجر اور کاروباری لوگ شا سے کہتے تھے کہ جب تک ڈرامے میں ہنسی مذاق، موسیقی کا سامان، جنسی تلذذ کے مناظر، کوئی ہنگامہ، قتل، جنگ اور دھوم دھڑاکا نہ ہوگا کوئی ڈرامہ لندن میں کامیاب نہیں ہو سکتا اور نہ ذریعۂ آمدنی بن سکتا ہے۔ لیکن شا اس مطالبے کے خلاف ڈٹے رہے۔ اور انہوں نے صرف مکالموں اور جملہ بازی کے ذریعے ڈرامے تیار کرکے یہ جنگ جیت لی۔ "Getting married" (شادی کی گئی) ایسا ہی ایک ڈرامہ ہے جس میں شادی کے سماجی مسئلے کی اتنی اہمیت نہیں جتنی اس بات کی ہے کہ شا نے اس کا تانا بانا مکالموں، اور صرف مکالموں سے تیار کرکے اور

اس ڈرامے کو کامیاب کر کے ناشروں اور منیجروں کے خلاف کاروباری جنگ جیتی ہے۔ "جنیوا" بھی اسی قسم کا ڈرامہ ہے۔ ایسے ڈرامے وہ کافی طویل وقفوں کے بعد کبھی کبھی لکھتے رہے۔

چوتھی قسم میں "سیزر اور قلو پطرہ" "سینٹ جون" "قسمت کا دھنی" (Man of Destiny) جیسے ڈرامے شامل ہیں۔ جولیس سیزر پر شا سے پہلے اور شا کے زمانے میں کئی ڈرامے لکھے گئے۔ لیکن اس کے باوجود شا نے اس تاریخی کردار پر قلم اُٹھایا۔ کیونکہ وہ اس کردار کے گرد افسانوی ہالہ نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ اور دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ انہیں اپنے فلسفے اور اپنے نظریات کے لیے سینٹ جون، نپولین بوناپارٹ اور سیزر کے ایسے بنے بنائے کردار مل گئے جن میں وہ خیر و شر کی صفات کو تاریخی کرداروں کی شکل میں دکھا سکتے تھے "رومانس اور جذباتیت" کے خلاف تاریخی کرداروں کو اُبھار سکتے تھے، خدا اور ضمیر کے مسئلہ پر روشنی ڈال سکتے تھے۔ اور مستقبل کے فوق البشر کی تعبیر کے لیے ماضی کا خواب پیش کر سکتے تھے۔

اِن کا سیزر۔ وہ ہیرو ہے جو سستی جذباتیت سے پاک ہے۔ جنگ اور تباہی کے غلیظ تصور سے دل برداشتہ ہے۔

مصر کو فتح کرنے میں اس کا جذبۂ اقتدار کام نہیں کر رہا ہے۔ بلکہ بہتر نظام کی تخلیق اسے حرکت دیتی ہے۔ وہ انتقام کا دشمن ہے۔ اور 'خون کے بدلے خون' کے اصول کا سخت مخالف۔ وہ عورتوں سے محبت کر سکتا ہے لیکن ان کا شکار نہیں بن سکتا۔ اس کے اعصاب پر "عورت سوار نہیں ہوتی" جنس کا تصور اس کے

نزدیک صرف بہتر نسل پیدا کرنے کی حد تک ہوتا ہے۔ اور ان صفات نے اسے عام انسانوں سے برتر۔ شا کا ہیرو بنا دیا ہے۔

جولیس سیزر مصر کے تاریخی پیکر ابو الہول کو دیکھ کر پکارتا ہے۔

"اوہ ابوالہول! میں ایک ایک ملک گھومتا پھرا، صحراؤں اور بیابانوں کو پار کیا۔ دریا عبور کیے، لیکن مجھے اپنا جیسا ایک وجود کبھی نہیں ملا۔ ابوالہول ــ تو اور میں، اگرچہ باقی کائنات کے لیے بالکل اجنبی ہیں، لیکن ہم ایک دوسرے کے لیے اجنبی نہیں ہیں"

یہ جملے سیزر ــ شا کے ہیرو کی زبان سے نکلے ہیں، لیکن شا کی آوازیں کیونکہ شا اپنے نظریات میں انہی صفات کو ابھارتے رہے ہیں۔ اسی طرح "سینٹ جون" میں جب جان آف آرک سے پادریوں، ججوں اور سرکاری افسروں کی عدالت میں سوال کیا جاتا ہے کہ یہ آوازیں جو تجھے اندرونی طور پر سنائی دیتی ہیں، خدا کی آواز نہیں ہو سکتیں، یہ شیطان نے تیرے دماغ میں پھونک دی ہیں یا پھر خود تیرے مجرم ضمیر کی آوازیں ہیں۔ تو وہ اس پر اصرار کرنے کے باوجود کہ یہ آواز خدا کی آواز ہے، ایک بار پوچھتی ہے ــ "اچھا اگر یہ خود میرے ہی ضمیر کی آواز ہے تو کیا غلط ہے؟"

یہاں ضمیر، اندرونی آواز اور خدا کا مسئلہ ہے جس کی توضیح کے لیے شا نے سینٹ جون کے تاریخی کردار سے کام لیا۔ اور یہ بتایا کہ انسان کا اپنا ضمیر، اپنا کردار اور اپنی کامن سنس (عام سوجھ بوجھ) بھی خداوندی اوصاف سے کچھ کم اہم نہیں ہے اور ان میں امتیاز بھی دشوار ہے۔

"سینٹ جون" کے تاریخی کردار "جان آف آرک" سے شا نے صرف اتنا ہی مقصد حاصل نہیں کیا بلکہ اس میں مسیحیت کے نام پر حکمرانوں کے ظلم وجبر کی داستان بھی سنائی ہے اور بتایا ہے کہ کس طرح صاحب کردار اور جری لوگوں کو مذہب (مسیحیت) اور حکومت کی چکّی کے دو پاٹ پیستے رہے ہیں اور انصاف کے نام پر ناانصافی، امن کے نام پر جنگ اور پاکیزگی کے نام پر انتہائی خود غرضی برتی گئی ہے۔

"Androcle's & the lion" میں شا نے اسی تصویر کا دوسرا رُخ، بلکہ وہی رُخ دوسری روشنی میں دکھایا ہے۔ ایک سماج تھا جس میں مسیحیت کے حامیوں، مبلغوں اور مسیحیوں پر ستم توڑے جاتے تھے۔ کیونکہ مسیحیت کا کردار وہاں یہ ہے کہ وہ دولتمندوں اور صاحبان اقتدار کے خلاف پروپگنڈہ کرتی ہے، جبر و ظلم کے خلاف نفرت کرنا سکھاتی ہے۔ اور اسی لیے صاحبان اقتدار اس مذہبی تحریک کو کفر قرار دیتے ہیں۔

شا کے ڈراموں کو جانچنے کے لیے یہ میکانکی تقسیم کافی نہیں ہے۔ جانچنے کا طریقہ دوسرا ہے۔ اس کے لیے یہ دیکھنا ہوگا کہ کس دور میں سیاسی حالات کیا تھے، اور خود شاہ اس خاص دور میں کن حالات سے گزر رہے تھے۔ اور دونوں کا شا کے ذہن پر اور ان کے ڈراموں پر کیا اثر پڑا۔ لینن نے شا کے متعلق لکھا تھا۔ "ایک اچھا آدمی 'فے بین' لوگوں میں پھنس گیا" اس جملے کی تفسیر کرتے ہوئے مارکسی نقاد الک ویسٹ نے شا کے تمام ڈراموں، ناولوں اور اہم کتابچوں کا جائزہ لیا ہے۔ اور دکھایا ہے کہ شا کے ڈرامے اپنے مقصد میں

کس طرح سماجی اور سیاسی درجۂ حرارت کے ساتھ بڑھتے گھٹتے گئے ہیں اور کن کن منازل سے گزرے ہیں۔ ان کی سطح پر جو "فے بین ازم" نظر آتا ہے اس کی تہہ میں سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف کیسا لاوا دبا ہوا ہے اور اس لاوے کا منھ شا کس طرح بند کر دیتے ہیں۔

مختصر طور پر:

شا نے پہلا ڈرامہ "رنڈووں (لاوارثوں) کی بستی" ۱۸۸۵ء میں لکھنا شروع کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب شا بحیثیت ناول نگار ناکام ہو چکے تھے۔ ان کی اقتصادی حالت خستہ تھی اور مستقبل غیر یقینی۔ وہ سیاسی جد و جہد میں عملی طور پر اور بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے، چنانچہ اس ڈرامے میں سرمایہ دارانہ نظام کی اندرونی غلاظت کے خلاف نفرت اور غصے کی آگ تیز ہے لیکن اس آگ پر فے بین ازم کا چھڑکاؤ بھی ہو رہا ہے جس نے ڈرامے کو پوری آنچ تک پہنچنے سے روک لیا۔ اگر اس کا ہیرو (ڈاکٹر ٹرینچ) احمق اور دبّو ہونے کے بجائے ذہین، ذی فہم اور دلیر ہوتا، اگر اس کے سامنے صرف یہی دو راستے نہ ہوتے کہ سارٹوریس کے روپیے کو قبول کرے یا اس سے انکار کر دے، بلکہ یہ دو راستے ہوتے کہ سرمایہ داری نظام کو قبول کرے یا اس کے خلاف جنگ چھیڑ دے — تو یہ ڈرامہ کہیں زیادہ طاقتور ہوتا، جواب نہیں ہے"

"ناگوار ڈراموں" میں شا کوشش تو کرتے ہیں کہ سرمایہ داری نظام اور اس کے استحصال کے خلاف نفرت اور غصے کی آگ تیز کریں" لیکن ان کے (ان تمام) ڈراموں میں "فے بین ازم" کی یہ کمزوری موجود ہے کہ مزدور طبقہ جو سرمایہ داری کا

مقابلہ کرتا ہے، اسے قابلِ اعتنا ہی نہیں سمجھا گیا"

شا کو "جتنا گناہ جتا دینے کی فکر ہے اتنی اس کی فکر نہیں کہ نئی زندگی کی تحریک کریں کیونکہ وہ گناہ سے بچ نکلنے کی راہ نہیں دکھلاتے"

اس کے بعد وہ دور آتا ہے جب شا اپنی اقتصادی بنیاد مضبوط کر چکے تھے (۱۸۹۸ء میں انہوں نے ایک دولتمند عورت سے شادی بھی کر لی تھی) اور دنیا پر جو معاشی بحران طاری تھا اس کا زور بھی ٹوٹ چکا تھا۔ یہ زمانہ ۱۸۹۴ء سے ۱۹۰۵ء تک ہے۔ جس میں خوشگوار ڈرامے اور "پیوریٹن لوگوں کے لیے ڈرامے" لکھے گئے۔ ان میں وہ شدت نہیں بلکہ ندی کے بہاؤ جیسا ہلکا ماحول، پرامن ترقی اور اطمینان کی کیفیت طاری ہے۔ مثلاً "ہتھیار اور انسان" "کیپٹن براس باؤنڈ کی تبدیلی" اور "تم کبھی نہیں کہہ سکتے"۔ اور "بشر اور فوق البشر" جس میں شا نے وہ نفرت اور غصے کا چڑھتا ہوا پارہ بالکل ہی ٹھنڈا کر دیا ہے۔ جنس، نسل کشی اور قوتِ حیات کے علاوہ شا ایک ایسی عورت کے کردار میں پھنس کر رہ گئے ہیں جسے شوہر گرفتار کرنے کے سوا کوئی کام نہیں۔ ہیرو جسے اُنھوں نے سوشلسٹ کہہ کر پکارا ہے، ایک ایسا کردار ہے جس کا سوشلزم "شرفا" پر اور ان کی اخلاقی قدروں پر چند جملے کس دینے کے سوا کچھ نہیں کرتا۔

اب ان کی نظر میں "سماج طبقاتی جدوجہد سے آگے نہیں بڑھتا بلکہ ایسی اندرونی قوت کی کارکردگی سے آگے بڑھتا ہے جو تمام طبقوں میں اور ہر فرد میں اپنا کام کر رہی ہے"۔ وہ سماجی ترقی کی جدوجہد کے ساتھ جینے اور مرنے والوں کو آئڈلسٹ اور خیال پرست کہتے ہیں اور ان کو اپنے "حقیقت پسند" کرداروں

کے سامنے ناکام دکھاتے ہیں۔

"کنڈیڈا" اس دور کے شروع میں اور "میجر باربرا" اس دور کے آخر میں لکھا گیا۔ "کنڈیڈا" کے متعلق شا کہتے ہیں کہ وہ 'مادر مریم' کی علامت ہے اور کوئی نہیں۔ جو ایک طرف سوشلسٹ مسیحی مبلغ اور دوسری طرف سرمایہ دار باپ کو لڑتے دیکھتی ہے اور مادرانہ شفقت کے ساتھ دیکھتی رہتی ہے۔ دوسری طرف وہ ایسی بیوی ہے جو طاقتور، محافظ اور باعزت شوہر کے ساتھ رہ جاتی ہے اور نوجوان شاعر کو چلا جانے دیتی ہے۔ یہاں ایک طرف سوشلسٹ کا کردار مسخ ہوا ہے کہ وہ خود تو تقریریں جھاڑتا پھرتا ہے اور بیوی سے اور دوسروں سے اپنی ان تھک خدمت لیتا ہے۔ دوسری طرف وہ عورت ہے جس کا تصور لوئر درا سماج کی عام بیوی کا جیسا ہے۔

"میجر باربرا" جنگ بوئر کے خاتمے کے بعد اور پہلے سوشلسٹ انقلاب کے وقت کا ڈرامہ ہے۔ جس میں انہوں نے ایک طرف سرمایہ دار کو اتنی عظمت دی ہے کیونکہ وہ اس بنیادی حقیقت کو سمجھ گیا ہے کہ "تمام برائیوں اور تمام جرائم سے بڑا جرم غریبی ہے" اور ہمارا سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ "غریب نہ ہوں"۔

لیکن غریبی کو دور کرنے کی راہ بتلانے کے بجائے شا نے غریب کرداروں کو اپنے لیے روپیہ کمانے کی ترغیب دی ہے۔ یونانی ادب کا غریب پروفیسر کروڑپتی انڈرشغنٹ کے کارخانے کا وارث بن جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ "شاعر اور روحوں کو نجات دلوانے والے اس سرمایہ داری کاروبار کو سرمایہ داری کے خاتمے کے لیے کیسے استعمال کرینگے؟ (جب کہ وہ خود اسی اصول سے

بندھے ہوئے ہیں)

"شا کو اپنے خیالات سے خود ہی ڈر لگتا ہے۔ مثلاً گزنس جب ہتھیاروں کے کارخانے کو سنبھالتا ہے تو کہتا ہے:" میں دنیا کے لیے طاقت تیار کرنا چاہتا ہوں" شا اس ڈرامے کے دیباچے میں بھی کہتے ہیں کہ تاریخ کا سبق یہ ہے کہ لوگوں کے ہاتھ میں طاقت ہونی چاہیے۔ لیکن نہ اپنے ڈرامے اور نہ اس کے دیباچے میں شا اس حقیقت کا سامنا کرنے کو تیار ہیں کہ وہ مزدور طبقہ ہے جس کے ہاتھ میں سرمایہ دار طبقے کے خلاف طاقت ہونی چاہیئے۔

شا نے اس اطمینان اور فارغ البالی کے دور میں" سرمایہ داری سے سمجھوتے اور سچے یا جھوٹے نصب العین کے لیے لڑنے والوں کا مذاق اڑانے کی جو پالیسی اختیار کی یہ نتیجہ ہے ان کے "فے بین ازم" کی منطق کا اور اس کا کہ سوشلزم کا جو خواب انہوں نے دیکھا تھا اس سے ان کی امید ٹوٹ گئی"۔

لیکن اسی کے ساتھ سطح کے نیچے، سرمایہ دار طبقے کی زر پرستی، مذہبی اداروں کا دولتمندوں کے سہارے جینے، لوگوں کو محض روحانی نجات کے نعروں سے چپکائے رکھنے اور غریبی کے مسئلے کو نظر انداز کر دینے کی نقاب ہٹانے میں شا نے کمال فن کا مظاہرہ بھی کیا ہے۔

"یہ اپنے تصور کی وسعت میں ایک زبردست ڈرامہ ہے۔ اس میں شا کی وہ بصیرت نہایت موثر انداز میں اور پر زور طریقے سے ظاہر ہوئی ہے کہ سرمایہ داری نظام انسان کے باہمی تعلقات کو گرا کر صرف روپیے کے معاملے تک پہنچا دیتا ہے"

۱۹۰۶ء کے بعد سے شا کے ڈرامے "انارکزم" (نراجی ذہنیت) کو زیادہ ابھارنے لگے۔ سائنس کے مقررہ اور مسلمہ اصولوں پر حملہ۔ سائنس، علم طب، علم ہیئت (Astrology) کی تحقیقات کا تمسخر۔ اور صرف یہ تعلیم کہ رسم اور دستور کی پابندی سے خود کو آزاد کراؤ۔ ان ڈراموں میں نہ کوئی سنجیدہ فکر ہے، نہ گہرائی اور گیرائی مثلاً "فینی کا پہلا ڈرامہ"۔ "بے جوڑ پن" یا "شادی کی گئی" (۱۹۰۸ء) - (پگمیلین اس سے کسی قدر مستثنیٰ ہے)

اس کے بعد ۱۹۱۷ء کا انقلاب روس آیا تو "شا کا جو ابتدا میں سوشلزم پر اعتماد تھا۔ اور ان کی ڈرامہ نگار والی بصیرت جو سماج میں ماضی اور مستقبل کی قوتوں کا ٹکراؤ دیکھتی تھی، اس اعتماد اور اس بصیرت میں پھر سے جان پڑی۔ ان کے ڈراموں میں پھر وہی تناؤ اور شدت کی کیفیت نظر آنے لگتی ہے جو ان کی ابتدائی تصنیفات میں فے بین نظریے اور ان کی بصیرت کے درمیان موجود تھی۔ یہاں پھر ڈرامہ نگار فے بین (تحریک کے ماننے والے) سے بڑا اور غالب تر دکھائی دیتا ہے ....."

چنانچہ "سینٹ جون" اسی زمانہ کا لکھا ہوا ہے اس میں اگرچہ اسی پر زور دیا ہے کہ انسان کو ہر فرض ٹھکرا دینا چاہیے سوائے اس کے جس کی طرف اندرونی آواز پکارتی ہے۔ صرف اپنے ضمیر کی آواز مستند ہے۔ لیکن قانون اور چرچ کے مشترکہ مظالم کے خلاف بہت طاقتور پکار بھی ہے۔ یہ فکری تضاد شا کے ہاں باقی رہتا ہے۔

"شا کی تصانیف میں اس کی جمالیاتی (فنی) اور سیاسی کمزوریاں ضرور

مان لینی چاہئیں۔ ان دونوں کی جڑ ایک ہی ہے، یہ کہ وہ اس قوت سے الگ تھلگ رہے جو مستقبل کو تعمیر کرنے والی ہے۔ یعنی سوشلزم کی مزدور تحریک۔ لیکن تنہا شا پر ہی ذمہ داری نہیں آتی۔ ان کا اس طرح بے تعلق رہنا برطانیہ کی لیبر تحریک کی تاریخ کا ایک حصہ ہے" (الک ویسٹ)

شا کے ڈراموں میں جمالیاتی اور فن کارانہ حسن اور کمزوریوں کے بارے میں بھی بہت کچھ کہا گیا ہے۔ اور اس پر اتفاق رائے بھی بڑی حد تک ہے۔

شا کے ڈراموں میں عبارت کا حسن بڑا موثر حربہ ہے۔ وہ عبارت میں بناؤ سنگار کا خیال نہیں کرتے اور اسی بے تکلفی سے اس کا حسن نکھرتا ہے۔ خود اپنے طرزادا کے بارے میں شا کا خیال ہے کہ

"صحیح معنوں میں طرزادا صرف طرزادا کی خاطر کبھی پیدا نہیں ہوتا۔۔ ۔۔۔ وہ شخص جسے کسی بات پر زور نہیں دینا ہے اس کا کوئی طرز اور خاص اسلوب (اسٹائل) نہیں ہوسکتا اور نہ کبھی ہوتا ہے۔ اور وہ شخص جسے کسی نکتے پر زور دینا ہے، وہ طرزادا کی قوت کے ساتھ اتنی دور چلتا چلا جائیگا جہاں تک اس کی اہمیت اور اس کے اعتقاد و یقین کی قوت لے جائیگی۔ ایک بار یہ یقین اور وہ نکتہ جس پر زور دیتا تھا، غلط ثابت کردو۔ (وہ ختم ہوجائیگا) لیکن طرزادا اور خاص اسلوب (پھر بھی) باقی رہیگا۔۔۔"

قطعاً یہی الفاظ شا کے ڈراموں کے طرز پر صادق آتے ہیں۔ انہیں اپنے نظریات پر زور دینا تھا، ان کا اپنا طرز بنتا چلا گیا۔ وہ نظریات بدلتے رہے لیکن جو طرزادا بن چکا تھا، وہ ختم نہیں ہوا۔

شا کے ڈراموں میں عبارت کی رفتار اتنی تیز ہوتی ہے کہ بعض اوقات جملوں کے جوڑ کا پتہ نہیں چلتا۔ اور روانی میں طرزِ تحریر بھی طرزِ تقریر معلوم ہوتا ہے (اس کی حقیقت وہ لوگ سمجھ سکتے ہیں جو شا کے طرزِ تقریر کی عالم گیر شہرت اور مقبولیت سے واقف ہیں)

ایک اور کمال جو ان کی تحریر میں ملتا ہے وہ ہے جسے ان کے کئی ناقدوں نے "اچانک حملہ" کا نام دیا۔ وہ بات اس پہلو سے کرتے ہیں جس پہلو کا سننے والے کو گمان بھی نہیں ہوتا۔ (مثلاً "کنڈیڈا" میں ٹائپسٹ لڑکی اور پادری جینن کی گفتگو یا انڈر یو انڈر شفٹ کے برجستہ جوابات۔ (میجر باربرا میں)

ایک بات جو بار بار ان کے ڈرامائی کرداروں کے بارے میں کہی گئی ہے بالکل صحیح ہے کہ شا ایک زبان کے بجائے دس زبانوں سے بولتے ہیں یعنی ان کے ڈرامے دلچسپ، خیال افروز اور فکر انگیز مباحثے ہیں۔ جن میں ایک ایک مسئلے کے دونوں پہلو پیش کیے جاتے ہیں، اگرچہ جس پہلو سے انہیں ہمدردی نہیں ہوتی وہ اسے ضرورت سے زیادہ گہرا بھی دیتے ہیں۔ مثلاً یونانی ادب کے پروفیسر کے جوابات انڈر شفٹ کے مقابلے میں کسی خبط الحواس کی گفتگو معلوم ہوتی ہے۔

ان کے ڈراموں کی اسی خصوصیت سے یہ پہلو بھی وابستہ ہے کہ شا کے ڈراموں میں اول تو ایکشن ہوتا نہیں اور اگر ہوتا بھی ہے تو ڈرامے کے پلاٹ سے نہیں اُبھرتا بلکہ اچانک کہیں سے ٹوٹ پڑتا ہے۔ تاکہ حاضرین چونک پڑیں کہ وہ ڈرامہ دیکھ رہے ہیں۔ لیکچر کے کمرے میں بیٹھے ہوئے دو فریقوں کی بحث نہیں سُن رہے ہیں۔

شا کے ڈرامے کی یہ کمزوری ان کی ذاتی زندگی اور ان کے اپنے مذاق کی نمائندگی کرتی ہے۔ (دیکھیے حالاتِ زندگی)

جس طرح ایکشن اور کوئی حرکت کوئی سرگرمی، کوئی جسمانی حادثہ خود ڈرامے سے نہیں اُبھرتا بلکہ غیر متعلق طریقے پر کہیں اور سے نازل ہو جاتا ہے، اسی طرح ان کے اکثر اہم کردار ناگہانی اپنا رُخ بدل لیتے ہیں۔ یہ رُخ ڈرامے کے اندر کسی منطق کا نتیجہ نہیں ہوتا، بلکہ منطقی نتیجے سے گریز کرنے کا نتیجہ ہوتا ہے اور پورے ڈرامے کی روح سے بالکل غیر متعلق۔ مثلاً پہلے ڈرامے کے آخری سین میں بلاّ بچے کا کمرے میں داخل ہو کر ڈاکٹر ٹریج کو ترغیب دینا، ڈرامے کی تمام کڑیوں سے الگ ایک حرکت ہے۔ جو شا نے صرف اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے یہاں لا کر جوڑ دی ہے۔

پھر ان کے بعض ڈرامے ٹکنک اور مقصد کے ٹکراؤ میں ایسے اُلجھے ہیں کہ خیال کی اصل لائن ہی غائب ہو گئی ہے۔

مثلاً "بشر اور فوق البشر" میں ہیروئن کا کردار کچھ اس طرح تراشا گیا ہے کہ دیکھنے اور پڑھنے والوں کی نظر سے ڈرامہ کا مقصد اوجھل ہو جاتا ہے۔ شا کو بعض ڈراموں کے متعلق اس کمزوری کا احساس تھا۔

"بشر اور فوق البشر" کے متعلق کہتے ہیں کہ میں نے اس میں کامیڈی کی فضا قائم کی تھی لیکن اسٹیج پر کامیڈی کو الگ کر دینے سے "اس کا اثر گھوم پھر کر ایسا ہوا کہ کسی شخص نے اس نئے مذہب کا احساس ہی نہیں کیا جو اس ذہنی بھنور کے درمیان رکھا ہوا تھا۔

"مسز وارن کا پیشہ" اور ایسے ہی دوسرے ڈراموں سے جو اثر وہ حاضرین یا ناظرین پر ڈالنا چاہتے تھے، وہ بالکل نایاب ہے۔ "میں دیکھتا ہوں کہ جب خالص جذبات کا کوئی ڈرامہ جسے دلچسپ نوکیلے انداز کے ساتھ پیش کیا جائے، میں پیش کرتا ہوں اور ایک کمرے میں چنے ہوئے چند لوگوں کو سُناتا ہوں تو اس کا اثر بے پناہ ہوتا ہے" لیکن عام لوگوں کے مجمع میں جب وہ اسٹیج پر دکھایا جاتا ہے تو اس کا سارا مزا کرکرا ہو جاتا ہے۔

"میجر باربرا" میں اُنھوں نے انڈر شفٹ کا کردار ایسا پیش کیا ہے کہ حاضرین عجب مخمصے میں پھنس جاتے ہیں کہ وہ اس کردار کی تعظیم کریں یا اس سے نفرت۔ نہ تو اسے 'حرصِ دولت' پر ذلیل کیا گیا ہے، نہ اسے 'میئر مین کے عہدے کا اُمیدوار' بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ کرداروں کا یہ دوُر خا پن دراصل شا کی بصیرت اور ان کے فلسفے کی کشمکش کا نتیجہ ہے۔

ان فنی پہلوؤں کے باوجود شا کے ڈراموں نے عہد حاضر کے ڈرامے کی تاریخ بنائی ہے۔ اور نیا انداز بیان، نئی ٹکنک اور نئی روح دے کر ڈرامے کو اس کی پچھلی منزل سے آگے بڑھایا ہے۔

چند اہم ڈرامے

جن کا صرف ڈھانچہ اور اہم مکالمے لیے گئے ہیں

رنڈوؤں (لاوارثوں) کی بستی

یہ ڈرامہ ۱۸۹۲ء کے قریب لکھا گیا، جب شا کی عمر چھتیس[۳۶] برس کی ہوگی۔ جیسا کہ اس کے دیباچہ میں خود شا نے بتایا ہے کہ یہ ڈرامہ سوسائٹی کے مفلوج عناصر کو بے نقاب کرنے کی کوشش ہے۔ نکتہ یہ ہے کہ سوسائٹی کا ڈھانچہ اس قسم کا ہے کہ مفلوج عناصر اور بے کام کاج کیے ناجائز کمائی کھانے والے لوگ اس میں ایک پرزے کی طرح فٹ ہیں۔ مشین چلتی رہتی ہے، پرزے اپنا کام کرتے رہتے ہیں۔ اور بے ارادہ کرتے رہتے ہیں۔ اس طبقے میں جن لوگوں کی آنکھوں پر سے پردہ ہٹتا ہے وہ بھی دم نہیں مار سکتے اور خود اس کا شکار بنے رہتے ہیں۔

ڈرامے میں تین ایکٹ ہیں :۔

پہلا ایکٹ

۱۸۸۰ء اگست کا مہینہ ہے۔ دریائے رائن کے کنارے ہوٹل کے کھلے منظر سے ڈرامہ شروع ہوتا ہے۔ چائے کی میز پر دو[۲] انگریز سیاح آ کر بیٹھتے ہیں۔ ڈاکٹر ہیری ٹرنچ اور مسٹر ولیم کوکین۔ پہلے کی عمر چوبیس سال کے قریب ہوگی، دوسرے کی عمر اندازاً پچاس سال۔ دونوں دوست ہیں۔ کوکین ایک گرگ باراں دیدہ، ہوشیار شخص ہے، اور مسافری کے عالم میں وہ دوست

سے زیادہ ایک تجربہ کار مشغوق کا رول ادا کرتا ہے۔

فوراً ہی ایک اور باوقار معزز اور دولتمند عمر رسیدہ انگریز مسٹر سارٹوریس اپنی نوجوان خوبصورت بیٹی بلانچے کے ساتھ اسی ہوٹل میں آکر قیام کرتا ہے۔ وہ بھی سیر و سفر اور تبدیلی آب و ہوا کی غرض سے آیا ہے۔ ان کی معمولی جان پہچان جہاز میں ہی ہو چکی تھی۔ یہاں باقاعدہ تعارف ہو گیا۔ لیڈی روکسیڈل کا ذکر آتا ہے جو ڈاکٹر ٹرنچ کی خالہ ہے۔ مسٹر سارٹوریس، لیڈی روکسیڈل سے خوب واقف ہیں کیونکہ وہ بھی ان کی طرح لندن کی ایک دولتمند اور صاحب جائداد خاتون ہیں۔

تعارف کے بعد مسٹر سارٹوریس اور مسٹر کوکین دریا کے کنارے کا ایک مشہور تاریخی گرجا گھر دیکھنے چلے جاتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ان کے رفیق سفر ڈاکٹر ہیری ٹرنچ اور مس بلانچے بھی پیچھے پیچھے آجائیں گے لیکن وہ دونوں بیٹھے رہتے ہیں۔ کیونکہ ڈاکٹر ٹرنچ اس موقعے سے فائدہ اٹھا کر لڑکی سے جان پہچان بڑھانا چاہتا ہے۔

بات سے بات نکلتی ہے۔ دونوں تعارف سے آگے کی منزل تک طے کر لیتے ہیں۔ ڈاکٹر ٹرنچ مس بلانچے کو بوسہ دیتا ہے۔ جس کے فوراً بعد وہ پوچھتی ہے ـــ "ہماری شادی کب ہوگی"

"جیسے ہی پہلا گرجا گھر سامنے آئیگا"

ابھی اختلاط اور چھیڑ چھاڑ ہو ہی رہی تھی کہ کوکین اور سارٹوریس واپس آگئے اور دونوں نے اس باہمی اختلاط کے منظر کو دیکھا۔

ٹرینچ اور بلانچے نے سب کچھ قبول دیا، اور اس کا اظہار بھی کر دیا کہ دونوں شادی کر لینگے۔ بلانچے کا باپ سارٹوریس ذرا محتاط آدمی ہے۔ اس نے کہا کہ ڈاکٹر۔ جب تک تمہارے معزز رشتہ دار اور ذمہ دار لوگ باقاعدہ اس رشتے کی تحریری منظوری نہ دیں، میں اس رشتے کا فیصلہ نہیں کر سکتا۔ چنانچہ ڈاکٹر ٹرینچ کی درخواست پر مسٹر سارٹوریس کی خواہش اور انہی کے الفاظ کے مطابق ایک خط لیڈی روکسیڈل کو لکھا جاتا ہے۔ کوکین اس خط کی عبارت خوب سنبھال کر لکھتا ہے جس میں مسٹر سارٹوریس کے اصرار پر یہ بھی ذکر کر دیا گیا ہے کہ لڑکی صاحب جائداد باپ کی بیٹی ہے اور ایک نہایت شریف النسل خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ نسبی شرافت اور دولت کے لفظوں پر خاص طور سے زور دیا گیا ہے تاکہ رشتے کی منظوری حاصل کرنے میں دشواری نہ ہو۔

دوسرا ایکٹ

وہی سال ستمبر کا مہینہ، سارٹوریس کا مکان، پڑھنے کا کمرہ۔ باپ اور بیٹی بیٹھے ہوئے ہیں۔ باپ اُمیدوار داماد کا خط پڑھتا ہے اور بیٹی کو اطلاع دیتا ہے کہ ڈاکٹر ہیری ٹرینچ اس رشتہ کے متعلق آخری فیصلہ کرنے کے لیے آ رہا ہے۔ عجب نہیں جو چند منٹ بعد وہ اسی کمرہ میں ہو۔

لیکن دیکھو بلانچے! جب تک مجھ سے گفتگو نہ ہو لے اس وقت تک تم ڈاکٹر سے مت ملنا"

"ہرگز نہیں — بھلا میں ایسا سوچ سکتی ہوں کہیں"

اتنے میں مسٹر سارٹوریس کا ملازم اطلاع دیتا ہے کہ آپ کا کرایہ گھانے والا ایجنٹ لِک چیز آیا ہے۔ لک چیز اندر بلا لیا جاتا ہے۔

"سلام صاحب"

مسٹر سارٹوریس نے بڑے تیکھے اور سخت لہجے میں جواب دیا۔ "سلام"

لک چیز نے جیب سے روپوں کی تھیلی نکالتے ہوئے دبی آواز میں کہا "آج صبح کی کوئی خاص خبر نہیں حضور۔ ابھی ابھی مجھے ڈاکٹر ٹرنچ سے تعارف حاصل کرنے کی عزت حاصل ہوئی ہے"۔

(ناراضگی کے ساتھ نظر اٹھاتے ہوئے) سارٹوریس: "اچھا یہ بات؟"

"جی ہاں جناب والا۔ ڈاکٹر ٹرنچ نے مجھ سے آپ کے دولت خانے کا راستہ پوچھا اور مہربانی فرماتے ہوئے مجھے اپنی گاڑی میں ہی بٹھا لائے"۔

"تو پھر وہ کہاں ہیں؟"

"وہ اپنے دوست کے ساتھ تھے۔ میں نے انہیں بڑے کمرے میں چھوڑا ہے۔ میرے خیال میں وہ مس بلانچے سے گفتگو کر رہے ہیں"

سارٹوریس کی خفگی بڑھ گئی۔

سارٹوریس "میں سمجھتا ہوں تم نے ان سے باتیں بھی کی ہونگی؟"

لِک چیز "جی ہاں۔ راستے میں"

سارٹوریس "تم دو بجے کی گاڑی سے کیوں نہیں آئے؟ (سختی کے ساتھ)"

لِک چیز "جی ــــ میں نے سوچا کہ ــــ"

سارٹوریس "بس۔ اب برداشت سے باہر ہو چکا ہے۔ تم نے کیا سوچا،

اب اس کی فکر نہ کرو۔ لیکن میرے کام کو آئندہ کبھی اس طرح مت ٹالنا۔ یہ بتاؤ سینٹ جائلز کے مکانوں میں اور کچھ گڑبڑ تو نہیں ؟"

لک چیز "صفائی کا انسپکٹر روبن گلی کے مکان نمبر ۱۳ کے متعلق شکایت کر رہا تھا۔ وہ کہنے لگا کہ میں اس معاملہ کو میونسپلٹی کے سامنے رکھونگا"

سارٹوریس "تم نے اُسے بتایا نہیں کہ میں بھی میونسپلٹی کا ممبر ہوں ؟"

"جی ــــ بتا تو دیا تھا"

"پھر وہ کیا بولا"

"کہنے لگا کہ ہاں معلوم ہے۔ انہیں اس طرح زبردستی قانون توڑنے کی جرات کیوں ہوتی ہے۔ صاحب، اس نے جو کہا، وہ میں نقل کر رہا ہوں"

سارٹوریس "اچھا ــــ تو تمہیں اس کا نام معلوم ہے ؟"

لک چیز "جی حضور ــــ اس کا نام ــــ اسپیکمین"

"دیکھو۔ صحت کمیٹی کا آئندہ جو جلسہ ہونے والا ہے، اس تاریخ کے صفحے پر انسپکٹر کا نام میری ڈائری میں لکھ دو۔ میں مسٹر اسپیکمین کو میونسپل ممبروں کے متعلق اس کے فرائض اچھی طرح سکھا دونگا"

سارٹوریس اپنے ایجنٹ پر کافی دھونس جما لینے کے بعد وصولیابی کی رقم اور حسابات کا مطالبہ کرتا ہے۔ رقم اور حسابات پیش کرتے وقت معلوم ہوا کہ ایک پونڈ چار شلنگ کی رقم کم ہے۔ یہ رقم مکان نمبر ۱۳ کا ایک ٹوٹا ہوا زینہ درست کرانے میں صرف ہو گئی۔ سارٹوریس پھر بگڑتا ہے۔ تو اس کے غصے کو ٹھنڈا کرنے کے لیے لک چیز کہتا ہے کہ پادری صاحب کہتے ہیں زینہ

اتنا خراب ہے کہ اسے تڑوا کر پتھر کا زینہ اس کی جگہ بنوا دینا چاہیے۔
سارٹوریس" دیکھو، میں انگریز ہوں۔ میں کسی پادری کو اپنے کاروبار میں دخل نہیں دینے دونگا۔ (ایک دم وہ لک چیز کی طرف مڑتا ہے) دیکھو مسٹر لک چیز سال بھر میں یہ تیسری مرتبہ ہے کہ تم نے ایک پونڈ سے زیادہ رقم مرمت پر لگا دی۔ میں نے بار بار تمہیں خبردار کیا کہ ان جھونپڑیوں کو تم ویسٹ اینڈ (دولتمند علاقے) کے محل نہ سمجھو۔ اور کئی بار میں تمہیں سمجھا چکا تھا کہ میرے معاملات پر غیروں سے کوئی گفتگو مت کیا کرو۔ لیکن تم نہیں مانے۔ میرے احکام کی خلاف ورزی تم نے بار بار کی۔ میں تمہیں برخاست کرتا ہوں"

"حضور —— یہ کیا؟ یہ نہ کہیے"

"نہیں —— تم نکال دیے گئے"

لِک چیز" بہت اچھا، سارٹوریس صاحب۔ بہت زیادتی کی بات ہے خیر۔ جو کچھ بھی ہو۔ دنیا میں کوئی آدمی بھی ان مفلسوں بدمعاشوں (کرایہ داروں) سے اتنا کرایہ وصول کر کے نہیں لا سکتا جتنا میں آپ کے لیے مرکھپ کر لایا ہوں۔ اور جتنا میں نے خرچ کم کر رکھا ہے اتنا کوئی اور نہیں کریگا۔ میرے ہاتھ اس غلاظت میں اتنے گندے ہو چکے ہیں کہ وہ کسی اچھے کاروبار کے قابل نہیں رہے۔ اور اب آپ مجھی کو نکال رہے ہیں ——"

سارٹوریس" کیا مطلب —— غلاظت میں ہاتھ گندے —— خبردار اگر میں نے ایسا کوئی لفظ سنا۔ اگر تم قانون کی حد سے ذرا آگے بڑھے تو یاد رکھنا

خود تمہیں سزا کرا دونگا۔ ہاتھوں کو پاک رکھنے کا صرف ایک طریقہ ہے کہ اپنے مالک اور آقا کو خوش رکھو۔ آئندہ اس اصول کو اچھی طرح یاد رکھنا۔"

اتنے میں کوکین اور ٹرنچ کی آمد کی اطلاع ہوتی ہے۔ دونوں اندر بلا لیے جاتے ہیں۔

کوکین مصافحہ کرنے کے بعد مسٹر سارٹوریس کے مکان کی اور خاص طور پر کمرے کی تعریف کرتا ہے۔

"آپ یہاں ان کتابوں کی فضا میں بہت خوش رہتے ہونگے۔ کتنا ادبی ماحول ہے"

سارٹوریس "مگر میں نے تو کبھی انہیں اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ بلانچے کی چیز ہیں یہ۔ کبھی کبھی اس کا جی چاہتا ہے تو اٹھا کر پڑھ لیتی ہے۔ میں تو اس گھر کو صرف اس لیے پسند کرتا ہوں کہ سامنے قبرستان ہے۔ آج کل موتوں کا تناسب بہت کم ہے۔"

ڈاکٹر ہیری ٹرنچ اپنی خالہ لیڈی روکسیڈل کے خطوط پیش کرتا ہے۔ جن میں اس رشتے پر مبارکباد دی جاتی ہے۔ سارٹوریس بہت مطمئن ہے۔ اور مہمانوں کو کمرے میں چھوڑ کر بیٹی کو علاحدگی میں اطلاع کرنے چلا جاتا ہے (حالانکہ وہ پہلے سے ہی باخبر ہو چکی ہے)

لِک چیز اس تنہائی سے فائدہ اٹھا کر دونوں دوستوں کو التجا کے ساتھ خطاب کرتا ہے۔ انہیں ہوش بھی نہ تھا کہ لِک چیز بھی اس کمرے میں موجود ہے۔ وہ بہت عاجزانہ انداز سے ان دونوں کے درمیان آتا ہے اور گھبراہٹ اور

پریشانی کے لہجے میں ڈاکٹر ٹریج سے درخواست کرتا ہے۔

"جناب والا۔ معاف کیجیے گا، میں آپ ہی سے عرض کر رہا ہوں۔ آپ سیٹھ صاحب سے میرے متعلق دو ایک لفظ کہنے کی مہربانی فرمائینگے کیا؟ انہوں نے مجھے ابھی برخاست کر دیا ہے۔ مجھے چار بچوں کا پیٹ پالنا پڑتا ہے۔ اگر آج کی مبارک ساعت میں آپ ایک دو لفظ میری سفارش میں فرما دیں تو شاید سیٹھ صاحب مجھے پھر بحال کر دیں"

ڈاکٹر ٹریج: دیکھو، مسٹر لک چیز (ذرا جھجکتے ہوئے) میں اس معاملہ میں کیسے دخل دے سکتا ہوں۔ مجھے افسوس ہے کہ میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔

لک چیز کے دوبارہ اصرار پر وہ پھر کہتا ہے کہ مسٹر سارٹوریس بہت شریف اور نہایت معقول شخص ہیں۔ اور ایسے معاملات کو زیادہ صحیح طریقے سے جانچ سکتے ہیں۔ میں ان سے تمہارے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکونگا۔

لک چیز معذرت کرتے ہوئے پھر اصرار کرتا ہے کہ کم از کم اُسے تمام حالات سنانے کا موقعہ ضرور دیا جائے تاکہ وہ بتا سکے کہ نوکری سے برخاست ہوتے میں خود اس کا کوئی قصور نہیں ہے۔ اور پھر بیان کرنا شروع کرتا ہے کہ

"میں نے یہ روپیہ وہاں سے جمع کیا ہے جہاں کوئی ایجنٹ کم گھائی کرنے والا ٹینیم روپیہ وصول نہیں کر سکتا۔ اور یہ مجھے اس کا انعام ملا ہے۔ یہ جو میز پر روپیوں کی تھیلی پڑی ہے۔ ذرا اس پر نظر کیجیے۔ بچے بھوک سے بلکتے رہیں اور ان روپیوں میں سے ایک ایک پیسے کی روٹی خرید کر ان بھوکے بچوں کا

پیٹ بھرا جاتا۔ لیکن میں نے نہیں چھوڑا اور وصول کر لایا۔ کسی نہ کسی طرح زور زبردستی سے، ہوشیاری سے روپیہ نکال ہی لیا۔ میں ۔۔۔ دیکھیے، میرے محترم میں کافی تجربہ کار ہو چکا ہوں۔ لیکن اس کے باوجود اگر مجھے اپنے بھوکے بچوں کا پیٹ بھرنے کی فکر نہ ہوتی تو میں کبھی یہ روپیہ وصول نہ کرتا۔ میں اپنے بال بچوں کی خاطر یہ سب کر رہا ہوں۔ اور صرف اس قصور پر کہ ایک ایسے ٹوٹتے ہوئے زینہ کو درست کرنے کے لیے میں نے ۲۴ شلنگ خرچ کر دیے جس سے تین عورتیں زخمی ہو چکی ہیں مجھے نوکری سے الگ کر دیا گیا۔ اگر وہ زینہ اور کچھ دن یونہی چھوڑ دیا جاتا تو سیٹھ صاحب پر جیو ہتیا کے الزام میں مقدمہ چلتا۔ اور وہ میری بات نہیں سنتے اگرچہ میں اس کے لیے بھی تیار ہوں کہ وہ چاہیں تو میری حقیر تنخواہ سے یہ روپیہ کاٹ لیں میں یہ ۲۴ شلنگ بھرنے کو تیار ہوں بشرطیکہ آپ میری سفارش میں دو لفظ سیٹھ صاحب سے کہہ دیں۔

"اچھا تو تم وہ روپیہ چھین لاتے ہو جس سے بھوکے بچوں کا پیٹ بھرا جاتا۔ تب تو تمہارے ساتھ جو ہوا ٹھیک ہوا" ڈاکٹر ٹریچ نے کہا۔ اُسے غصّہ آیا کہ یہ شخص ظلم و جبر کے کاروبار میں ہاتھ گندے کرتا ہے اور اس لیے سارٹوریس سیٹھ نے اسے برخاست کر دیا۔ لِک چیز گھبرا جاتا ہے اور پھر پوزیشن صاف کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

"کیا آپ سمجھتے ہیں کہ سیٹھ صاحب نے مجھے اس لیے نکال دیا کہ میں سختی کرتا ہوں۔ جی نہیں جناب والا۔ مجھے اس لیے برخاست کر دیا گیا ہے کہ میں اور زیادہ سختی کیوں نہیں کرتا۔ میں نے آج تک ان کے مُنہ سے یہ لفظ نہیں سُنا کہ وہ اتنی سختی سے مطمئن ہیں۔ اگر میں کرایہ داروں کی کھال کھینچ لاؤں تب بھی

وہ مطمئن نہیں ہونگے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ وہ لندن کے مکانداروں اور صاحب جائداد لوگوں میں سب سے بُرے ہیں۔ کچھ لوگوں کے مقابلے میں وہ زیادہ بُرے نہیں ہو سکتے۔ لیکن ہاں یہ ضرور ہے کہ بدترین قسم کے مالکانِ مکان سے جہاں تک مجھے واسطہ پڑا ہے ہمارے سیٹھ صاحب کچھ اچھے نہیں ہیں اور آج تک اُنہوں نے جتنے منیجر رکھے ہونگے ان میں بہترین منیموں اور بہترین ایجنٹوں سے بھی زیادہ اچھا کام میں کرتا ہوں۔ بس میں یہی کہونگا۔ جو شخص ان مکانات کی نوعیت کو جانتا ہے وہ کبھی گمان نہیں کر سکتا کہ میں وہاں سے کتنا زیادہ روپیہ وصول کرلاتا ہوں اور کتنا کم ان پر خرچ کرتا ہوں۔۔۔"

ڈاکٹر ٹرینچ نے مکانات کی نوعیت پوچھ ہی لی۔۔ "کس قسم کے مکانات ہیں؟"

لک چیز۔۔ "کرایے کے جھونپڑے ہیں۔ ہفتہ وار کرایے پر دیے جاتے ہیں۔ ایک ایک آدھا آدھا کمرہ کے حساب سے۔ اور بعض تو چوتھائی کمرے کے حساب سے۔ جب آپ کو معلوم ہو کہ کس طرح انہیں کرایے پر اٹھایا جائے تبھی روپیہ وصول ہو سکتا ہے۔ اگرچہ پہلو (کیوبک) فٹ کے حساب سے جگہ تقسیم کر کے کرایہ پر اٹھائی جائے تو اندازہ یہ ہے کہ اتنا کرایہ وصول ہوتا ہے جو پارک لین کے (دولت مند علاقے میں) محلوں سے بھی وصول نہیں ہو سکتا"۔

"جہاں سیٹھ صاحب کے پاس چند سو پونڈ جمع ہوئے وہ فوراً پرانے شکستہ مکان خرید لیتے ہیں۔ ایسے غلیظ مکان جنہیں آپ ناک پر رومال رکھے بغیر دیکھنا گوارا نہیں کرینگے۔ سینٹ جائلز میں، میرل بون میں، بھتنل گرین

میں، ہر جگہ ان کی جائداد بس ایسے ہی مکانات ہیں۔ ذرا ان کی اپنی رہائش دیکھیے اور پھر آپ اس کا مفاد سمجھ جائینگے، انھیں موتوں کے تناسب ہیں کمی پسند ہے، اور خود قبرستان کی زمین پر رہنا پسند کرتے ہیں۔ ذرا آپ میرے ساتھ روبن گلی میں چلیے۔ وہاں کی زمین اور وہاں موتوں کا تناسب آپ کو دکھاؤنگا۔ میں آپ کو دکھا سکتا ہوں۔ اور پھر سوچیے کہ میں ہی ہوں جو ایسی جگہ سے روپیہ پیدا کرکے ان کے لیے لاتا ہوں۔ وہ خود کبھی اپنا کرایہ وصول کرنے نہیں جا سکتے۔ کبھی نہیں"

ٹرینچ "تو تمہارا مطلب ہے کہ مسٹر سارٹوریس کی تمام جائداد، ان کی تمام آمدنی اسی قسم کی چیزوں سے ہے؟"

لِک چیز "جی ہاں۔ اس کا ایک ایک پیسہ جناب والا"

ٹرینچ جذبات سے بے قابو ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔

کوکین (ذرا جز بز ہو کر اپنے دوست پر نظر ڈالتا ہے) اُف، میرے دوست۔ یہ روپیہ کی محبت ہی ہے جو تمام خرابیوں کی جڑ ہے۔

کوکین۔ ٹرینچ کا رفیق سفر اور دوست اس ایجنٹ کو شرمندہ کرنے کے لیے کہتا ہے۔ تمھیں ایسا پیشہ اختیار نہیں کرنا چاہیے، یہ بہت برا ہے۔ لک چیز جواب دیتا ہے "اس سے بھی برے پیشے موجود ہیں اور یہ اُن سے زیادہ برا نہیں ہے۔ مجھے کسی نہ کسی طرح اپنے بال بچوں کا پیٹ بھرنا ہی ہے"

کوکین "بجا کہا۔ تو اسی طرح ہمارے محترم مسٹر سارٹوریس کا معاملہ ہے۔ انھیں اپنی بیٹی سے جو محبت ہے اور اس کی جو ذمہ داری ان پر ہے اُسے بھی تو کسی

طرح انہیں پورا کرنا ہی ہوتا ہے"
لک چیز "جی ہاں جناب ۔ وہ ایک خوش قسمت لڑکی ہے ۔ نہ جانے کتنی اور لڑکیاں اپنے گھروں سے بے گھر کر کے سڑکوں پر پھینک دی گئیں صرف اس لیے کہ سیٹھ کو اپنی بیٹی سے جو محبت ہے اور جو ذمہ داری ہے وہ پوری کی جاسکے ۔
اب آپ دیکھتے ہیں ۔ یہ ہے کاروبار ۔ اسے کہتے ہیں بزنس —"

اور پھر لک چیز درخواست کرتا ہے کہ ڈاکٹر ٹرینچ اپنے ہونے والے خسر سے اس کی ملازمت کے لیے سفارش کر دے ۔

ٹرینچ "ہرگز نہیں (غصے کے ساتھ اٹھتے ہوئے) شروع سے آخر تک یہ نہایت گندا کاروبار ہے ۔ ایسے کاروبار میں ہاتھ بٹانے کے جرم میں تمہاری بھی سزا ہونی چاہیے ۔ ہسپتال میں جو باہر کے مریض دوا لینے آتے ہیں ، ان میں سڑے ہوئے مکانات میں رہنے کی وجہ سے) میں روزانہ گندی بیماریاں دیکھتا ہوں اور یہ سوچ کر میرا خون کھول جاتا ہے کہ اس مصیبت کا کوئی علاج نہیں ہو سکتا"

اس پر لک چیز طعنہ دیتا ہے کہ جب آپ سارٹوریس کی صاحبزادی سے شادی کریں گے تو آپ کو بھی اس گندے کاروبار کی آمدنی سے حصہ ملیگا ۔

کوکین "ایک شریف و معزز آدمی سے بات کرنے کا یہ طریقہ نہیں ہوتا ۔ زبان سنبھالو مسٹر لک چیز ۔ یہ بہت انقلابی جذبہ دکھا رہے ہو تم"

لک چیز "غالباً — آخر دن گلی جیسی گندی جگہ میں طریقے اور آداب تھوڑی سکھائے جاتے ہیں ۔ ہفتے دو ہفتے وہاں جا کر آپ روپیہ وصول کیجیے ، بلکہ میں تو نا اہل ہوں آپ میری ہی جگہ آکر تجربہ کر سکتے ہیں ، اور وہاں آپ سیدھی اور

کھری گفتگو سننے کے عادی ہو جائینگے"۔

کوکین ۔تمہیں معلوم ہے،تم کس سے بات کر رہے ہو؟ بھلے آدمی!"

لک چیز" (بے پروائی سے) جی ہاں ۔میں بہت اچھی طرح واقف ہوں کہ کس سے بات کر رہا ہوں ۔آپ اور آپ جیسے ایک ہزار کی بھی مجھے کیا پرواہ؟ میں غریب آدمی ہوں ۔ اس سے بڑھ کر اور کیا عیب ہوگا ۔میرا آپ کو کیا خیال ہو سکتا ہے ۔میرے لیے اگر آپ لوگ دو لفظ کہہ دینگے تو اس سے آپ کو کیا فائدہ؟ (لیکن فوراً ٹرینچ کے قریب جھکتے ہوئے) صاحب! صرف ایک لفظ کہہ دیجیے میرے بارے میں ۔اس میں آپ کا کچھ نہیں بگڑیگا ۔(اسی دوران میں سارٹوریس دروازے میں داخل ہوتا ہے) صاحب! سفارش کر دیجیے غریبوں کا کچھ تو خیال کیجیے"۔

لک چیز اور ٹرینچ مسٹر سارٹوریس کو دیکھ کر خاموش ہو گئے ۔تھوڑی دیر بعد سارٹوریس نہایت دوراندیشی کے ساتھ کوکین کو اپنے ساتھ لے کر باہر ٹہلنے چلا گیا ۔ اور لک چیز کو برخاستگی کا حکم دوبارہ سنا کر روانہ کر دیا گیا ۔

مس بلانچے تنہائی پا کر کمرے میں آ گئی ۔ اور اس نے ڈاکٹر ہیری ٹرینچ سے بے تکلفی جتانے کے لیے چونچلے شروع کر دیے ۔لیکن ہیری متفکر ہے ۔ فکرمندی کا سبب نامعلوم ۔

بہت اصرار کے بعد اس نے بلانچے سے صاف صاف کہہ دیا کہ میری آمدنی صرف سات سو پونڈ سالانہ ہے ۔ اور میں چاہتا ہوں کہ شادی کے بعد تم اسی قلیل رقم میں گزر بسر کرو ۔میں تمہارے دولتمند باپ سے کوئی وظیفہ اور

کسی قسم کی مالی امداد نہیں لینا چاہتا۔

بلا پنچے دولت کے انبار میں کھیل کر جوان ہوئی ہے، وہ اس تصور سے پریشان ہو جاتی ہے اور پوچھتی ہے کہ:

"تمہیں ابھی آدھ گھنٹہ پہلے تو (میرے باپ کی دولت میں شریک ہونے سے) کوئی انکار نہ تھا۔ جب تم مجھ سے بڑے کمرے میں ملے اور تم نے مجھے رشتہ کی منظوری کے خطوط دکھائے (تو تمہیں کوئی اعتراض نہ تھا) تمہارے خاندان والوں کو بھی اس پر کوئی اعتراض نہیں۔ پھر تمہیں کیا اعتراض پیدا ہو گیا؟

اور جب وہ پھر بھی اپنی ضد پر قائم رہتا ہے تو بلا پنچے سمجھتی ہے کہ ڈاکٹر خود ہی اس سے شادی نہیں کرنا چاہتا اور اس لیے روپیہ نہ لینے کو انکار کا بہانہ بنا رہا ہے۔

تلخ کلامی ہوتی ہے اور بلا پنچے غصے میں کہہ دیتی ہے کہ اب چاہے کچھ بھی ہو وہ ٹرنچ سے شادی نہیں کریگی۔ شور ہوتا ہے، ردوقدح ہوتی ہے۔ اور بلا پنچے بگڑ کر چلی جاتی ہے اور ڈاکٹر کو بھی دھتکار دیتی ہے۔

اتنے میں مسٹر سارٹوریس اور ٹرنچ کے دوست کوکین، دونوں آگئے۔ ٹرنچ کے غصے کو ٹھنڈا کیا گیا اور سارٹوریس نے نہایت منطقی انداز میں پوچھنا شروع کیا کہ اسے اپنے ہونے والے خسر سے روپیہ لینے میں کیا اعتراض ہے؟ اور اگر اسے اعتراض ہے تو ہو۔ لیکن وہ اپنی بیٹی کی آسائش کی خاطر روپیہ دیگا۔ کیونکہ وہ ہمیشہ کھلے دل سے خرچ کرنے اور عیش کرنے کی عادی رہی ہے جس کے

بغیر اس کی زندگی جہنم بن جائیگی۔

ٹرینچ اس روپیے کو قبول نہ کرنے کی وجہ بتا دیتا ہے۔

"مجھے آج ہی آپ کے آدمی کی زبانی معلوم ہوا۔ کیا نام ہے کم بخت کا، لک چیز، اس نے بتایا کہ آپ کی ساری دولت اس بدقسمت مخلوق کی مٹھی سے نکل کر آتی ہے جس کے پاس جسم وروح کو جوڑنے رکھنے کے لیے بھی کافی پیسے نہیں ہوتے۔ اور یہ روپیہ زور زبردستی، چالاکی اور طرح طرح کی چالبازی اور دھمکیوں سے حاصل کیا جاتا ہے۔ اور روپیہ وصول کرنے کے لیے نہایت گھٹیا قسم کی زیادتیاں کی جاتی ہیں"

سارٹوریس پورے قضیے کا سبب معلوم ہونے پر اطمینان کا سانس لیتا ہے اور قائل معقول کرنے کے انداز میں گفتگو شروع کرتا ہے۔

"میں گفتگو کی ابتدا کے لیے پہلے تو یہ فرض کیے لیتا ہوں کہ ڈاکٹر ٹرینچ، آپ سوشلسٹ نہیں ہیں۔ یا اسی قسم کا کچھ اور عقیدہ نہیں رکھتے"

"جی! بالکل نہیں۔ میں تو قدامت پرست (کنزرویٹو) ہوں۔ اگر میں کبھی ووٹ دینے جاتا تو کنزرویٹو امیدوار کو ووٹ دیتا۔ اور دوسروں کے خلاف کنزرویٹو کی تائید کرتا"

"خیر یہاں تک ہم دونوں متفق ہیں" اور اب استدلال سارٹوریس کی طرف سے شروع ہوتا ہے۔

"میرے نوجوان دوست! یہ جو مفلس و قلاش لوگ ہیں انہیں اتنی تمیز نہیں ہوتی کہ معقول مکانوں میں کس طرح رہا جائے۔ ہفتے بھر میں وہ سب

توڑ تاڑ کر برابر کر دینگے۔ اگر آپ کو شبہ ہو تو تجربہ کر دیکھیے میرے مکانات میں جہاں جہاں سے شہتیر، زینے پر پکڑ کر چڑھنے کی لکڑیاں، چمنیوں کے ڈھکن، کوڑہ خانہ کے برتن وغیرہ غائب ہیں وہ آپ اپنے خرچ سے ایک بار درست کرا دیجیے تین دن نہیں گزرینگے کہ وہ پھر غائب ہو جائینگے۔ بلکہ جناب ان کا ایک ایک تنکا ایندھن بن چکا ہوگا۔ میں ان مفلس قلاش لوگوں پر الزام نہیں دھرتا۔ انہیں ایندھن کی ضرورت ہوتی ہے اور اکثر ایندھن حاصل کرنے کی بس یہی صورت ان کے سامنے رہ جاتی ہے۔ لیکن میں اس کے لیے ہرگز تیار نہیں ہوں کہ مرمت کرانے میں پونڈ پر پونڈ خرچ کرتا چلا جاؤں اور وہ غائب ہوتا چلا جائے، جب کہ مجھے کرایہ میں ہفتہ بھر کا صرف چار، چھ پنس فی کمرہ وصول ہوتا ہے، جو لندن میں باقاعدہ مناسب کرایہ ہے۔ نہیں، نہیں۔ بندہ نواز۔ سن لیجیے، جب لوگ اس درجہ غریب ہوں تو آپ ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتے چاہے آپ ان سے کتنی ہی ہمدردی کیوں نہ رکھتے ہوں.........

آگے چل کر ایسی ہمدردی سے انہیں بہ نسبت فائدے کے نقصان زیادہ پہنچتا ہے۔ میں اسے بہتر سمجھتا ہوں کہ روپیہ بچا کر بے گھروں کے لیے گھر بنوا دوں....." ..... اور ہاں ڈاکٹر ٹرنچ، معاف کیجیے گا کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کی آمدنی کہاں سے آتی ہے؟

ٹرنچ ــــ "(ذرا کڑے تیور کے ساتھ) سود سے آتی ہے۔ ایسے مکانوں سے نہیں آتی۔ جہاں تک اس معاملے کا تعلق ہے میرے ہاتھ گندگی سے دور ہیں۔ ایک رہن کا سود مجھے ملتا ہے"

سارٹوریس۔ "(زور دے کر) ہاں وہ میری جائداد ہے جو رہن رکھی ہے اور جس کا سود آپ کو پہنچتا ہے۔ آپ ہی کے الفاظ ادا کرتے ہوئے میں کہونگا کہ جب میں ان لوگوں سے زور زبردستی، اچال، ہوشیاری اور دباؤ سے وہ رقم وصول کرتا ہوں جس کی ادائگی اُنھوں نے اپنے ذمہ خود ہی لی ہے، تو اس وصول کیے ہوئے روپیے کا ایک پیسہ بھی میں اس وقت نہیں چھوتا جب تک کہ اس میں سے آپ کے سات سو پونڈ سالانہ ادا نہ کردوں۔ لک چیز جو کام میرے لیے انجام دیتا ہے وہ میں آپ کے لیے انجام دیتا ہوں۔ وہ اور میں، ہم دونوں بیچ کے آدمی ہیں۔ اصل منافع خور تو آپ ہیں۔ اپنے کرایہ داروں کی غربت کی وجہ سے جو خطرہ میں اپنی رقم پر لیتا ہوں اس کی بدولت آپ میری جائداد سے سود وصول کرتے ہیں۔ اور سود بھی کتنی زبردست شرح پر — سات فیصدی سود مجھے ادا کرنا ہوتا ہے، جس کی وجہ سے میں مجبور ہوتا ہوں کہ اپنے کرایہ داروں سے زیادہ وصول کروں۔ پھر بھی ڈاکٹر ٹرینچ آپ نے اس جگہ کے سلسلے میں کبھی ہاتھ نہیں ہلایا ہوگا اور میرے بارے میں آپ تحقیر کے ساتھ الفاظ ادا کرتے ہیں جب کہ میں نے اپنی جائداد کے انتظام پر روپیہ بھی لگایا، اپنی محنت بھی استعمال کی اور دور اندیشی اور ہوشیاری سے بھی کام لیا اور اسے انہی معقول ذرائع سے اب تک چلا رہا ہوں"

ٹرینچ "تو کیا آپ کا مطلب یہ ہے کہ میں بھی اتنا ہی بُرا اور قابل الزام ہوں جتنا آپ؟"

سارٹوریس "جب آپ یہ الفاظ ادا کرتے ہیں تو اگر آپ کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ بھی میری طرح سے سوسائٹی کی صورت حال کو بدلنے میں بے بس اور لاچار ہیں تو بدقسمتی سے آپ بالکل صحیح فرماتے ہیں"

بحث میں ٹرینچ قائل ہو جاتا ہے۔ وہ گندے مکان نہ سہی لیکن روپیہ تو ٹرینچ کا بھی شامل ہے۔ چاہے ٹرینچ کو علم رہا ہو یا نہیں، لیکن دونوں کے ذرائع آمدنی مجرمانہ ہیں۔ چنانچہ سارٹوریس اسے قائل کرتے ہوئے پھر اصرار کرتا ہے کہ وہ اپنی ہونے والی بیوی کو باپ سے روپیہ لینے پر اعتراض نہ کرے "اب آپ کو بلانچے پر یہ اعتراض نہ ہوگا کہ وہ میری دولت میں حصہ بٹائے جب کہ میں اسے آپ کی دولت میں حصہ لینے سے نہیں روکتا"

ٹرینچ نے اپنی ناراضگی پر معافی چاہی اور اس حقیقت کا قائل ہو گیا کہ سماج کے اس حمام میں ہم سب ننگے ہیں۔

لیکن اب نقشہ بدل چکا ہے مس بلانچے اتنی برہم ہے کہ اس نے باپ سے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ ایسے "احمق نوجوان" سے شادی نہیں کریگی۔

سارٹوریس "اچھا تو پھر تیس برس سے زیادہ عمر کے مرد سے شادی کرنا چاہیئے..."

اس کے بعد مجبوراً ٹرینچ اور کوکین سے کہہ دیا جاتا ہے کہ سارٹوریس کی بیٹی اس رشتے کے لیے آمادہ نہیں ہے۔ اور آج تک جتنے تحفے رازدارانہ طور پر اسے دیے گئے تھے وہ کھلے عام واپس کر دیے جاتے ہیں۔

تیسرا ایکٹ

لندن کے ایک ممتاز علاقے میں سارٹوریس کا مکان۔ سردی کا موسم ہے۔ آتشدان میں آگ گرم ہے۔ باپ بیٹی کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اسے صحت برقرار رکھنے کے لیے انگلینڈ سے باہر سفر پر جانا چاہیے۔ بیٹی باہر جانے سے انکار کرتی ہے، بحث ہو رہی ہے کہ خادمہ آکر مسٹر لک چیز کے اندر آنے کی اجازت چاہتی ہے۔

"کون لک چیز؟ وہی جو میرا کام کیا کرتا تھا؟"

"جی ہاں، وہی۔ لیکن اب آپ اُسے مشکل سے پہچانینگے"

سارٹوریس "(غصے سے) ہاں۔ بھوکا مرتا ہوگا اب۔ بھیک مانگنے آیا ہوگا"

خادمہ "نہیں حضور ــ او ــ وہ تو بالکل معزز آدمی نظر آرہا ہے۔ قیمتی زرق برق اُورکوٹ میں ہے، حضور۔ داڑھی مونچھ صاف۔ بہت بن ٹھن کر آیا ہے۔ یقیناً اُسے کہیں سے دولت ہاتھ لگی ہے حضور۔

لک چیز اندر بلا لیا گیا۔ اس کا تو حلیہ ہی بدل چکا ہے۔ اس شان سے وہ آکر بیٹھا گویا وہ اس گھر میں ایک قابل احترام مگر بے تکلف مہمان ہو۔ سارٹوریس کے پرانے لب و لہجے کو رد کرتے ہوئے وہ گفتگو شروع کرتا ہے۔

سارٹوریس۔ اِدھر سنو۔ زیادہ اکڑو نہیں میں ایک دوست کی حیثیت سے تمہاری جیب میں روپیہ ڈالنے آیا ہوں۔

سارٹوریس پھر بھی اپنی اکڑ پر قائم ہے لیکن لک چیز کے لباس، چہرے

مہرے،، بناؤ سنگار اور آزادانہ طرز گفتگو نے سارٹوریس کو جھکا ہی لیا۔ اور اس نے روپیہ بنانے کی اسکیم تفصیل سے بیان کرنی شروع کی۔ اس نے بتایا کہ ہم لوگوں نے ایک آئسنڈ مٹن ڈپو کمپنی قائم کی ہے جو پرانے اور خستہ مکانات خرید لیتی ہے۔ گورمنٹ کو اپنی عمارتیں بڑھانے اور نئی سڑکیں نکالنے کے لیے زمین کی ضرورت ہے، چنانچہ یہ زمین ہم اسے اچھا معاوضہ لے کر دے ڈالینگے اور جن لوگوں سے ہم مکان خریدینگے وہ اس روپیے سے نئے اچھے اونچی قیمتوں والے مکانات تعمیر کرا کے کرایہ پر اُٹھا سکتے ہیں۔

گفتگو سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مسٹر سارٹوریس ان مکانوں کو کمپنی کے ہاتھ بیچ کر کم تعداد میں اچھے مکان بنوالیں اور جب نئی سڑک نکالی جائیگی تو ان اچھے مکانوں کا اچھا معاوضہ بھی مل جائیگا۔ اس طرح آم کے آم اور گٹھلیوں کے دام۔ البتہ زمین کی مالکہ لیڈی روکسیڈل کی رضامندی ضروری ہے تاکہ فروخت کی گفتگو ہو سکے اور سودے میں جو تھوڑا سا خطرہ درپیش ہو اسے بھی برابر کی رضامندی سے اُٹھا لیا جائے۔

سارٹوریس "اگر ڈاکٹر ہیری ٹرنچ (جس کے پاس مکانات رہن ہیں) اسکیم میں میرے ساتھ شریک ہو جائے تو میں پھر اس کا دوست بن سکتا ہوں۔"

اتنے میں مسٹر لک چیز اپنی آسامی ڈاکٹر ہیری ٹرنچ اور اس کے دوست کوکین کو لیے ہوئے چلے آتے ہیں۔ رسمی مزاج پرسی کے بعد سب لوگ ایک میز کے گرد بیٹھ جاتے ہیں۔ لک چیز کی طرف سے کوکین پوری اسکیم ڈاکٹر ٹرنچ کے ذہن نشین کر رہا ہے۔

ٹرینج "جیسا کہ میں سمجھا ہوں روبن گلی کے مکانات گرائے جائینگے تاکہ اسٹرینڈ کی طرف جانے کے لیے نئی سڑک بنائی جائے۔ اور اس لیے عمارتوں کا معاوضہ طلب کرنے کا سوال آتا ہے ...... معلوم ایسا ہوتا ہے کہ جگہ جتنی زیادہ گندی ہوگی اتنا ہی زیادہ کرایہ وصول ہوگا اور جگہ جتنی زیادہ صاف ستھری اور عمدہ ہوگی، معاوضہ اتنا ہی زیادہ ملیگا۔ چنانچہ زیادہ معاوضہ کی خاطر ہمیں گندگی ختم کر دینا ہے اور صفائی اور عمدگی پیدا کرنا ہے۔ یہی نا؟"

سارٹوریس "مگر میں اسی بات کو اس طریقے پر پیش کرنا پسند نہیں کرتا"

سارٹوریس کہتا ہے کہ ویسے بھی مکانات کی حالت بہت خراب ہے۔ اور ان کے بجائے اچھی عمارتیں موجود ہیں ان کا اچھا معاوضہ نہیں ملیگا۔

پھر لک چیز دونوں حریفوں کو قائل کرتے ہوئے کہتا ہے کہ موقعہ کو غنیمت سمجھیے۔ اچھے علاقے میں نئی عمارت بنوالو۔ اور جو خستہ حالت میں باقی عمارتیں رہ جائیں وہ مناسب شرائط پر ہماری کمپنی کو دے دو۔ دو سال کے اندر ان کے گرائے جانے کا فیصلہ ہو جائیگا۔ اور آپ کو آج کی حالت کے مقابلے میں دگنا معاوضہ مل جائیگا۔ کیونکہ معاوضہ دیتے وقت وہ رقم بھی لگائی جائیگی جو آپ ان عمارتوں کی بہتری پر صرف کر چکے ہونگے۔

۔ اگر آپ نے موقعہ ہاتھ سے نکل جانے دیا تو یہ شکستہ عمارتیں تھوڑے عرصے میں یونہی گرادی جائیں گی۔

ٹرینج "مگر مسٹر سارٹوریس۔ آپ میرے بغیر اسی اسکیم پر عمل کیوں نہیں کر لیتے۔ مجھے اس میں کیا کرنا ہے۔ میرے پاس تو عمارتیں صرف رہن ہیں (روپیہ دینے والے

کی حیثیت سے)

سار ٹورنیس" معاوضے کے معاملے میں ذرا سا خطرہ بھی ہے۔ فرض کیجیے میونسپل کونسل نقشہ بدل دے اور اس زمین سے سڑک نہ نکالے۔ اگر ایسا ہوا تو عمارتوں کو بنوانے میں جو روپیہ لگایا جائیگا وہ ضائع ہو جائیگا۔ بالکل ہی برباد ہو جائیگا۔ ہو سکتا ہے کہ ہم ان خستہ مکانوں کی جگہ جو نئی عمارتیں بنوائیں گے وہ کرایے پر نہ اُٹھ سکیں اور برسوں یونہی پڑی رہیں۔ لیکن آپ تو اپنا سات فیصدی سود مانگ لیں گے۔"

ٹرینچ" آدمی کو آخر زندہ تو رہنا ہی ہے۔"

لک چیز" دیکھیے۔ ڈاکٹر ٹرینچ، وہ جو غریبوں کے لیے آپ کے دل میں جذبات تھے وہ کیا ہو گئے؟ جب پہلی بار میں نے آپ سے ان مکانات کے بارے میں ذکر کیا تھا تو آپ کو کیسا شاق گزرا تھا؟ اور اب آپ سنگدلی پر آمادہ ہیں کیا؟"

ڈاکٹر ٹرینچ بھی ترکی بہ ترکی جواب دیتا ہے کہ تم ہی وہ لوگ ہو جو کہتے تھے کہ جذباتی ہونے سے کام نہیں چلتا، اور اب تم ہی روپیہ بنانے کے لیے مجھے غریبوں کی ہمدردی یاد دلاتے ہو۔ ہرگز نہیں۔ میرا سود مجھے ملنا چاہیے۔ باقی جو تمہارا جی چاہے، کیے جاؤ۔

سار ٹورنیس۔" اچھا تو کوئی فکر نہیں مجھے۔ ڈاکٹر ٹرینچ آپ جیسے چاہیں فیصلہ کر لیجیے۔ میں کہیں اور سے روپیہ قرض لے کر آپ کو بے باق کیے دیتا ہوں۔ اور چونکہ آپ کوئی خطرہ مول لینے کو تیار نہیں ہیں اس لیے آپ اپنے دو ہزار پونڈ

سرکاری فنڈ میں لگا دیجیے وہاں سے آپ کو ڈھائی سو پونڈ ماہوار سود ملتا رہیگا"۔
سار ٹوریس نے بتایا کہ اگر وہ قرض لیگا تو اسے دو ہزار پونڈ پر سات سو پونڈ سالانہ سود دینا ہی پڑیگا، لیکن اب تک اس نے ڈاکٹر ٹرنچ کو اس لیے بے باق نہیں کیا کہ میں سمجھتا تھا آپ سے دوستانہ برتاؤ جاری رکھوں" بلکہ کچھ دن تو میں سوچتا رہا کہ شاید ہم دونوں کا مفاد دوستی سے بھی زیادہ قریبی رشتوں میں گندھ جائے"۔

اس جملے پر فوراً لک چیز نے تجویز پیش کی کہ تو پھر کیوں نہ ڈاکٹر ٹرنچ کی مس بلانچ سے شادی ہو جائے۔ انہیں سات سو پونڈ سود بھی ملتا رہیگا اور یہ روپیہ بنانے کی اسکیم بھی پوری ہو جائیگی۔
سار ٹوریس سودے بازی میں بیٹی کا معاملہ نہیں کرنا چاہتا لیکن لک چیز سمجھاتا ہے کہ صرف تمہارا تنہا کا معاملہ نہیں ہے، ہماری بھی بیٹیاں ہیں۔ اگر تمہاری بیٹی رضا مند ہو تو اس میں تمہارا اور ڈاکٹر ٹرنچ دونوں کا فائدہ ہے۔
یہ کہہ کر سار ٹوریس، کوکین اور لک چیز آخری بات کرنے کے بہانے دوسرے کمرے میں چلے جاتے ہیں اور وہاں سے بلانچ کو بھیج دیتے ہیں ٹرنچ تنہا رہ گیا ہے۔ سامنے پیانو پر بلانچ کی حسین تصویر نظر آتی ہے۔ وہ بڑھتا ہے اور آغوش پھیلا دیتا ہے۔ خاموش، بے حس و حرکت تصویر سے اظہارِ محبت ہو ہی رہا ہے کہ پیچھے کے دروازے سے مس بلانچ خود اس منظر کو دیکھ لیتی ہے، اور فوراً ڈاکٹر کے قریب آجاتی ہے۔
"کیوں پھر آگئے تم؟ — بڑے ذلیل نکلے کہ پھر تم اس گھر میں موجود ہو؟"

وہ جانا چاہتا ہے بلاینچے راستہ روک لیتی ہے ۔ اور تیوروں سے ظاہر کردیتی ہے کہ یہ سب تلخ باتیں دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے کی جارہی ہیں ورنہ ڈاکٹر ٹریخ کو قبول کرنے میں اُسے کوئی اعتراض نہیں ۔

— "ابھی ابھی، جب تم اپنے تصور میں تنہا تھے تو میرے فوٹو سے کیا اشارے کررہے تھے ؟ ...." "تمہیں یہ جرأت کیسے ہوئی کہ تم میری کسی چیز کو چھیڑو ؟"

تھوڑی دیر یونہی تلخ انداز میں ناز و نیاز ہوتا رہا ۔ اتنے میں دوسرے کمرے سے لوگوں کے آنے کی آہٹ ہوئی ۔ بلاینچے سے رسمی مزاج پرسی کے بعد لک چیز نے پھر ڈاکٹر ٹریخ سے سوال کیا — کہیے ، تو کیا فیصلہ کیا آپ نے ؟

ٹریخ "(سارٹوریس سے)" "میں تیار ہوں ۔ معاوضہ ملے ، یا نہ ملے ، میں اس کاروبار میں شریک ہوں" (دونوں ہاتھ ملاتے ہیں)

خادمہ رات کا کھانا تیار ہونے کی اطلاع دیتی ہے اور سب لوگ خوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے کھانے کے کمرے کی طرف چل دیتے ہیں ۔ لک چیز کا بازو سارٹوریس کے گرد لپٹا ہوا ہے ۔

ختم

کینڈیڈا

چار خوشگوار ڈراموں میں دوسرا ڈرامہ
۱۸۹۵ء

زمانہ اکتوبر ۱۸۹۴ء ۔ مقام لندن کے متوسط طبقے کی آبادی کا علاقہ جس کی تصویر شا کے لفظوں میں یہ ہوتی ہے کہ

"چوڑی چوڑی سڑکیں ۔ بے شمار گھنی آبادی، جس میں سہولت کے لیے لوہے کے بدصورت بدنما پیشاب خانے (موتریاں) ریڈیکل کلب، ٹرام لائنیں پھیلی ہوئی جن میں ہمیشہ ہر وقت پیلی گاڑیوں کی قطار لگی رہتی ہے ۔ شاہراہوں پر سبزہ لگے ہوئے پائیں باغ، جنہیں انسان کے پاؤں نے کبھی پامال نہیں کیا سوائے اتنے محدود راستے کے جو دروازے سے ہال تک جاتا ہے ۔ میلوں تک ایک نہایت بے رحم اور تھکا دینے والی یکسانیت اور بے رنگی ہے جس میں اینٹوں کے بھدے بدنما مکانات، سیاہ لوہے کی پٹریاں ہیں، پتھر کے فٹ پاتھ ہیں، سپاٹ پتھر کی چھتیں ہیں ۔ بظاہر شریف اور مہذب لیکن بدوضع اور بدپوشاک لوگ ہیں یا ذلیل طریقے سے برے کپڑے منڈھے ہوئے لوگ نظر آتے ہیں جو اس مقام کے عادی ہو چکے ہیں ۔ اور عموماً بے غرضی کے ساتھ کسی نہ کسی دوسرے کے کام میں جتے رہتے ہیں ۔ تھوڑی بہت اُمنگ اور قوت ان میں اُبھرتی ہے وہ بھی گھٹیا انگریز کی حرص و طمع اور چھوٹے موٹے کاروبار میں دولتمند بن جانے کی کوشش

میں نظر آتی ہے۔ حد یہ ہے کہ پولیس والے اور پادری بھی اس تسلسل کو توڑنے میں کچھ کم حصہ نہیں لیتے۔"

۲۱۔ ایکڑ کا ایک پارغ سامنے نظر آرہا ہے جس میں ایک کھلی ہوئی جگہ ہے جو ایک بن سجایا پنڈال ہے جہاں "مذہبی مقررین، مذہب کے خلاف بولنے والے مقررین، سیاسی تقریریں جھاڑنے والے" اور کھلاڑی اکثر اپنا مظاہرہ کرتے رہتے ہیں۔ اُس طرف ایک کلیسائی قدیم عمارت ہے۔ اور اسی کے ایک حصہ میں پادری جیمس موریل اپنا کام کرتا ہے۔ پادری کی لمبی سی میز پر کتابوں اور یادداشتوں، پمفلٹوں کے اوراق کھلے پڑے ہیں۔ بالمقابل چھوٹی میز پر ٹائپسٹ لڑکی مس پروسرپائن گارنٹ جس کی عمر تیس سال کے قریب ہوگی۔ مسٹر جیمس موریل کی پشت پر کتابوں کی الماری — جس پر ایک نظر ڈالیے تو مورس کے "مضامین دینیات" براؤننگ کی نظمیں۔ ایک اور کتاب "ترقی اور رغبت فے بین مضامین، مارکس کی کتاب "کیپٹل" اور اسی طرح کی آدھے درجن کے قریب سوشلزم پر ادبی اور نہایت اہم کتابیں۔

جیمس موریل چرچ آف انگلینڈ کا ایک مسیحی سوشلسٹ پادری ہے۔ عمر ہوگی چالیس کے قریب۔ نہایت مہذب، خوش وضع، خوش اطوار اور بڑا خطیب جو سارے انگلینڈ میں تقریریں کرنے کے لیے بلایا جاتا ہے۔ اور دن کی ہر ڈاک سے دعوت نامے آتے رہتے ہیں۔ جیمس موریل نے ایک خط کھولا اور مس گارنٹ ایک نظر ڈال کر بولی — "اوہو۔ ایک اور لکچر؟"

موریل۔ "ہاں۔ وہ ہوکسٹن فریڈم گروپ اتوار کی صبح کو مجھ سے تقریر کرانا چاہتے

ہیں (اتوار کے لفظ پر خاص طور سے زور دیا گویا یہ بہت ٹیڑھی کھیر ہے) کون لوگ ہیں یہ ؟

مس گارنٹ "کمیونسٹ انارکسٹ ہیں میرے خیال میں"

"ہوں" موریل نے بے توجہی سے کہا کہ انہیں لکھ دو کہ اتوار غلط ہے۔ اس روز مجھے چرچ میں خطبہ پڑھنا ہوتا ہے۔ تقریر کرانی ہے تو سنیچر یا سوموار کو بلائیں۔ لیکن ڈائری میں یادداشت نکال کر دیکھی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ پورے ہفتے کا پروگرام پہلے سے بنا ہوا ہے۔ روزانہ شام کو کہیں نہ کہیں تقریر طے ہو چکی ہے۔ دس بارہ دن تک تو فرصت ہے نہیں۔ ۲۸ تاریخ خالی تھی مگر اس شام کو بھی معزز شہریوں کی رات کی دعوت ہے۔ موریل نے اس دن کا انتخاب کر لیا اور دعوت کا پروگرام منسوخ کر دیا۔

موریل نے پڑھنے کے لیے ایک تازہ کتاب اٹھا لی۔ اتنے میں ایک نوجوان جو ابھی یونیورسٹی سے فارغ ہو کر آیا ہے اور جسے موریل نے اپنا نائب اور شاگرد بنا لیا ہے، داخل ہوتا ہے۔ موریل نے اسے دیکھتے ہی کہا "کیوں الکسی (الکزنڈر) آج پھر حسب معمول دیر کر دی ؟" دیر ہوئی کیونکہ الکزینڈر رل دیر سے سو کر اٹھا۔

"ہوشیار رہو — اور عبادت کیا کرو" موریل اسے تنبیہ کرتا ہے۔

"جی ہاں — میں مانتا ہوں، مگر جب میں سو رہا ہوں تو نہ عبادت کر سکتا ہوں نہ ہوشیار رہ سکتا ہوں ...."

گھر میں کام بہت پڑا ہے۔ اور الکسی کو گھر کی صفائی، برتنوں کی

درستی اور ترتیب وغیرہ کے کام میں موریل کا ہاتھ بٹانا۔ کیونکہ آج پونے بارہ بجے کی گاڑی سے مسز موریل آنے والی ہے۔ الکسی تعجب کرتا ہے کہ مسٹر موریل جیسا سنجیدہ آدمی اپنی بیوی کے معاملہ میں کتنا جذباتی نظر آتا ہے اور موریل صفائی پیش کرتا ہے۔

"صاحبزادے شادی کرکے دیکھو۔ کسی بھلی شریف عورت سے شادی کرو۔ تب تم سمجھوگے جس بہشتی سلطنت کو ہم زمین پر قائم کرنا چاہتے ہیں اس کی بہترین لذتوں کا پیش خیمہ ہے شادی۔ اور پھر تم آوارہ گردی اور تضیع اوقات سے بچ جاؤگے۔ ایک دیانتدار انسان محسوس کرتا ہے کہ مسرت کے ایک لمحے کی قیمت اسے خدا کو ادا کرنی چاہیے، اور قیمت یہ ہے کہ دوسروں کے لیے مسرت پھیلانے میں نہایت بے غرضی کے ساتھ محنت مشقت کی جائے۔ جس طرح دولت پیدا کیے بغیر ہمیں دولت کے استعمال کرنے کا کوئی حق نہیں ہے اسی طرح مسرت پیدا کیے بغیر ہمیں مسرور اور خوش ہونے یا مسرت بٹورنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ میری کنڈیڈا کی طرح تم ایک بیوی حاصل کرکے دیکھو۔ پھر تمہیں احساس ہوگا کہ ہمیشہ مسرتوں کی قیمت تم پر واجب رہیگی"۔ (بڑے پیار سے الکسی کے کاندھے پر تھپکی دیتا ہے اور کمرہ سے باہر جانے کے لیے چلتا ہے)

الکسی اپنے استاد کی خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔ "کیا خوب آدمی ہے۔ کیسی محبت کرنے والی روح اس نے پائی ہے" الکسی کی زبان سے نکلا۔ مس پروسرپائن" (ٹائپ رائٹر سے کاغذ کھینچتے ہوئے اور اسے تہہ کرتے

ہوئے) اوہ ـــ آدمی کو بیوی سے محبت کرنی چاہیے لیکن اس طرح نہیں کہ وہ اس کے پیچھے بے وقوف بن جائے .... اِدھر کنڈیڈا، اُدھر کنڈیڈا ـــ ہر طرف کنڈیڈا ہی کنڈیڈا ۔ یہ حرکت بھی آدمی کو پاگل اور مخبوط الحواس کرنے کے لیے کافی ہے کہ ایک عورت کے پیچھے اس طرح دیوانے ہوئے جا رہے ہیں صرف اس لیے کہ اس کے بال خوبصورت ہیں اور گوری شکل صورت پائی ہے"

الکسی اس جذبے پر حیرت زدہ ہو کر موریل کی طرف سے بچاؤ کرتا ہے کہ نہیں مس گارنٹ، یہ بات نہیں ۔ کنڈیڈا نہایت حسین عورت ہے آنکھیں دیکھو کتنی حسین اور خوبصورت آنکھیں ہیں ۔

مس پروسرپائن گارنٹ ۔ کنڈیڈا کی آنکھیں میری آنکھوں سے بہت زیادہ اچھی تو نہیں ہیں ـــ"

الکسی اسے کنڈیڈا سے جلنے کا طعنہ دیتا ہے اور وہ اس جذبے سے انکار کرتی ہے ۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہتی ہے ۔

"مرد ہونا کتنا اچھا ہے ۔ اور ہم عورتوں کی طرح محض جذبات کا پیکر بن کر رہ جانے کے بجائے نہایت دور رس ذہانت کا مالک ہونا کتنی اعلیٰ درجہ کی صفت ہے ۔ تم لوگ اس سبب کو جانتے ہو کہ ہم جو تمہاری عاشقانہ فریب خوردگی میں مبتلا نہیں ہوتے اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم سب عورتیں ایک دوسری سے جلتی ہیں"

الکسی" کاش تم عورتیں جتنا مرد کی کمزوریوں کو سمجھتی ہو اتنا ہی اس کی طاقتوں کی حقیقت کو بھی جان سکتیں ۔ اگر ایسا ہوتا تو مس پروسرپائن ! دنیا میں عورت

مرد کا مسئلہ ہی نہ رہتا"

اسی طرح دو طرفہ چوٹ چلتی رہتی ہے۔ اور مس پروسرپائن گارنٹ اُسے کام کی طرف توجہ دلا کر بحث ختم کر دیتی ہے۔

دروازہ کھلا اور مسٹر برگس داخل ہوا۔ مسٹر برگس کنڈیڈا کا باپ اور موریل کا خسر ہے۔ موریل سے اس کے تعلقات کئی سال سے خراب ہیں۔ تین برس کے بعد آج پہلی بار وہ اس دروازے پر آیا ہے۔ برگس ایک ادنیٰ آدمی سے بڑھ کر ٹھیکہ دار اور خاصا دولتمند بن چکا ہے۔ لیکن گفتگو اور لباس سے اب بھی ایک گھٹیا اور ان پڑھ، لالچی خود غرض انسان معلوم ہوتا ہے۔ موریل اس سے کھلی نفرت کرتا ہے۔

الکسی اندر جاتا ہے اور موریل باہر آجاتا ہے۔ چلتے چلتے موریل اپنے نوجوان شاگرد کو مشورہ دیتا ہے۔ میرا ریشمی رومال لے لو اور اپنا گلا لپیٹ لو۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے۔ جاؤ"

برگس۔ "اپنے نائبوں کو پھر تم خراب کر رہے ہو موریل۔ گڈ مورننگ! جب کسی شخص کو میں اپنی جیب سے روپیہ دیتا ہوں اور اسے میرے روپیہ پر گزر کرنی ہوتی ہے تو میں اس شخص کو اسی کے درجہ پر رکھتا ہوں"

موریل (اختصار کے طور پر) میں اپنے نائبوں کو ان کے درجہ پر رکھتا ہوں یعنی انہیں اپنا مددگار اور ساتھی سمجھتا ہوں۔ اگر تم اپنے کلرکوں اور دکان کے ملازموں سے اتنا کام لو جتنا میں اپنے شاگردوں سے لیتا ہوں تو تم کبھی کے بڑے دولتمند بن چکے ہوتے۔ خیر جانے دو..."

موریل ذرا ترش لہجے میں یاد دلاتا ہے کہ جب تم پہلی دفعہ آئے تھے تو تلخی بڑھ گئی تھی۔ اب بتاؤ تشریف آوری کا مقصد کیا ہے؟"

کچھ نہیں میں پرانی تلخیوں کو دور کرنے آیا ہوں۔ موریل اصرار کرتا ہے کہ وہ پرانی تلخی کبھی نہیں بھول سکتا۔ برگس تمام ٹھیکیداروں میں انتہائی ذلیل آدمی ہے جو اپنے ملازموں کو اتنی کم اُجرت دیتا ہے جس سے وہ پیٹ بھی نہیں بھر سکتے اور پھر ان سے کام لے کر ہر ٹھیکے کے لیے کم سے کم ٹنڈر بھرتا ہے تاکہ ٹھیکہ اُسی کو ملے۔

خیر پُرانی باتوں کو جانے دو۔ اب میں نے مزدوروں کی اُجرت بڑھا دی ہے۔ موریل مطمئن ہے مگر فوراً ہی گفتگو سے اس پر واضح ہو جاتا ہے کہ برگس نے مزدوروں کی اُجرت صرف اس لیے بڑھائی ہے کہ میونسپلٹی یہ شرط پوری کیے بغیر برگس کو ٹھیکہ دینے پر آمادہ نہ تھی۔ "اچھا تو کام بتاؤ۔ اب کیسے آئے؟" موریل پوچھتا ہے اور برگس پھر اصلی مقصد پر پردہ ڈالتا ہے کہ تم میرے داماد ہو۔ میرے عزیز ہو۔ صرف اس لیے آیا ہوں لیکن موریل اس ٹھیکیدار کی فطرت کو خوب سمجھتا ہے۔ اور اسے مختلف حربوں سے ذلیل کرتا ہے۔ بالآخر وہ قبول دیتا ہے کہ فی الحال تو کوئی ذاتی غرض نہیں۔ البتہ تم لوگوں کا اثر بڑھتا جا رہا ہے "ہو سکتا ہے ایک روز تمہارا مرتبہ بڑھا دیا جائے۔ چاہے وہ تمہاری زبان بند کرنے کے لیے ہی کیوں نہ ہو۔ یہ پیشہ جو تم نے اختیار کیا ہے آگے چل کر کافی آمدنی دیگا۔ اور تم جیسے آدمی کے لیے نفع بخش ثابت ہو گا"

"ہاں اب تم نے ایمانداری کی بات کی" یعنی ابھی سے تعلقات

بنا لینے چاہئیں تا کہ آگے چل کر میں تمہارے کاروبار میں مفید ثابت ہو سکوں"
کنڈیڈا آگئی۔ اس کے ساتھ سامان کافی ہے۔ موریل کو افسوس ہے کہ وہ بیوی کا استقبال کرنے کے لیے اسٹیشن نہ جا سکا۔ وہ معذرت کرتا ہے کہ اسے تنہا اتنا سامان لے کر آنا پڑا ہے

"نہیں میں تنہا نہیں ہوں۔ ایوجین میرے ساتھ آیا ہے۔ ہم دونوں ساتھ ہی آئے ہیں"۔

موریل دروازے کے باہر گاڑی کی طرف دوڑا جہاں ایوجین کوشش کر رہا تھا کہ کنڈیڈا کا سامان اٹھائے لیکن ایک بھاری ٹرنک اس کے کم سن ہاتھوں سے اٹھایا نہیں جاتا تھا۔

موریل اور ایوجین سامان لے کر آگئے۔ برگس سے تعارف کرایا گیا۔ کنڈیڈا پہلے بتا چکی ہے کہ ۱۸ ، ۱۹ برس کا نوجوان ایک شاعر مزاج، نازک طبع فن کار ہے۔ جون کی ایک رات کو وہ دریا کے کنارے سو رہا تھا جہاں سے موریل اس کو اپنی نگرانی میں رکھنے کے لیے لے آیا ہے اور اس نوجوان مہمان کی بڑی قدر کرتا ہے۔ برگس تعارف کے بعد رخصت ہونا چاہتا ہے لیکن چلتے چلتے ایوجین مارچ بینک کو اپنے گھر کھانے پر آنے کی دعوت دے دیتا ہے۔ موریل یا اس کی بیٹی اسے کھانا کھانے کے لیے بھی نہیں روکتے اور وہ رخصت ہو کر چلا جاتا ہے۔

ایوجین سے کنڈیڈا سوال کرتی ہے، تم راستے میں ایسے افسردہ اور خاموش کیوں تھے؟ اور وہ جواب دیتا ہے۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ گاڑی والے

کو کیا کرایہ دینا چاہیے۔ دوبارہ پوچھنے پر اس نے بتایا کہ میں گاڑی والے کو دس شلنگ دینے والا تھا، حالانکہ موریل نے اسے دو شلنگ دیے ہیں جو اس کی پوری اجرت تھی اور جسے پاکر گاڑی والا شکریہ ادا کرنے لگا۔

موریل۔ "خیر کوئی بات نہیں ایوجین مارچ بینک! زیادہ پیسہ ادا کرنے کا رجحان سخاوت کا رجحان ہے اور کم ادا کرنے کے رجحان سے ہزار درجہ بہتر ہے۔ کیونکہ زیادہ ادا کرنا عام طور پر کم لوگوں میں پایا جاتا ہے"

ایوجین باہر جانا چاہتا ہے۔ موریل اصرار کرتا ہے کہ کھانا کھا کر جاؤ یا اگر باغیچے میں جا کر لکھنا پڑھنا ہی چاہتے ہو تو ڈیڑھ بجے کھانے کے وقت تک آجاؤ۔ ایوجین کھانے پر حاضر نہ رہنے کا عذر کرتا ہے لیکن عذر کرتے ہوئے اس کی زبان لکنت کرتی ہے اور بالآخر وہ کہہ دیتا ہے کہ مسز موریل کھانے کے وقت میرا یہاں ٹھہرنا پسند نہیں کرینگی

موریل سمجھتا ہے کہ اس کی بیوی نے شاید اس لیے اشارہ کیا ہوگا تاکہ اتنے روز کے بعد جو ملاقات ہوئی ہے اس کی لذت کو کسی غیر آدمی کی موجودگی سے بے لطف نہ کیا جائے۔

کنڈیڈا نے سوچا ہوگا کہ میں تمہارا یہاں ٹھہرنا پسند نہ کرونگا۔ لیکن اس کا خیال غلط ہے۔ میں تمہیں بہت چاہتا ہوں، صاحبزادے! میں چاہونگا کہ تم ٹھہرو اور دیکھو کہ میری طرح کامیاب شادی میں کتنی مسرتیں پوشیدہ ہیں۔"

ایوجین مارچ بینک۔ "مسرتیں —— اور آپ کی کامیاب شادی! کیا

آپ واقعی یہ یقین رکھتے ہیں ؟"

موریل نے سوچا کہ شادی کے متعلق جو غلط مقولے ایوجین نے سُنے ہونگے، یہ ان کا اثر ہے، چنانچہ وہ ٹال کر اسے پھر یاد دلاتا ہے کہ وہ ڈیڑھ بجے کھانے پر ضرور واپس آجائے۔ لیکن ایوجین کے چہرے کا رنگ بدل گیا ہے۔ اس کے تیور بدل گئے ہیں اور وہ موریل کی تھپکیوں کے باوجود جواب دیتا ہے کہ اگر موریل نے اور اصرار کیا تو اس کی زبان سے ایسی بات نکل جائیگی جس سے موریل دہل جائیگا۔

اور موریل کے اصرار پر اس کی زبان حرکت کرتی ہے "اول تو یہ کہ میں تمہاری بیوی سے محبت کرتا ہوں"

موریل پہلے تو اسے غور سے دیکھتا ہے اور پھر بے ساختہ قہقہے لگانے شروع کرتا ہے۔ وہ بڑی مشکل سے اپنی ہنسی ضبط کر سکا "ایک تم کیا، اس سے سبھی محبت کرتے ہیں۔ اسے دیکھ کر محبت کیے بغیر کوئی نہیں رہ سکتا۔ کوئی بات نہیں" اور پھر موریل سمجھتا ہے کہ اس میں فکر کی کوئی بات نہیں تم ابھی بچے ہو۔ تمہاری عمر بیس سال سے کم ہے اور اس کی تیس سے زیادہ لیکن ایوجین ایک سنجیدہ اور بے قابو آدمی کی طرح موریل کی ہر بات کا جواب سخت سے سخت انداز میں دیتا ہے۔

"میں گھبرا جاتا ہوں جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ ایسے کڑوے گھونٹ تمہاری بدولت اسے کتنے برسوں سے پینے پڑے ہیں جب کہ تم اپنی خود غرضی اور اندھے پن میں اپنی بیوی کو اپنے کمالات دکھانے کی مصروفیتوں

قربان کرتے رہے ہو۔ تم ۔۔۔ تم ایسے ہو کہ تمہارا ایک خیال، ایک تصور بھی اس عورت سے مشترک نہیں ہے"

موریل پھر نصیحت کرتا ہے کہ بے وقوفی مت کرو۔ وہ مجھے پسند کرتی ہے میں اسے پسند کرتا ہوں۔ جب تمہاری شادی ہو جائیگی تب تم اس حقیقت کو سمجھوگے۔ دونوں طرف سے گفتگو فلسفیانہ اور شاعرانہ سطح پر پہنچ جاتی ہے کیونکہ موریل بڑے ضبط اور سنجیدگی سے کام لے رہا ہے۔

ایوجین اب بھی موریل کی خامیاں بیان کرنے پر تلا ہوا ہے۔" ایک عظیم روح رکھنے والی عورت جو حقیقت، سچائی اور آزادی کی متلاشی ہے اُسے تم استعاروں، مذہبی اقوال اور عبادات، باسی خطابت اور صرف حسین الفاظ کی غذا دیتے رہے ہو۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ عورت کی روح تمہاری خطیبانہ ذہانت کی غذا پر بسر کر سکتی ہے؟"

"نکل جاؤ میرے گھر سے" موریل کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا، اور اس نے ایوجین مارچ بینک کی مزید گستاخی پر اس کے ساتھ ہاتھا پائی بھی کی۔ ایوجین دو چار ہاتھ کھا کر نکل جانا چاہتا ہے لیکن چلتے چلتے بھی اس کی زبان موریل کے گھاؤ لگانے سے باز نہیں آتی، اور وہ دروازے سے نکلتے وقت کہتا ہے کہ موریل! " چاہے سچ یا جھوٹ، لیکن میرے جانے کے بعد تم اپنی بیوی کو اس وقت کا حادثہ بتا دینا" ورنہ میں خود اسے اطلاع دونگا اور تم اس کی نظر سے اور بھی گر جاؤ گے۔

اتنے میں کینڈیڈا دوسری طرف سے آگئی۔

"ارے ایوجین، تم جا رہے ہو پیارے۔ ذرا اپنا حلیہ تو دیکھو، ایسی حالت میں باہر جا رہے ہو، تم شاعر ہو یقیناً" اس کے بعد وہ موریل کو متوجہ کرتی ہے کہ پھٹے ہوئے کالر، بکھرے ہوئے بالوں اور بدوضع لباس کے ساتھ ایوجین کو باہر کیوں جانے دیا۔ اسے واپس بلا لیتی ہے۔

"آدھ گھنٹے میں کھانا تیار ہو جائیگا۔ کھانا کھا کر جانا"

"میں ٹھہرنا چاہتا ہوں" ایوجین عذر پیش کرتا ہے" بشرطیکہ بزرگوار آپ کے شوہر اس ارادہ کے خلاف نہ ہوں"

کنڈیڈا اپنے شوہر سے ایوجین کے ٹھہرنے کی اجازت حاصل کر لیتی ہے۔ ایوجین روک لیا جاتا ہے۔ جو ذرا دیر بعد اطمینان کے لہجے میں کہتا ہے "اُفوہ —— میں تمام موجودات میں سب سے زیادہ مسرور ہوں"

موریل "میں بھی تھا — مگر گھنٹہ بھر پہلے"

دوسرا ایکٹ

مقام وہی موریل کے لکھنے پڑھنے کا کمرہ۔ سہ پہر کا وقت۔ مس پروسرپائن گارنٹ اپنے ٹائپ رائٹر پر بیٹھی ہے مشین میں کچھ خرابی معلوم ہوتی ہے۔ ایوجین بتاتا ہے کہ اُس نے مشین کو ذرا چھیڑا تھا لیکن وہ ٹائپ نہ کر سکا۔

"ہوں اب میں سمجھی ..... تم سمجھے کہ بس کچھ نہیں کرنا ہے۔ ذرا ہنڈل کو گھما دیا اور ٹائپ رائٹر فوراً کھٹا کھٹ محبت بھرے خطوط لکھنے شروع

کردیگی۔ کیوں ہے نا؟"

ایوجین مارچ بینک "میرا خیال ہے کہ مشین سے محبت کے خطوط لکھے جا سکتے ہیں۔ ایک اس قسم کی مشین بن سکتی ہے کیونکہ وہ خطوط بھی تو سب ایک ہی قسم کے ہوتے ہیں — کیوں بجا ہے؟"

مس گارنٹ گھبرا سی گئی "مجھے کیا معلوم، مجھ سے کیوں پوچھتے ہو؟"

"اوہ معاف کیجیے۔ میں سمجھا کہ سمجھدار لوگ — یعنی کاروبار کرنے والے اور وہ جو خط وکتابت وغیرہ میں لگے رہتے ہیں — محبت کے خطوط ضرور لکھتے ہونگے تا کہ کہیں پاگل نہ ہو جائیں"

پروسرپائن بگڑ جاتی ہے۔ بھلا اسے محبت سے کیا واسطہ۔ اور ایسا الزام بے وجہ اس کے سر تھوپ دیا گیا۔ لیکن ایوجین معذرت کرنے کے ساتھ ساتھ اور چٹکی لیتا ہے۔ اس کے خیال میں مس گارنٹ صرف شرم کے مارے یہ نقاب ڈال رہی ہے۔ یہ سب شرم کا نتیجہ ہے "جو دنیا میں محبت کے معاملات اتنے کم ہوتے ہیں۔ ہم سب لوگ محبت کی تمنا کرتے ہیں۔ یہ ہماری فطرت کی پہلی ضرورت ہے۔ ہمارے دل کی پہلی آرزو ہے۔ مگر ہم اپنی تمنا کو زبان پر لانے کی جرأت نہیں کرتے۔ ہمیں شرم بہت آتی ہے۔

"میں محبت کی تلاش میں گھومتا ہوں۔ اور میں دیکھتا ہوں کہ دوسروں کے پاس اس کا بے پناہ خزانہ موجود ہے۔ لیکن جب میں کوشش کرتا ہوں کہ محبت مانگوں تو شرم کے مارے زبان رک جاتی ہے۔ اور میں بالکل گونگا بن کر رہ جاتا ہوں۔ بلکہ گونگے سے بدتر۔ اور بے معنی باتیں کرنے لگتا ہوں۔ احمقانہ

جھوٹ بولنے لگتا ہوں ...... دنیا کی ٹریجڈی یہی تو ہے"

مس گارنٹ "لیکن بے ایمان لوگ تو اپنی شرم پر بڑی آسانی سے قابو پا لیتے ہیں ...."

مارچ بنک "(سختی سے ایک دم بولتے ہوئے) ہاں —— بے ایماں لوگوں کا مطلب ہے وہ لوگ جن میں محبت نام کو نہیں ہوتی۔ اسی لیے ان میں شرم بھی نہیں ہوتی۔ ان میں قوت ہوتی ہے کہ وہ محبت مانگ سکیں کیونکہ انھیں محبت کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ ایسے بے ایمانوں میں قوت ہوتی ہے کہ وہ محبت کی پیش کش کر سکیں کیونکہ ان کے پاس دینے کے لیے محبت ہوتی ہی نہیں"

یہ الفاظ کہتے کہتے وہ اپنی کرسی پر ہاتھ پیر چھوڑ دیتا ہے اور بڑے درد بھرے لہجے میں کہتا ہے "مگر ہم لوگ جو محبت کرتے ہیں، اور چاہتے ہیں کہ اپنی محبت کو دوسروں کی محبت سے خلط ملط کریں ہم سے ایک لفظ نہیں کہا جاتا ....."

مس پروسرپائن اس موضوع بحث سے جہاں دلچسپی لے رہی ہے وہیں نازک مقامات سے گھبراتی بھی ہے۔ تھوڑی حجت کے بعد اور کسی قدر مس پروسرپائن کا نقاب سرکنے کے بعد بحث اس طرح ختم ہوتی ہے کہ برگس، داخل ہوتا ہے۔ اور وہ ایوجین سے ہمدردی کرتے ہوئے یہ جملہ ادا کرتا ہے "تمہیں بڑی تنہائی محسوس ہوتی ہوگی کہ بات کرنے کو بھی کوئی نہیں ہے سوائے ایک ٹائپسٹ لڑکی کے۔"

مس پروسرپائن اس پر بھر بگڑتی ہے کہ اس کی تذلیل ہوئی اور وہ جواب میں برگس کی تذلیل کرتی ہے۔ اور برگس اسے ڈراتا ہے کہ میں تمہارے آقا موریل سے شکایت کرونگا

باہر سے گھنٹی ہوئی۔ لڑکی اُٹھ کر آنے والے کا استقبال کرنے چلی گئی۔ اور برگس نے تخلیہ پاکر ایوجین کو ہمدردانہ مشورہ دیا کہ تم میرے داماد سے ہوشیار رہنا۔ وہ پاگل ہے۔ پاگل صرف اس لیے نہیں کہ مسیحی سوشلزم پر اس کا اعتقاد پاگلوں کا سا ہے۔ بلکہ اس کی حرکات و سکنات بھی۔ آج صبح اس نے مجھ سے کہا "میں بے وقوف ہوں اور تم نہایت مکار دغا باز" اور پھر مجھ سے ہاتھ ملایا، مصافحہ کیا جیسے اس نے مجھے یہ اعلیٰ درجے کا خطاب مرحمت فرمایا ہو۔

اتنے میں موریل مس گارنٹ کو ہدایات دیتا ہوا اندر آگیا اور برگس نے پھر نوجوان مہمان کو اشارہ کیا۔ لو وہ موجود ہے۔ اب تم نظر رکھنا تمہیں اس کی حرکتیں صاف طور پر خبطیانہ نظر آئینگے۔

برگس فوراً اس سے اس کی ٹائپسٹ کی شکایت کرتا ہے۔ لیکن موریل ٹال جاتا ہے۔ جیسے برگس کی توہین کوئی قابلِ ذکر بات نہیں ہے۔ برگس ایک کتاب مانگ کر وہیں بیٹھ جاتا ہے۔ موریل بتاتا ہے کہ اس کی بیوی آنے والی ہے وہ ابھی لمپ میں تیل بھر رہی ہے۔ وہ آئیگی تو اپنے باپ کی ضیافت کرسکیگی۔

ایوجین "ارے! اس سے تو ان کے ہاتھ خراب ہو جائینگے۔ میں برداشت نہیں کرسکتا۔ بڑے شرم کی بات ہے۔ میں جاتا ہوں اور خود لمپوں میں

تیل بھرونگا"

موریل۔ بہتر ہے کہ تم نہ جاؤ۔ وہ تمہیں میرے بوٹ صاف کرنے میں لگادیگی۔ تاکہ میں صبح خود اپنے بوٹ صاف کرنے کی زحمت سے بچ جاؤں"

برگس "تو کیا آپ ملازم نہیں رکھتے؟"

موریل "ہے مگر وہ میری غلام نہیں ہے۔ گھر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے میں تین غلام رکھتا ہوں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم میں سے ہر ایک تھوڑا تھوڑا سا ہاتھ بٹاتا ہے۔ اور یہ کوئی بُری ترکیب نہیں ہے"۔

لیکن ایوجین اور برگس دونوں اس دلیل پر مطمئن نہیں ہیں۔ ابھی گفتگو جاری ہے کہ کنڈیڈا اسی کمرے میں چلی آئی، اس کے ہاتھوں میں تیار لمپ ہے۔ "ایوجین اگر تم ہمارے یہاں رہنے کا وعدہ کرو تو میں لمپ بھرنے کی ذمہ داری تمہارے سپرد کر سکتی ہوں۔

"میں صرف اس شرط پر رہنے کا وعدہ کرتا ہوں کہ ایسے جتنے بھدے کام ہیں وہ میرے سپرد کر دیے جائیں" ایوجین کنڈیڈا کو جواب دیتا ہے۔

"کیا ہے۔ کچھ تمہاری طبیعت خراب ہے کیا ایوجین؟"

"و نہیں۔ طبیعت خراب نہیں، صرف وحشت طاری ہے"

ایوجین کے اس جملے۔ خصوصاً لفظ وحشت پر مسٹر برگس بہت تلملائے وحشت کیا معنی؟ یہ تو خطرناک علامت ہے۔

کنڈیڈا "لاحول ولا... اباجان، یہ محض شاعرانہ وحشت ہے۔ ہے نا ایوجین؟"
(اسے تھپکتے ہوئے)

کنڈیڈا باتوں باتوں میں ایوجین کو مخاطب کرتے ہوئے اپنا مانجھنے کا برش خراب ہونے کی شکایت کرتی ہے اور چاہتی ہے کہ وہ اسے تحفۃً ایک اور اچھا سا خوبصورت ہاتھی دانت کے دستے والا برش لا کر دے۔

ایوجین مارچ بینک۔ "نہیں مانجھنے کا برش نہیں۔ میں ایک کشتی پیش کرنا چاہتا ہوں۔ ننھی سی کشتی۔ جس میں بیٹھ کر دنیا سے بہت دور کا سفر کیا جائے جہاں سنگ مرمر کے فرش بارشوں سے دھلتے ہوں اور دھوپ سے سوکھتے ہوں۔ جہاں جنوب سے چلنے والی ہواؤں کے جھونکے خوبصورت ہرے اور بنفشئی قالینوں کو جھاڑ کر صاف کرتے ہوں۔ یا ایک رتھ لا کر دوں جو ہم کو آسمانوں پر لے جائے، جہاں ستارے ہی لمپ ہیں اور انہیں روزانہ مٹی کے تیل سے بھرنا نہیں پڑتا۔

موریل "ہاں (ذرا سختی سے) جہاں کام کچھ نہیں ہے سوائے اس کے کہ بیکار سست اور خود غرضی کے عالم میں پڑے رہو"

کنڈیڈا "اُفوہ ——— جیمس، تم نے بالکل ہی تباہ کر دیا"

ایوجین "جی ہاں۔ سست، خود غرض اور بیکار پڑے رہنا ہی حسین، آزاد اور خوش رہنا ہوتا ہے۔ کیا ہر شخص اپنے دل کی گہرائی میں اس عورت کے لیے جس سے وہ محبت کرتا ہے، یہی سب نہیں چاہتا؟ یہ تو میرا منتہائے مقصود ہوا۔ اب آپ بتائیے مسٹر موریل! آپ کا منتہائے مقصود (آئڈیل) کیا ہے اور ان وحشتناک لوگوں کا کیا ہے جو مکانوں کی ان بیہودہ قطاروں میں بستے ہیں۔ مذہبی عبادات اور مانجھنے کا برش! تمہارا کام آیات کی تبلیغ،

اور تمہاری بیوی کا کام برتن مانجھنا"

کنڈیڈا " (جلدی سے) نہیں ایوجین تمہیں نہیں معلوم ۔ وہ خود اپنے بوٹ صاف کرتے ہیں ۔ ایسی بات انہیں کہو گے تو کل صبح سے تمہیں بوٹ صاف کرنے ہونگے "

ایوجین "اوہ ۔ بوٹوں کا ذکر نہ کیجیے ۔ پہاڑیوں پر آپ کے پاؤں اور خوبصورت ہو جائینگے"

کنڈیڈا "نہیں ہیکنی روڈ پر بغیر بوٹوں کے میرے پاؤں کبھی خوبصورت نہیں ہو سکتے ۔

برگس "(تنگ آکر) سن کنڈی، اس طرح گری ہوئی باتیں مت کرو مسٹر ایوجین مارچ بینک اس قسم کی گفتگو کے عادی نہیں ہیں ۔ تم پھر اسے وحشت میں مبتلا کر دو گی ۔ میرا مطلب ہے کہ شاعرانہ وحشت میں"

موریل حسب دستور لکھنے پڑھنے، خطوط کا جواب ٹائپ کرانے میں مصروف ہے ۔ اسے اس قصہ سے کچھ واسطہ نہیں ۔

ایک جوابی تار آیا ۔ یہ کسی کمیٹی کا تار ہے ۔ جن سے موریل نے پہلے تقریر کا وعدہ کیا تھا اور اب لکھ بھیجا تھا کہ میں نہیں آؤنگا ۔ انہوں نے پھر جوابی تار دے کر درخواست کی کہ آپ کو ضرور آنا ہوگا ۔ اور موریل نے پھر جواب دیا میں نہیں آسکتا ۔ کنڈیڈا کو اس واقعے کا علم نہیں اور نہ ایوجین کی اور اس کی ناراضگی کا ۔ وہ موقع پاکر موریل سے شکایت کرتی ہے کہ وہ ہر شام باہر تقریر کرنے چل دیتا ہے اور اسے ڈھنگ سے بات کرنے اور پاس بیٹھنے کا بھی موقعہ نہیں دیتا ۔ لوگ اس کی تقریر سننے اس لیے آتے ہیں کہ عیاشی کے تمام دوسرے

امکانات ان پر بند ہوتے ہیں۔ اور وہ اس کی تقریر سننے کو بھی ذہنی عیاشی اور تفریح سے زیادہ کچھ نہیں سمجھتے۔ وہ بھی تمہاری سکرٹری عورتوں کی طرح تم سے محبت کرتے ہیں۔ اور تمہیں تبلیغ و تقریر سے محبت ہے۔ کیونکہ تم تقریر کی دل کشی رکھتے ہو" تمہاری تقریر سے کچھ نتیجہ نہیں نکلتا۔ صرف ان لوگوں کی تفریح ہو جاتی ہے۔

اور اسی شکایت کے لہجے میں وہ یہ شکایت بھی کرتی ہے کہ ایوجین کا پورا خیال نہیں رکھا جاتا۔ وہ بڑا ہی اچھا لڑکا ہے۔ اگرچہ اسے خود خبر نہیں۔ لیکن اگر بس چلے تو وہ مجھ سے محبت شروع کر دے۔ ابھی وہ بچہ ہے۔ اسے یہ معلوم نہیں، محبت کہتے کسے ہیں۔ لیکن جب وہ بڑا اور تجربہ کار ہو جائیگا تو وہ مجھے معاف نہیں کریگا کہ میں نے اس لڑکے کو ــــ جسے ماں باپ، بہن بھائی کسی کی محبت نہیں ملی ہے، محبت کیوں نہ سکھائی۔ اگر اس نے کسی بُری عورت سے محبت سیکھی، جیسا کہ مرد عام طور پر اور شاعرانہ مزاج کے لوگ خاص طور پر بری عورتوں سے محبت کرنا سیکھتے ہیں، کیونکہ وہ سب عورتوں کو فرشتہ خصلت سمجھتے ہیں۔ اور فرض کرو اس نے محبت کی قیمت اس وقت سمجھی جب وہ لاعلمی کی وجہ سے محبت کو اور اپنے آپ کو گرا چکا ہو گا تو کیا وہ مجھے معاف کر دیگا؟" کیا وہ میرے اس جرم کو معاف کر دیگا کہ میں نے اپنی نیکی اور پاکیزگی کے خیال سے اُسے محبت آشنا نہیں کیا۔ اور اسے گرنے سے نہیں بچایا؟

ایک طویل جذباتی کشمکش جاری ہے۔ جس نے گھریلو زندگی میں ایک ہیجان بپا کر دیا ہے۔

عین جلسے کے وقت موریل ایسی جذباتی کشمکش میں مبتلا ہوتا ہے، اُسے بحیثیت شوہر کے اپنی کمتری اور ایوجین کی برتری کا ایسا خطرناک احساس ہوتا ہے کہ وہ تیسرا تار بھیجتا ہے۔ "میں تقریر کرنے آرہا ہوں"

موریل اپنی سکرٹری سے کہتا ہے کہ وہ نوٹ لینے کے لیے ساتھ چلے۔ الکسی اس کا نائب ساتھ چلے۔ برگس خود چلنے کے لیے تیار ہے کیونکہ جلسے کا صدر میونسپلٹی کا چیرمین ہے جس سے ٹھیکہ ملنے کی توقع کی جا سکتی ہے۔ لیکن ایوجین اور اپنی بیوی کو ساتھ چلنے سے روک دیتا ہے۔

تیسرا ایکٹ

گھر پر مسز موریل اور ایوجین تنہا رہ گئے ہیں۔ پہلے تو ایوجین کنڈیڈا کو اپنی نظمیں سناتا رہا۔ دو گھنٹے نظمیں سناتے سناتے ہو گئے۔ پھر اُس نے کنڈیڈا کے اصرار پر باتیں شروع کر دیں۔ اور پھر دھیرے دھیرے کنڈیڈا کے زانو پر سر رکھ دیا اور باتیں شروع کر دیں۔

"اوہ۔ آج شام میں کتنا پریشان رہا ہوں کیونکہ میں صحیح راستے پر چل رہا تھا۔ اب جبکہ غلط حرکت کر رہا ہوں تو خوش ہوں"

اس کی ہچکچاہٹ کو دیکھ کر کنڈیڈا اسے ہمت دلاتی ہے کہ جو تمہارے دل میں ہو وہ کہہ ڈالو۔ اور وہ نرم و گداز آواز میں اس کے چہرے پر نظر ڈال کر کئی بار پکارتا ہے "کنڈیڈا — کنڈیڈا — کنڈیڈا"

اتنے میں دروازہ کھلا اور موریل نے پہلا قدم اندر رکھا۔ وہ ناز و نیاز

کا یہ منظر دیکھ کر ایک دم پیچھے ہٹا۔ لیکن کنڈیڈا ذرا نہیں گھبرائی۔ ایوجین بھی کچھ زیادہ نہیں ہچکچایا۔ اس نے موریل کے استفسار کے جواب میں صرف اتنا کہا

"میں یہاں خلوت میں اپنے آپ کو بے وقوف بنا رہا ہوں جب کہ آپ جلوت میں خود کو بے وقوف بنا رہے تھے"

معاملہ یہیں ختم نہیں ہوتا۔ موریل کے سینے میں رقابت کی چنگاری شعلہ بن گئی ہے۔ اور اب زیادہ دیر تک وہ اسے چھپا نہیں سکتا۔ وہ خود کو ایوجین سے زیادہ مضبوط، زیادہ تجربہ کار اور زیادہ سنجیدہ سمجھتا ہے۔ ایوجین کی شاعرانہ صلاحیتوں کی بربادی بھی اسے گوارا نہیں لیکن اب اسے فیصلہ کر لینا ہے کہ اگر کنڈیڈا ئے سے نہیں بلکہ ایوجین کو چاہتی ہے تو وہ موریل سے دست بردار ہو جائے۔ یہ وہ کیفیت ہے جہاں کنڈیڈا، موریل اور ایوجین تینوں فیصلہ کن صورت حال سے دوچار ہو چکے ہیں۔ بحث کو محض عقلی استدلال اور غیر جذباتی فضا میں حل نہیں کیا جا سکتا۔

موریل۔ کنڈیڈا جسے تم بے وقوف چھوکرا کہتی ہو" وہ بے وقوف چھوکرا بچوں کی لطافت خیال کے ساتھ اور سانپ کی سی چالاکی کے ساتھ بولتا ہے۔ وہ دعویٰ کرتا ہے کہ تم میری نہیں اس کی ہو۔ غلط یا صحیح بہر حال مجھے اندیشہ ہے کہ اس کی بات درست ہو سکتی ہے.... اب ہم دونوں اس پر متفق ہیں کہ کنڈیڈا تم خود ہم دونوں میں سے ایک کا انتخاب کر لو۔ میں تمہارے فیصلے کا انتظار کر رہا ہوں"۔

اس پر کنڈیڈا بڑے پُر وقار انداز میں بیٹھتی اور سب کو پرسکون کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہتی ہے۔ اور بار بار اصرار کرتی ہے کہ بے تکلفی کے ساتھ اس کی قیمت لگائی جائے۔ اس کے بعد وہ فیصلہ کریگی کہ کس قیمت کو قبول کرے۔

موریل "میرے پاس پیش کرنے کے لیے کیا ہے سوائے اس کے کہ میرے پاس قوت ہے کہ تمہاری حفاظت کرسکوں۔ میری ایمانداری ہے تمہاری ضمانت کے لیے میری قابلیت اور محنت ہے تمہاری گزر بسر کے لیے۔ اور میرا وقار اور میرا مرتبہ ہے تمہاری برتری کے لیے۔ بس صرف یہی ہے جو ایک مرد ایک عورت کو پیش کرسکتا ہے"

ایوجین "میرے پاس پیش کرنے کے لیے میری کمزوری ہے، میری آشفتہ حالی ہے اور میرے دل کی پکار ہے"۔

"اچھی قیمت ہے ایوجین" کنڈیڈا نے کہا "اب مجھے فیصلہ کرنے میں سہولت رہیگی۔ . . . میں اپنے آپ کو دونوں میں سے زیادہ کمزور کے حوالے کرتی ہوں"

اب سوال یہ ہے کہ زیادہ کمزور کون ہے؟ کنڈیڈا اپنے شوہر کو زیادہ کمزور قرار دیتی ہے کیونکہ بچپن سے اس کی عادتیں خراب کی گئی ہیں وہ ایک دیکھ بھال کرنے والی عورت کے بغیر نہیں جی سکتا اسے ہر لمحے ایک سرپرست عورت کی ضرورت ہے۔

موریل پھر اسی رُخ سے اپیل کرتا ہے "ہاں کنڈیڈا ایک ایک لفظ صحیح کہا تم نے۔ میں جو کچھ بھی ہوں تمہارے ہاتھوں کی محنت اور تمہارے

دل کی محبت کے طفیل میں ہوں۔ تم میری بیوی ہو، میری ماں ہو، میری بہن ہو تم میری ہر ایک محبت کا مرکز ہو۔

کنڈیڈا اس پر ایوجین سے سوال کرتی ہے کہ کیا تم بھی اتنے کمزور اور میری شفقت کے محتاج ہو" کیا تمہارے لیے بھی میں ماں ہوں، بہن ہوں ایوجین؟"

ایوجین — "نہیں ہرگز نہیں ..." ایوجین اتنا کمزور نہیں ہے۔ وہ کنڈیڈا کی شفقت، دیکھ بھال اور سرپرستی کے بغیر بھی جی سکتا ہے۔

موریل اس کے مقابلے میں زیادہ کمزور نکلا۔ اور زیادہ قابل اعتماد بھی۔ چنانچہ کنڈیڈا نے اسی کے ساتھ رہنے کا فیصلہ کر لیا۔

ایوجین فوراً گھر سے باہر نکل جاتا ہے۔ اس کے چہرہ پر سنجیدگی اور آواز میں مردانگی۔

کنڈیڈا — جاتا ہے تو جانے دو" اب اسے کوئی خطرہ نہیں مسرت کے بغیر جینے کا سلیقہ اسے آ گیا ہے"

وہ دونوں اس کے جانے کے بعد گلے ملے مگر انہیں معلوم نہ تھا کہ شاعر کے دل میں کیا راز ہے؟"

کنڈیڈا رخصت کرتے وقت دو جملے کہتی ہے کہ تم اسے نظم میں ڈھال دینا" جب میں تیس برس کا ہونگا تو وہ ۴۵ برس کی ہوگی اور جب میں ساٹھ برس کا ہونگا تو وہ ۷۵ برس کی"

ایوجین "اور سو برس میں میری اس کی عمر ایک ہو لیکن اب میرے پاس بہتر راز ہے

میجر باربرا

یہ ڈرامہ ۱۹۰۵ء میں لکھا گیا۔ تین ایکٹ میں تقسیم کیا گیا ہے۔ شا کے ڈراموں میں اس کی خاص اہمیت ہے۔ اس کا مرکزی خیال یہ ہے کہ غربت اور افلاس دنیا کا سب سے بڑا عیب ہے۔ روحانی پاکیزگی ہو نہیں سکتی جب تک افلاس کا خاتمہ نہ ہو۔ اور کوئی فلسفہ، کوئی ادارہ، کوئی نظریہ جو غریبوں کو ان کی غربت پر مطمئن اور صابر بنانے کی کوشش کرتا ہے وہ بنیادی طور پر جھوٹ اور فریب کا حامل ہے کیونکہ ایسے اداروں کے پیچھے خود دولتمندوں کا مفاد اور ان کی تجوریاں ہوتی ہیں۔

اس ڈرامے کو فلمایا بھی جا چکا ہے اور فلم کافی مقبول ہوئی۔

پہلا ایکٹ

زمانہ جنوری ۱۹۰۶ء۔ مقام ایک دولتمند خاتون لیڈی برٹومارٹ انڈر شیفٹ کا عالی شان مکان۔

افراد: لیڈی برٹومارٹ۔ دو بیٹیاں باربرا، سارہ۔ دو ہونے والے داماد گزنس۔ اور چارلس لوماکس۔ نوجوان بیٹا۔ اسٹیفن۔

لیڈی ادھیڑ عمر کی عورت ہے۔ اس کے انداز میں رعب اور تمکنت پائی جاتی ہے اور نہایت ہوشیاری سے کام لینے کی عادی ہے۔ اس وقت

اس نے اسٹیفن کو بلایا اور اس کو گھر کی اندرونی سیاست پر سنجیدہ گفتگو کے لیے تیار کیا۔ اسٹیفن کو گھریلو معاملات سے کوئی سنجیدہ تعلق نہیں رہا۔ لیکن ماں اسے بتاتی ہے کہ اس کے باپ مسٹر اندر شفٹ سے جو تعلقات خراب ہوئے ہیں ان کی وجہ یہ ہے کہ باپ اپنے حقیقی بیٹے کو وارث بنانے پر آمادہ نہیں۔

مسٹر اندر شفٹ کروڑوں روپیے کی جائداد، کارخانوں اور ذرائع پیداوار کا مالک ہے۔ لیکن اس تمام کاروبار کی روایت یہ رہی ہے کہ کسی لاوارث یا ناجائز بچے کا انتخاب کر کے اسے پورے کاروبار کا وارث بنا دیا جاتا ہے اور ہر مالک اپنی اولاد کو روپیہ وغیرہ دے کر وراثت سے محروم کر جاتا ہے۔ چونکہ لیڈی برٹومارٹ کے شوہر بھی اسی ضد پر اڑے ہوئے ہیں اور لیڈی اپنے بیٹے اسٹیفن کو وارث بنوانا چاہتی ہیں زن و شو کے تعلقات ختم ہو گئے اور برسوں سے ان بچوں کا باپ انہیں دیکھنے بھی نہیں آیا

ماں اپنے نوجوان بیٹے کو آگاہ کرتی ہے کہ گھر کے حالات زیادہ اُمید افزا نہیں۔ باربرا کی زندگی اچھی گزر جائیگی کیونکہ وہ سالویشن آرمی میں (خدمت خلق کی خاطر) چلی گئی ہے۔ ہفتے بھر ایک پونڈ سے زیادہ خرچ نہیں کرتی اور اپنی شوہریت کے لیے اس نے یونانی ادب کے ایک پروفیسر کزنس کا انتخاب کر لیا ہے جو سالویشن آرمی میں باربرا کے شانہ بشانہ خدمات انجام دیتا ہے۔ دوسری بیٹی سارہ نے ایک نوجوان چارلس لوماکس کا انتخاب کر لیا ہے۔

ابھی اس کی عمر پچیس سال ہے۔ باپ کے وصیت نامے کے مطابق لوماکس کو ۸۰۰ پونڈ سالانہ ملتا ہے۔ اور دس سال تک یہی ملتا رہیگا البتہ ۳۵ سال کی عمر میں وہ باپ کی تمام املاک کا وارث بن جائیگا اور کروڑپتی شمار ہوگا۔ اب اسٹیفن کا سوال رہتا ہے۔ اس کا کوئی سہارا نہیں جب تک اس کی شادی کسی بہت بڑے دولتمند گھرانے کی بیٹی سے نہ کی جائے۔

ایک حقیقت اور زبان سے نکل جاتی ہے کہ اس کا شوہر صحیح النسب نہیں ہے کیونکہ اس کے ماں باپ نے شادی نہیں کی تھی اور انڈریو انڈر شفٹ پیدا ہو گیا تھا۔

اس دوران میں وہ بیٹے کو ذہنی طور پر آمادہ کرتی ہے کہ آج اس کے باپ کو گھر میں آنے کی دعوت دی گئی ہے، اس لیے اولاد کو ایسا سعادتمندانہ سلوک کرنا چاہیے جس سے وہ پگھل جائے اور گھر کی دولت گھر میں ہی رہ جائے

بیٹا اپنے باپ کے خلاف باغیانہ جذبہ رکھتا ہے کیونکہ بچپن سے ہی لوگ اس کو طعنہ دیتے رہے ہیں کہ اسٹیفن کا باپ خون اور موت کا کاروبار کرتا ہے۔ توپیں اور بندوقیں، زہریلی گیس اور مہلک ہتھیار بنواتا ہے اور دولت سمیٹتا ہے۔ اس کی کتابوں پر ہم جماعت لڑکے اس کا نام لکھتے وقت "موت اور تباہی کے کارخانے کا وارث" لکھ دیا کرتے تھے۔ لیکن اس وقت ماں کے مشورے پر عمل کرنے کے لیے آمادہ ہے۔ اور کوئی ایسی حرکت نہ کرنے کا وعدہ کرتا ہے جس سے باپ ناراض نہ ہو اور گھر کی خوشگوار فضا دیکھ کر اس پر تیار ہو جائے کہ دونوں بہنوں کو، اس کی ماں لیڈی برٹومارٹ کو اعلیٰ درجہ کی زندگی بسر کرنے

کے لیے باقاعدہ روپیہ دیتا رہے، اور خرچ کی تنگی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

یہی نکتہ باربرا اور سارہ کو — اور ان کے امیدوار شوہروں کو سمجھا دیا جاتا ہے۔ باربرا کی طرف سے ماں کو اطمینان نہیں کیونکہ وہ بڑی جذباتی لڑکی ہے اور مشنری جیسی زندگی گزارنے کی بدولت اور زیادہ دلیر اور صاف گو ہو گئی ہے لیکن اس نے بھی ماں کی خواہش پوری کرنے کا وعدہ کر لیا۔

ادھر تیاری ہو رہی ہے کہ مورلسین ملازم کمرے میں داخل ہوتا ہے اور مسٹر اندرشفٹ کی آمد کی اطلاع دیتا ہے۔ اندرشفٹ اپنے ہی گھر میں داخل ہوتا ہے لیکن کمرے کی ہر شے، یہاں تک کہ اس کے بچے بھی اجنبی ہیں کیونکہ جب اس نے گھر سے بے تعلقی اختیار کی تھی اس وقت یہ بچے بہت کم سن تھے۔

لیڈی برٹیومارٹ گھر میں موجود ایک ایک شخص سے تعارف کرانا چاہتی ہے۔

"یہ سب تمہارا خاندان ہے"

اندرشیفٹ (ذرا تعجب سے) ارے اتنا بڑا خاندان۔ معاف کرنا مجھے یہ کہنا پڑتا ہے کہ میرا حافظہ بہت بری طرح دھوکا دے رہا ہے۔ میں کچھ بھول رہا ہوں (چارلس لوماکس کو بیٹا سمجھ کر پدرانہ شفقت کے ساتھ اس کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے)..... غالباً تم میرے سب سے بڑے بیٹے ہو۔ میرے بچے، تم سے مل کر مجھے بڑی خوشی ہو رہی ہے"

لوماکس (ذرا جھجک اور کھسیانے پن کے ساتھ) جی نہیں — لیکن

— لیکن دیکھیے، آپ نے پہچانا نہیں — اوہو، میں عرض کروں —"
لیڈی برٹیو مارٹ (سکتے کے عالم سے ذرا باہر نکل کر) انڈرو (انڈر شفٹ کا گھریلو نام) کیا تمہارا مطلب ہے کہ تمہیں یہ بھی یاد نہیں رہا کہ تمہارے کتنے بچے تھے؟"
انڈرشفٹ: "ہاں ہاں — اچھا، — مجھے خطرہ ہے کہ — اصل میں بچے بھی تو بڑے ہوگئے ہونگے۔ تو مجھ سے کیا بہت ہی احمقانہ غلطی ہوگئی؟ ہاں ضرور ہوئی ہوگی — مجھے تو صرف ایک بیٹا یاد ہے۔ مگر اب کیا معلوم، زمانہ بھی تو بہت ہوگیا۔ اتنے عرصے میں بہت کچھ حالات —"
لیڈی برٹیو — "(فیصلہ کن انداز میں) انڈریو، تم بالکل بیہودہ باتیں کررہے ہو۔ بیٹا تمہارا واقعی ایک ہی ہے"
انڈرشیفٹ — "اچھا تو مہربانی کر کے میری پیاری اُس سے تعارف کرادو۔"

اور پھر تعارف شروع ہوتا ہے۔ بیٹیوں سے، بیٹیوں کے امیدواروں سے، اور بیٹے سے لیکن غلط فہمی کا سلسلہ جاری ہے جس سے حاضرین میں جھجک اور لطف و مسرت کا مخلوط جذبہ بڑھ گیا ہے۔

باربرا کے متعلق یہ معلوم کر کے کہ وہ سالویشن آرمی میں میجر کے اعزازی عہدے پر سرفراز ہے اور وہاں غریبوں اور بیکاروں کی تنظیم کررہی ہے جو مسیحی تعلیم سے روح کی پاکیزگی اور قناعت کی قوت حاصل کرتے ہیں، اس

کے باپ انڈرشیفٹ کو خاص دلچسپی پیدا ہوئی۔ اس نے بیٹی سے پوچھا کہ تم جہاں خدمت خلق انجام دیتی ہو کیا واقعی وہاں بھلے آدمی موجود ہیں؟
میجر باربرا "جی نہیں — وہاں نہ بھلے آدمی ہیں، نہ بُرے۔ بلکہ سب ایک ہی باپ کے بیٹے ہیں، جتنی جلدی وہ ایک دوسرے کے نام مقرر کر کے ناموں سے پکارنا بند کر دیں اتنا ہی اچھا ہوگا۔ اس بارے میں مجھے مت بتایئے۔ میں اُنہیں اچھی طرح جانتی ہوں۔ بیسیوں میرے ہاتھوں سے گذرے ہیں۔ لوگ بیکار بھی ہیں مجرم بھی ہیں۔ بدمعاش بھی ہیں۔ خیرات کرنے والے بھی ہیں مشنری بھی۔ میونسپل کمیٹیوں کے ممبر بھی۔ ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ سب کے سب ایک ہی طرح کے گنہگار ہوتے ہیں۔ اور سب کے لیے ایک ہی نجات کا راستہ (سالویشن) کھلا ہوا ہے"۔
انڈرشیفٹ "بیٹی! کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ کبھی تم نے کسی توپ بندوق بنانے والے کی روح کو بھی نجات دلائی ہے؟"
باربرا "نہیں — لیکن کیا آپ مجھے اس کا موقع دینگے؟"
انڈرشیفٹ "ہاں۔ مگر میں تم سے سوداگری کرونگا۔ اگر کل میں سالویشن کے مرکز میں تم سے ملنے آؤں تو کیا تم اس کے لیے تیار ہو کہ پرسوں میرے یہاں توپ سازی کارخانے میں ملنے آؤ؟"
باربرا "ہوشیار رہیے۔ اس سودے میں کہیں یہ نہ ہو کہ آپ کو سالویشن آرمی کی خاطر اپنا توپ سازی کا کاروبار چھوڑنا پڑے"
انڈرشیفٹ "کیا تمہیں یقین ہے کہ اس کا انجام یہ نہ ہوگا کہ تم توپ سازی

کے کارخانے کی خاطر کہیں اپنا سالویشن مرکز نہ چھوڑ دو"

باربرا "اچھی بات ہے دیکھونگی"

انڈرشیفٹ "اچھا تو میں بھی دیکھونگا (باپ اور بیٹی شرط بندھنے پر ہاتھ ملاتے ہیں) تمہارا سالویشن کا مرکز کہاں ہے؟"

باربرا "ویسٹ ہام ہیں۔ وہاں صلیب کا نشان بنا ہوا ہے کیننگ ٹاؤن میں کسی سے بھی پوچھ لیجیے گا۔ مگر آپ کا کارخانہ کہاں ہے؟"

انڈرشیفٹ "پریوال انڈریوز میں۔ وہاں تلوار کا نشان بنا ہوا ہے یورپ میں کسی سے بھی پوچھ لیجیے گا"

ترکی بہ ترکی جواب کے بعد ادھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہتی ہیں۔ اور اس کے بعد نشست ختم ہو جاتی ہے۔

دوسرا ایکٹ

ویسٹ ہام میں سالویشن آرمی کا مرکز ہے۔ جہاں غریب، بے روزگار، عادی مجرم اور مفلوج قسم کے لوگ لا کر رکھے جاتے ہیں۔ ان سے عبادت کرائی جاتی ہے انہیں مسیحیت کی تعلیم قناعت دی جاتی ہے۔ ان کا جلوس سڑکوں پر گشت کرتا ہے۔ کھلے جلسے کرتا ہے اور جلسوں میں لوگوں کو نیک اور پاکیزہ رہ کر رہنے کی تعلیم دیتا ہے۔ جن لاوارثوں کا کوئی سہارا نہیں ہوتا انہیں سالویشن آرمی کے مرکز میں لا کر معمولی گزر بسر کی سہولت دی جاتی ہے اور کہیں نوکری یا روزگار دلوانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ بے کاری یا بد اخلاقیوں کے سبب جرم کی جو

عادت لوگوں کو پڑ جاتی ہے اُسے نرمی سے برداشت کیا جاتا ہے۔ اور انہیں صاحبِ خلق و مروت بننے کی تلقین کی جاتی ہے

باربرا۔ ایک دولتمند کروڑپتی باپ کی بیٹی، گھر کا آرام و آسائش چھوڑ کر یہاں خدمتِ خلق کی خاطر آتی ہے۔ میجر کے اعزازی عہدے پر سرفراز ہے۔ وردی پہنتی ہے۔ مرکز کی نگرانی کرتی ہے۔ اس کا چاہنے والا پروفیسر کزنس جو یونانی زبان کا عالم اور پروفیسر ہے، یہاں آکر مفت خدمات انجام دیتا ہے۔ سڑک پر ڈھول بجاتا ہوا چلتا ہے۔ سالویشن آرمی کے جلسوں میں شریک ہوتا ہے اور دونوں کی محبت اور شادی کا عہد و پیمان بھی اسی بنیاد پر قائم ہے۔

سالویشن میں آئے ہوئے ایک بدکردار شخص نے ہنگامہ برپا کر رکھا ہے۔ وہ فوج سے علیحدہ کیا ہوا ایک سپاہی ہے جو اپنی محبوبہ کو تلاش کرنے یہاں آیا ہے۔ بدتمیزی کی وجہ سے ابھی سالویشن آرمی کے ایک رفیق کے منہ پر طمانچہ مار چکا ہے۔ باربرا اپنے نرم برتاؤ اور تبلیغ کے ذریعہ اسے معقولیت کی تعلیم دے رہی ہے۔ اور جھگڑا چکانے کی کوشش کر رہی ہے۔

اتنے میں انڈرشیفٹ کی آمد کی اطلاع ہوتی ہے۔ میجر باربرا اسے اندر بلوا لیتی ہے۔ مرکز کا اندرونی حصہ دکھانے کے بعد اسے باہر لے جاتی ہے۔

دروازے پر سالویشن کے ایک اور کارکن شرلی سے ملاقات ہوتی ہے۔

باربرا "اوہو۔ تم۔ مسٹر شرلی! تم ان سے ملو۔ یہ میرے والد ہیں۔ میں نے تمہیں غالباً بتایا ہوگا کہ میرے والد سکیولرسٹ (مذہب کے معاملے میں آزاد خیال) تھے۔ اور تم بھی اسی خیال کے آدمی ہو۔ شاید تم دونوں ایک

دوسرے کے لیے سہولت بخش ثابت ہوسکو"
انڈرشیفٹ۔" (حیرت زدہ ہوکر) کیا کہا سیکولرسٹ ؟ قطعی نہیں میں تو اس کے بالکل برعکس ایک مشک (ابہام پسند ۔ جو خدا کے وجود و عدم کا یقین نہیں کر سکتے) ہوں"
باربرا ۔" اوہ ۔ مجھ سے غلطی ہوئی ۔ معاف کیجیے ۔ لیکن اجازت ہو تو میں دریافت کروں کہ ابا جان آپ کا مذہب کیا ہے ؟ یعنی اگر مجھے آپ کا تعارف کرانا ہو تو آپ کا کیا مذہب بتاؤں ؟"
انڈرشیفٹ " میرا مذہب ؟ میری بچی، میں ایک کروڑپتی ہوں اور بس یہی میرا مذہب ہے"
باربرا" تب تو مجھے اندیشہ ہے کہ آپ اور مسٹر شرلی ایک دوسرے کے لیے سہولت بخش نہیں ہو سکتے ۔ کیونکہ شرلی تم تو کروڑپتی نہیں ہو ۔ ہے نا ؟"
شرلی "جی ہاں میں کروڑپتی نہیں ہوں ۔ اور اس پر فخر کرتا ہوں"
انڈرشیفٹ " (گہری سنجیدگی سے) غربت و افلاس، میرے دوست غریب ہونا کوئی فخر کی بات نہیں ہے"
شرلی " (غصے سے) آخر آپ کے کروڑوں روپیے کس نے پیدا کیے ۔ میں نے اور مجھ جیسے اور غریبوں نے ۔ کیا چیز ہے جس نے ہمیں غریب بنایا ۔ وہی جو آپ کو دولتمند بناتی ہے ۔ اگر آپ کی ساری آمدنی بھی مجھے دی جائے تب بھی میں اس کے بدلے میں آپ کا جیسا ضمیر قبول نہیں کرونگا"
انڈرشیفٹ " اور اگر تمہارا جیسا ضمیر بھی مجھے دیا جائے تو میں اس کے بدلے

میں تمہاری آمدنی قبول نہیں کرونگا"

دونوں رخصت ہو جاتے ہیں۔ انڈرشیفٹ بیٹی کو اجازت دیتا ہے کہ وہ اپنے فرائض میں مصروف رہے۔ اور باپ کو معائنے کے لیے آزاد چھوڑ دے۔

سالویشن کے مرکز میں جلوس ترتیب پانے والا ہے۔ باربرا کا دوست مسٹر کزنس ایک ڈھول گلے میں لٹکا چکے ہیں جو انہیں سرِ عام جلوس کے ساتھ بجاتے ہوئے چلنا ہے۔ انڈرشیفٹ کو قریب دیکھ کر ہونے والے خسر کے پاس آبیٹھتے ہیں اور ادھر اُدھر کی باتیں شروع ہو جاتی ہیں۔ کزنس انڈرشیفٹ سے پوچھتا ہے کہ سالویشن کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے۔

"میرا خیال ہے کہ یہاں دو چیزوں کی کمی ہے جو بہت ضروری ہیں"
کزنس سمجھتا ہے کہ دو چیزوں سے مراد بپتسمہ دینا یا چرچ کی روایت کے مطابق عمل کرنا ہے لیکن انڈرشیفٹ اس کے تصور کو اونچا اُڑنے سے روکتا ہے۔

"نہیں۔ دو چیزیں ہیں روپیہ ——— اور بارُود"

کزنس "ہاں (حیرت سے لیکن دلچسپی لیتے ہوئے) ہمارے حکمراں طبقے کی عام رائے اسی قسم کی ہوتی ہے۔ البتہ عجیب چیز یہ ہے کہ ایک شخص نے اس کا اعتراف تو کیا"

انڈرشیفٹ "جی ہاں ——— دوست"

کرِونس "معاف کیجیے گا، کیا آپ کے مذہب میں عزت، انصاف، سچائی، محبت، رحم وغیرہ کا بھی کوئی مقام ہے؟"

انڈرشفٹ "ہاں — ضرور ہے۔ دولتمند، مضبوط اور محفوظ و مطمئن زندگی کے لیے یہ سب چیزیں تفریح کا درجہ رکھتی ہیں۔"

کرِزنس "فرض کیجیے تمام اوصاف انسانیت ایک طرف ہوں اور دولت اور بارود دوسری طرف اور کسی کو ان دونوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہو تو وہ کیا انتخاب کرے؟"

انڈرشفٹ "دولت اور بارود کا انتخاب کرنا چاہیے۔ کیونکہ جب تک یہ چیزیں نہ ہوں اس وقت تک تم رحم و انصاف، سچائی، عزت، مروت وغیرہ حاصل نہیں کرسکتے"

"تو یہ ہے آپ کا مذہب؟"

"جی ہاں —— یہ"

کرِزنس "باربرا اس مذہب کے لیے تیار نہ ہوگی۔ آپ کو اپنے مذہب اور اپنی بیٹی کے درمیان کسی ایک چیز کا انتخاب کرنا ہوگا"

انڈرشفٹ "اسی طرح تمہیں بھی میرے دوست۔ کیونکہ باربرا کو ایک دن یہ معلوم ہو جائیگا کہ تمہارا ڈھول اندر سے خالی ہے۔"

کزنس یونانی زبان کے گیت کا ترجمہ سناتا ہے جس میں دولت جمع کرنے اور تباہی و موت کا سامان بارود اور بندوق پیدا کرنے کے خلاف جذبات کا اظہار کیا گیا ہے۔ اس پر پھر بحث ہوتی ہے۔ کزنس بحث کے دوران میں باربرا

کی تعریف کرتا ہے۔

انڈرشفٹ "ہاں۔ باربرا انڈرشفٹ واقعی اس تعریف کی مستحق ہے۔ کیونکہ اس کی بلند نگاہی دراصل اندرونی قوت کا نتیجہ ہے"

کزنس "یہ آپ کو کیا معلوم؟"

انڈرشفٹ "(جوش اور جذبہ کے ساتھ) یہ انڈرشفٹ کو ورثے میں ملتا ہے۔ میں اپنی روشنی اپنی بیٹی کے ہاتھوں میں دے دونگا۔ وہ لوگوں کو میرے مذہب پر لائیگی اور میرے اقوال سنائیگی۔

کزنس "کیا اقوال؟ روپیہ اور بارود؟"

انڈرشفٹ "ہاں، روپیہ اور بارود۔ آزادی و قوت۔ زندگی اور موت دونوں کی حکمرانی"

اس پر کزنس اُسے ذلیل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

انڈرشفٹ "چھ — شہ — پروفیسر! ہمیں چیزوں کو ان کے اصلی نام سے پکارنا چاہیے۔ میں ایک کروڑپتی ہوں۔ تم ایک شاعر ہو۔ باربرا روحوں کو پھانسنے والی ہے۔ بھلا تم ہی بتاؤ۔ ہم تینوں کو کیا واسطہ ہے اس عام ہجوم سے جس میں غلام اور بیکار اپاہج لوگ بھرے پڑے ہیں؟ (ہجوم عام کے لیے تحقیر کے تیور دکھا کر وہ بیٹھ جاتا ہے)

کزنس "ذرا خیال رکھیے۔ آپ کی بیٹی کو عام آدمیوں کے اس ہجوم سے محبت ہے۔ اور مجھے بھی ہے۔ مگر آپ کو اس محبت کی چاشنی کیا ملی ہو گی۔

انڈرشفٹ "(سرد مہری لیکن طنز کے لہجے میں) کیا کہا؟ کیا تمہیں غربت اور

افلاس سے ایسی ہی محبت ہے جیسے سینٹ فرانسس کو تھی؟ کیا تمہیں گندگی سے ایسی ہی محبت ہے جیسے مجذوب سائمن کو تھی؟ کیا تمہیں بیماری اور مصائب سے ویسی ہی محبت ہے جیسے ہماری نرسوں اور خیرات دینے والوں کو ہوتی ہے؟ یہ تو کوئی خوبی کی بات نہیں ہے۔ یہ اوصاف حمیدہ نہیں ہیں بلکہ تمام حماقتوں میں سب سے زیادہ غیر فطری حماقت ہیں۔ غریبوں سے محبت کر کے ایک کروڑپتی کی پوتی کو لطف آسکتا ہے۔ یونیورسٹی کے کسی پروفیسر کو بھی اس میں خوشی حاصل ہو سکتی ہے لیکن میں خود ایک عام آدمی رہا ہوں اور ایک غریب آدمی رہا ہوں مجھے تو اس میں کوئی خوشی کوئی لطف محسوس نہیں ہوتا۔ یہ کام غریبوں ہی پر چھوڑ دو کہ وہ غربت کو ایک برکت کا سبب کہتے رہیں۔ یہ فرض بزدلوں کے لیے ہی رہنے دو کہ وہ عاجزی وانکساری کی تبلیغ کر کے اپنے لیے بزدلی کا مذہب اختیار کر لیں۔ ہم اس سے زیادہ حقیقت کو سمجھتے ہیں۔ ہم تینوں کو عام ہجوم اور عام لوگوں سے بلند سطح پر متحد ہو کر کھڑے ہونا چاہیے۔ ورنہ ہم ان غریبوں اور بزدلوں کی اولاد کو اس قابل کیسے بنائیں گے کہ وہ ہماری بلند سطح تک بلند ہو سکیں۔ باربرا کو سالویشن آرمی کا ہو کر نہیں رہنا چاہیے۔ بلکہ ہمارے ساتھ آنا چاہیے۔"

کزنس:۔ "اچھا تو اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ آپ اس سے اسی طرح باتیں کر کے ــــ جیسے مجھ سے بحث کر رہے ہیں ــــ سالویشن آرمی سے الگ کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے تو میں کہوں گا کہ آپ باربرا کو جانتے ہی نہیں"

انڈرشفٹ "میرے دوست! جس چیز کو میں خرید سکتا ہوں اس کے لیے درخواست نہیں کرتا۔"

کرِنس "(غصے میں) تو کیا آپ کا یہ مطلب سمجھا جائے کہ آپ بار برا کو خرید سکتے ہیں؟"

انڈرشفٹ "نہیں میں تو سالویشن آرمی کو خرید سکتا ہوں"

کزنس "ناممکن ہے"

انڈرشفٹ "اچھا دیکھیے گا۔ تمام مذہبی تنظیمیں صرف دولتمندوں کے ہاتھ اپنے آپ کو فروخت کر کے ہی زندہ رہتی ہیں"

کزنس "لیکن سالویشن آرمی نہیں ۔ یہ تو غریبوں کا گرجا گھر ہے"

انڈرشفٹ ۔ چنانچہ اس کے خریدے جانے کا یہ اور اہم سبب ہے"

کزنس "میرا خیال ہے اب تک آپ کو یہ بھی نہیں معلوم کہ سالویشن آرمی غریبوں کے لیے کیا کرتی ہے؟"

انڈرشفٹ "مجھے خوب معلوم ہے ۔ سالویشن آرمی ان کے دانت کھینچ لیتی ہے ۔ ایک بیوپاری کی حیثیت سے میرے لیے اتنا جاننا کافی ہے"

کزنس "بکواس ہے ۔ سالویشن آرمی ان غریبوں کو سنجیدہ بناتی ہے"۔

انڈرشفٹ ۔ "ہاں میں سنجیدہ مزدور کو پسند کرتا ہوں۔ کیونکہ اس کے کام سے منافع اور بڑھتا ہے"۔

کزنس "ایماندار بناتی ہے"

انڈرشفٹ "ایماندار مزدور تو اور بھی اچھا، کیونکہ بچت دکھاتا ہے"

کزنس "ان کے گھروں سے رشتہ مضبوط کرتی ہے"

انڈرشفٹ "بہت خوب تب تو وہ کارخانہ چھوڑ کر جانے کے بجائے ہر صورت میں ایک ہی جگہ کام کرنے کے عادی ہونگے"

کرِنس "انہیں خوش اور مطمئن رہنا سکھاتی ہے"
انڈرشفٹ "انقلاب کے مقابلے پر یہ بہت بڑی ضمانت ہے"
کرِنس "انہیں بے غرض بناتی ہے"
انڈرشفٹ "یعنی انہیں اپنے ذاتی مفاد سے کوئی غرض نہیں رہتی۔ یہ تو ایسی خوبی ہے کہ واہ وا۔ میرے لیے بہت مفید"
کرِنس "ان کے خیال کو آسمانی نعمتوں اور الوہی برکتوں کی طرف لگائے رکھتی ہے"
انڈرشفٹ "(اُٹھتے ہوئے) اور ٹریڈ یونین ازم (مزدور تنظیموں) اور سوشلزم کی طرف توجہ نہیں جانے دیتی۔ بہت اچھے کیا کہنے!"

بحث نقطۂ عروج پر پہنچ کر ٹوٹ گئی کیونکہ کرِنس کے لیے تمام راستے بند ہو چکے تھے۔

جلوس تیار ہو رہا ہے۔ آج جلسہ عام ہے۔ وہاں چندہ بھی جمع کرنا ہے۔ چندے کی کمی پڑ گئی ہے۔ سردی کا موسم سر پر آ رہا ہے اور اندیشہ ہے کہ اگر چندے کافی نہ آئے تو سالویشن آرمی کے موجودہ مرکز کا چلانا دشوار ہو جائیگا۔ اخبارات میں چندے کی اپیل شائع کرنے کے لیے تیار کی جا رہی ہے۔ مسز بینس — سالویشن کے مرکز کی سب سے بڑی عہدیدار کا خیال ہے کہ جب وہ خلوص و عجز کے ساتھ خدا سے دعا کرتی ہے تو روپے کا کوئی نہ کوئی انتظام غیب سے ہو جاتا ہے۔ مسز بینس نے آج بھی عبادت کے بعد خاص طور پر دعا مانگی ہے۔ اور باربرا سے کہلا کر بھیجا ہے کہ وہ اس کے باپ سے ملاقات کرنا چاہتی ہے۔ چنانچہ وہ بلائی

جاتی ہے۔ سالویشن آرمی کمشنر کی وردی میں ملبوس ایک عمر رسیدہ خاتون آتی ہے اور باربرا مسٹر بینس کا تعارف اپنے باپ سے کراتی ہے۔

"آپ نے ہمارا یہ مرکز دیکھا" مسز بینس نے انڈر شفٹ سے سوال کیا۔ "آپ جانتے ہیں ہم لوگ کس کام میں لگے ہوئے ہیں"

انڈر شفٹ (نہایت تمیز کے ساتھ) جی ہاں ـــ میں کیا، مسز بینس، یہ تو پوری قوم جانتی ہے"

مسز بینس "نہیں جناب۔ پوری قوم نہیں جانتی۔ ورنہ سارے ملک کے طول و عرض میں اپنا کام چلانے کے لیے ہمیں روپیے کی کمی سے اتنا محتاج نہ ہونا پڑتا جتنا آج ہم ہو چکے ہیں۔ میں تو عرض کرونگی کہ اگر ہم لوگ یہ کام نہ کرتے تو ان جاڑوں میں لندن کی سڑکوں پر ہنگامہ اور بلوہ ہو جاتا"۔

انڈر شفٹ "کیا واقعی آپ کا یہ خیال ہے؟"

مسز بینس "جی ہاں۔ میں تو یہی سمجھتی ہوں۔ مجھے ۱۸۸۶ء یاد ہے۔ جب آپ دولتمند لوگ غریبوں کی طرف سے اتنے سنگی القلب ہو گئے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ غریبوں نے پال مال علاقے میں آپ دولتمندوں کے تفریحی کلب کی کھڑکیاں توڑ ڈالی تھیں"

انڈر شفٹ (نگاہ میں ان غریبوں کی ہنگامہ خیزی کے لیے رضامندی کا جذبہ جھلک رہا ہے) جی ہاں مجھے بھی یاد ہے، دوسرے ہی روز منشن ہاؤس فنڈ تیس ہزار پونڈ سے بڑھ کر ستر ہزار پونڈ تک پہنچ گیا تھا"

مسز بینس "اچھا تو اب آپ کیا کہتے ہیں کیا آپ عوام پر قابو رکھنے میں ہماری

مدد نہیں کرینگے۔ اس کے بعد وہ کھڑکیاں نہیں توڑا کرینگے۔ اے پرائس (مرکز کا ایک عام آدمی) یہاں آؤ۔ آپ سے ہیلو (پرائس سامنے آتا ہے تاکہ اس پر نگاہ پڑے) تمہیں یاد ہے وہ کھڑکیاں توڑنے والا واقعہ؟

پرائس "جی ہاں یاد ہے۔ میرے باپ سمجھے کہ انقلاب ہو گیا"

مسز بینیس "تو اب پھر تم کھڑکیاں توڑو گے کیا؟"

پرائس " ہرگز نہیں۔ محترمہ۔ مجھ پر تو جنت کی کھڑکیاں کھل چکی ہیں۔ اب میں یہ سمجھنے لگا ہوں کہ دولتمند لوگ بھی میری طرح گناہگار ہیں۔

اس مشاہدے پر مسز بینیس کی طرح انڈر شفٹ بھی مطمئن ہے۔ اور مسز بینیس اور ان کی سالویشن آرمی کا شکریہ ادا کرتا ہے۔ اتنے میں مسز بینیس میجر باربرا کو آواز دیتی ہے "خوشخبری سنو یہ میری دعا کا جواب مل گیا"۔

خوشخبری یہ ہے کہ دس ہزار پونڈ کی سخت ضرورت تھی پانچ ہزار پونڈ لندن کے ایک کاروباری آدمی نے چندہ دے دیا۔ اگر پانچ اور آدمی ایک ایک ہزار پونڈ عنایت کر دیں تو یہ موسم بڑے مزے میں گزر جائے۔ باربرا خوش ہے، لیکن جب اس چندہ دینے والے کا نام دہراتا ہے سر ہوریس بوجر — تو

باربرا "کون بوجر؟ یہ وہی تو نہیں شراب کا بیوپاری؟ بوجرس وسکی!"

انڈر شفٹ "ہاں ہاں وہی۔ پبلک کاموں میں حصہ لینے والوں میں وہ بہت اہم شخص ہے، ابھی پچھلے دنوں اس نے ہنگٹن کی خانقاہ درست کرائی اور اس کے عوض میں وہ بیرونٹ (شاہی خطاب یافتہ بن گیا۔ ۵ لاکھ پونڈ اس نے اپنی پارٹی کو چندہ دیا اور اس کے انعام میں نہ بیرن (بلند ترین خطاب یافتہ

یا نواب) بنا دیا گیا"

شرلی "اب یہ جو پانچ ہزار پونڈ چندہ اس نے ہمیں دیا۔ اس کے بدلے میں کیا ملیگا؟"

انڈرشفٹ "اب تو ملنے کو کچھ نہیں رہ گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ پانچ ہزار اپنی روحانی نجات کے لیے دیا ہوگا"

اس پر مسز بینس بہت خوش ہوتی ہیں اور انڈرشفٹ کی تعریف کرتی ہیں کہ آپ کے بڑے بڑے دولتمند دوست ہیں۔ آپ چاہیں تو کہہ سُن کر ہمیں پانچ ہزار اور دلوا سکتے ہیں۔ آج شام کو مائل انڈ روڈ پر جلسۂ عام ہے اگر وہاں یا اس سے پہلے پانچ ہزار باقی چندہ بھی مل جائے تو ہم وہاں عطیہ دینے والے کے نام کا اعلان کر دینگے۔

انڈرشفٹ "(طنزیہ مسرت جھلک رہی ہے) مسز بینس۔ آپ کا کوئی توڑ نہیں ہے۔ میں آپ کو مایوس نہیں کرونگا۔ اور پھر اس پر میں خود بھی مطمئن نہیں ہو سکتا کہ سر بوجر تو روپیہ دے اور میں دیکھتا رہوں۔ اچھا تو آپ کو باقی پانچ ہزار پونڈ بھی مل جائینگے"۔

مسز بینس "خدا کا شکر ہے"

انڈرشفٹ "اور میرا شکریہ نہیں؟"

مسز بینس "اوہو۔ خباب والا۔ آپ بگڑیے نہیں۔ ایک اچھے شریف الطبع آدمی ہونے پر آپ کو شرم نہیں آنی چاہیے۔ وہ خدائے پاک و برتر آپ پر اپنی کثیر رحمتیں نازل کریگا۔ اور ہم جو عبادت یا دعا کرینگے وہ آپ کو جیتے جی ہر بلا سے محفوظ

کیے رہنگی (ذرا احتیاط کے لہجے میں) اگر آپ مجھے پانچ ہزار کا چیک عنایت فرمادیں تو اچھا ہے تاکہ میں جلسۂ عام میں لوگوں کے سامنے پیش کرسکوں۔ ہے نا جینی، جاؤ ذرا لپک کر قلم اور روشنائی لے آؤ"

انڈرشفٹ "انہیں تکلیف نہ دیجیے۔ میرے پاس فونٹین پن موجود ہے (وہ میز کی طرف مڑتا ہے اور پانچ ہزار کے چیک پر دستخط کرنا چاہتا ہے)

باربرا کو جیسے معلوم ہوا کہ اس کا باپ یہ چندہ دے رہا ہے۔ وہ چلائی۔

"ٹھہرو" وہ غصے اور نفرت کے لہجے میں احتجاج کرتی ہے کہ ایک تو تم لوگوں نے اس شخص کا پانچ ہزار روپیہ قبول کیا جو شراب کا بیوپاری ہے اور ناجائز روپیہ حاصل کرتا ہے، اور دوسرے اس شخص (انڈرشفٹ) سے روپیہ لیا جا رہا ہے جو لوگوں کی موت اور تباہی کا سامان پیدا کرتا ہے یعنی اصولی طور پر سالویشن آرمی جیسے نیک کام کا مرکز جسمانی اور روحانی تباہی لانے والوں کے روپے سے چلایا جانا ایک جرم ہے۔

مسز بینس "پیاری باربرا۔ لارڈ سیکس منڈھم (سر بوجر) کو بھی ہماری طرح روحانی نجات کی ضرورت ہے۔ اگر خدا کا منشا یہی ہے کہ وہ اس طرح نیک کام میں روپے کی مدد دے کر نجات کی راہ تلاش کرے تو کیا ہم اپنی دعا کی قبولیت کے خلاف لڑنے کھڑے ہو جائیں؟"

باربرا "ہاں مجھے معلوم ہے کہ سر بوجر کے پاس بھی روح ہے جسے نجات کی ضرورت ہے لیکن اگر وہ روحانی نجات چاہے تو اسے یہاں ہمارے مرکز میں داخل ہونا چاہیے۔ میں اس کی نجات کے لیے کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھونگی۔ مگر وہ

توہمیں خریدنے کے لیے چیک بھیجتا ہے۔ اور ہمیشہ کی طرح آئندہ بھی وہی گنڈا کا دیا جاری رکھنے پر تلا ہوا ہے"

انڈرشفٹ "مگر میری بچی۔ الکوہل (نشہ آور جزو شراب) بڑی ضروری چیز ہے۔ وہ بیماروں کا علاج کرتی ہے۔

باربرا "نہیں کوئی نہیں"

انڈرشفٹ "اچھا یوں نہ سہی، یوں سمجھو کہ ڈاکٹروں کے کام آتی ہے۔ شاید تمہیں اس بیان پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ الکوہل کا نشہ ان کروڑوں آدمیوں کی زندگی کو ان کے لیے قابل برداشت بنا دیتا ہے جو اگر تھوڑی دیر کے لیے بھی ہوش و حواس کو رخصت نہ کرتے تو انہیں اپنے حالات کا سہارنا مشکل ہو جاتا۔ الکوہل ایسی شے ہے جس کی بدولت پارلیمنٹ کے ممبر رات کو گیارہ بجے بیٹھ کر وہ کام کرنا گوارا کرتے ہیں جو کوئی معقول آدمی صبح کے گیارہ بجے بھی انجام دینا گوارا نہیں کریگا۔ اس میں سر بوجر کا بھلا کیا قصور ہے کہ غریبوں کی ایک فیصدی سے بھی کم تعداد ایسے اعلیٰ اور بیش قیمت تحفے کا غلط استعمال کرتی ہے؟"

اب مسز بینس بھی استدلال میں انڈرشفٹ کی حمایت کرتی ہیں۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ سر بوجر کے روپیہ سے کام لے کر ہم گنہگار روحوں کو شراب اور بدکاری سے بچائینگے۔ اس طرح خود سر بوجر کا ہتھیار اس کے کاروبار پر حملہ کریگا۔ اس کی بے غرضی دیکھو۔ انڈرشفٹ اپنی بے غرضی بھی اسی ضمن میں جتا دیتا ہے کہ اگر دنیا سے جنگ ختم ہو جائیگی اور امن کی فضا رہیگی تو میرا کاروبار ختم

ہو جائیگا لیکن اس کے باوجود میں تمہاری امن پسند تحریک کو روپیہ دے رہا ہوں۔

"جس شخص کو بھی آپ اپنے میں شامل کرتی ہیں وہ لڑائی کے خلاف ایک ووٹ ہوتا ہے۔ اس کے باوجود میں آپ کو یہ روپیہ پیش کر رہا ہوں تاکہ آپ میری تجارت کی تباہی میں اور تیزی دکھائیں"

یہ کہتا ہے اور چیک سپرد کر دیتا ہے۔ مسز بینس اور سب حاضرین خوش ہیں کہ ان کی دعاؤں نے اثر دکھایا۔ بار برا کو قرار نہیں۔ وہ عجیب ذہنی کشمکش میں مبتلا ہو گئی ہے۔ اس کی نگاہوں کے سامنے سے نقاب ہٹ رہا ہے۔

جلوس تیار ہو گیا۔ آج جوش و خروش بھی کافی ہے۔ جلسہ عام شروع ہونے سے پہلے انڈر شفٹ منع کرتا ہے کہ پانچ ہزار پونڈ دینے والوں میں اس کا نام نہ لیا جائے کیونکہ اگر خبر عام ہوئی تو اور اداروں کو بھی اس سے چندے لینے دوڑ پڑینگے لیکن اس عذر کو سالویشن کے عہدیدار انڈر شفٹ کی انکساری اور نیک طینتی سمجھتے ہیں۔

بار برا جلوس کے ساتھ جانے اور جلسے میں شریک ہونے سے انکار کر دیتی ہے اب بار برا ان لوگوں کی طرف زیادہ متوجہ ہے جنہیں وہ پہلے ناقص اور نااہل سمجھ رہی تھی۔ اور سالویشن مرکز میں سناٹا ہو جاتا ہے۔

تیسرا ایکٹ

دوسرا دن۔ لیڈی برٹو مارٹ کا مکان۔ میجر بار برا گھر پر ہے۔ آج اس کے جسم پر وردی نہیں۔ اس نے اعلیٰ درجہ کا لباس زیب تن کیا ہے۔ بار برا کا موڈ

خراب ہے۔ وہ چلتی ہوا سے الجھتی ہے کیونکہ اس کے خوابوں کی دنیا بکھر گئی۔

سارہ کا اُمیدوار چارلس لوماکس، لیڈی برٹو مارٹ، سارہ اور باربرا کے علاوہ کزنس بھی موجود ہے۔ کزنس نے کل رات شراب پینے کا اعتراف کیا ہے کیونکہ انڈرشفٹ نے شراب کے لیے روپیہ خرچ کیا اور یونانی کے ادب عالیہ نے اس کی ترغیب دی۔

آج کا پروگرام یہ ہے کہ سب لوگ حسب وعدہ مسٹر انڈرشفٹ کا اسلحہ ساز کارخانہ اور کارخانے کی بستی دیکھنے جائیں۔ اتنے میں لیڈی برٹو کو ایک ہدایت آجاتی ہے۔

"کزنس۔ سنو۔ باربرا نے تو سالویشن آرمی سے قطع تعلق کرلیا۔ بہتر یہ ہے کہ اب تم بھی وہاں سے چلے آؤ۔ کیونکہ اب ہم یہ نہیں دیکھ سکتے کہ تم سڑک پر ڈھول پیٹتے پھرو"

کزنس "لیڈی برٹو۔ آپ کے حکم کی پہلے ہی تعمیل ہو چکی ہے"۔

باربرا پر ایک اور حقیقت بے نقاب ہوتی ہے کہ پروفیسر صاحب سالویشن آرمی میں خدمتِ خلق کے لیے نہیں، بلکہ باربرا کو حاصل کرنے کے لیے پہنچے تھے۔

بات سے بات نکلتی ہے۔ لوماکس جو بہت بے لگام نوجوان ہے، اس کی زبان سے کوئی بات نکل گئی جس پر لیڈی برٹو نے اُسے ڈانٹا کہ اگر بکواس کرنا ہی ہے تو ذرا سلیقے سے کرو" انگلینڈ کی اعلیٰ سوسائٹی میں ہر عمر کے لوگ بکواس کرتے ہیں۔ احمقانہ فارمولے دہرائے چلے جاتے ہیں اور اپنے جی میں سوچتے ہیں کہ یہ عقلمندی فرمائی جا رہی ہے" .... "لوماکس تم صرف ٹائمز

اخبار پڑھا کرو۔ لغویات اس میں بھی ہوتی ہیں لیکن کم از کم ان کی زبان خاصی منجھی ہوئی ہوتی ہے"

گفتگو کے دوران میں مسٹر انڈر شفٹ آ گئے۔

لڑکے اور لڑکیاں دوسرے کمرے میں جا چکے ہیں۔ تنہائی کا بہتر استعمال کرنے کے لیے لیڈی برٹو مارٹ اپنے شوہر سے روپے پیسے کی گفتگو شروع کر دیتی ہے — ابھی دس سال تک سارہ کے شوہر کو صرف ۸۰۰ پونڈ سالانہ ملتے رہینگے۔ اس کے بعد اسے پوری جائداد مل جائیگی۔ باربرا کو البتہ زیادہ روپیے کی ضرورت ہے، کیونکہ کزنس کے پاس کوئی جائداد نہیں ہے۔ اب سوال رہ جاتا ہے اکلوتے بیٹے اسٹیفن کی گزر بسر کا۔

بیٹے کو وارث بنانے کے لیے انڈر شفٹ کسی طرح تیار نہیں ہے۔ کیونکہ جتنے کارخانے، کاروبار، بستیاں اس کی کمپنی کی ملکیت ہیں وہ اس کو اپنے باپ سے وراثت میں نہیں ملیں، بلکہ دستور یہ رہا ہے کہ کسی لاوارث یا ناجائز ولادت کے لڑکے کو تلاش کر کے جانشین بنا دیا جاتا ہے۔ اور بعد میں وہ بھی اسی دستور کی پابندی کرتا ہے۔ انڈر شفٹ کا اصرار ہے کہ وہ پورے کاروبار کے مورث اعلیٰ کی وصیت سے غداری نہیں کریگا بلکہ کسی عام لاوارث یا ناجائز لڑکے کو چن کر اسے وارث بنا دیگا۔ ممکن ہے وہ اٹلی کا باشندہ ہو یا جرمنی کا — لیکن اس کا اپنا بیٹا ہرگز وارث نہیں ہوگا۔

میاں بیوی کی بحث تلخ صورت اختیار کر لیتی ہے۔ بیوی کا اصرار ہے کہ بیٹے ہی کو وارث بنایا جائے اور شوہر کی ضد ہے کہ وہ اصول نہیں توڑیگا۔

لتنے میں اسٹفن بلا لیا جاتا ہے۔

اسٹفن سے گفتگو ہوتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ عجب نٹ کھٹ لڑکا ہے۔ تجارت سے اسے نفرت ہے اور وہ باپ کے کاروبار میں دلچسپی رکھنے سے انکار کرتا ہے۔ اس پر لیڈی برٹو اور بگڑ جاتی ہے۔ اُسے بیٹے سے سخت مایوسی ہوئی۔

دریافت کرنے پر اسٹفن باپ کو جواب دیتا ہے کہ آرٹ، فلسفہ، فن و ادب سے بھی اسے کوئی دلچسپی نہیں۔ اور وہ اس لائن پر بھی نہیں جانا چاہتا۔ فوج، دینی سرگرمی اور وکالت کا کوئی ذوق نہیں۔ قانون اس نے پڑھا نہیں اور پھر آخر وہ زندگی میں کیا پیشہ اختیار کرنا چاہتا ہے؟ اور اسے کس علم سے واقفیت ہے؟

اسٹفن "مجھے صحیح اور غلط، جھوٹ اور سچ کے درمیان فرق معلوم ہے"۔

انڈرشفٹ "(بہت زیادہ آدبدا کر) یہ مت کہو۔ یہ کیا بات ہوئی کہ تجارت کی قابلیت نہیں ہے۔ قانون کا علم نہیں ہے۔ فن و ادب سے دلچسپی نہیں ہے فلسفے کی طرف رغبت نہیں ہے۔ بس اگر کچھ معلوم ہے تو وہ راز (جھوٹ اور سچ کا فرق جس راز کی تحقیق میں سارے فلسفی چکرا گئے ہیں۔ تمام قانون جو اس گرہ بڑا چکے ہیں۔ تمام تجارتی لوگ کشمکش میں پھنس گئے ہیں۔ اور اکثر فن کار بالکل تباہ و برباد ہو چکے ہیں ـــ جھوٹ اور سچ، حق اور باطل کا فرق معلوم کر لیا تم نے؟ تم تو بے پناہ آدمی ہو۔ استادوں کے استاد ـــ بلکہ ان کے بھی خداوند۔ اور صرف بائیس برس کی عمر میں!"

اس طرح اینڈر شفٹ اپنے بیٹے کی خام خیالی اور خوش فہمی کا مذاق اُڑاتا ہے
ماں پوچھتی ہے کہ اچھا پھر باپ ہی بتائے کہ بیٹے کو کیا پیشہ اختیار کرنا چاہیے
"جو چاہے اختیار کرے۔ اسے کچھ بھی نہیں آتا، اور سمجھتا ہے کہ سب کچھ
آتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سیاسی زندگی اختیار کریگا۔ ابھی سے کسی
کا پرائیوٹ سکرٹری بن جائے آگے چل کر حکومت میں نائب سکرٹری بن سکیگا
اور بعد میں وہاں بھی بے سہارے چھوڑ دیا جائیگا۔ آخر میں یہ ہوگا کہ وہ خزانے
کے شعبے (سرکاری تائید) کی بنچوں پر بیٹھا رہ جائیگا"۔

اسٹفن (پھر اچھلتا ہے) "مجھے افسوس ہے۔ جناب بحیثیت باپ کے، جو آپ
کی عزت مجھ پر فرض ہے، وہ بھلا دینے کے لیے آپ ہی مجبور کر رہے ہیں۔ آپ
جانتے ہیں میں ایک انگریز ہوں۔ اور میں کسی طرح برداشت نہیں کر سکتا
کہ میرے ملک کی حکومت کی توہین کی جائے" (اپنے ہاتھ جیبوں میں ٹھونس
لیتا ہے اور غصے سے کھڑکی کی طرف ٹہلتا ہوا چلا جاتا ہے)

انڈر شفٹ (بے دردی کی جھلک کے ساتھ) تمہارے ملک کی حکومت!
کیا کہتے ہو۔ میں ہوں تمہارے ملک کی حکومت۔ میں اور میرا شریک کار
لازارس۔ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ تم اور تم جیسے آدھے درجن شوقین جو وہاں گپ
شپ کے اڈے پر لائن لگا کر بیٹھے رہتے ہیں اور اِدھر اُدھر کی ہانکا کرتے
ہیں، انڈر شفٹ اور لازارس پر حکومت کر سکتے ہیں۔ نہیں، عزیزم یہ بات
نہیں۔ تم صرف وہی کام کروگے جس سے ہمیں فائدہ ہوتا ہے۔ تم جنگ کھڑکا
دوگے اس وقت جب ہمیں جنگ کی ضرورت ہوگی۔ اور جب ہم جنگ کو

مناسب نہیں سمجھیں گے تو تم لوگ جنگ سے ہاتھ روک لو گے اور امن قائم کرو گے۔ جب ہم طے کرینگے کہ فلاں فلاں کام ہونے چاہییں تو تم فوراً اس تحقیق پر پہنچو گے کہ ملک کی تجارت کو فلاں فلاں کاموں کی ضرورت ہے۔ اور جب میں اپنا منافع اونچا رکھنے کے لیے کسی اقدام کو مناسب سمجھتا ہوں تو تم لوگ فوراً اس نتیجے تک پہنچ جاتے ہو کہ میری ضرورت اصل میں قومی ضرورت ہے۔ اور وہ اقدام قومی مفاد کے لیے ہونا ہی چاہیے۔ اور جب میرے مخالفین، کچھ اور لوگ میرے منافع کو گرانے کی کوشش کرتے ہیں تو تم اُنہیں روکنے کے لیے پولیس اور فوج بلا لیتے ہو۔ اس کے انعام میں میرے اخبارات تمہاری خوب تعریف کرتے ہیں اور جی بھر کر تائید کرتے ہیں اور تمہیں اس تصور کی مسرت بخشتے ہیں کہ تم واقعی بڑے لاجواب سیاستداں اور مدبر ہو۔ شہ — تمہارے ملک کی حکومت! جاؤ۔ ہٹو، اپنے مضامین اور تقریروں کے کھلونوں سے جی بہلاتے رہو۔ تاریخی پارٹیاں، بڑے بڑے لیڈر، تپتے ہوئے سوالات — اہم مسائل اور ان جیسے دوسرے کھلونوں میں اُلجھے رہو، میں تو اپنی حساب کی کھتونی کی طرف جاتا ہوں تاکہ روپیہ دوں اور جس راگنی میں چاہوں بانسری بجواؤں"۔

اسٹفن باپ کا مذاق اُڑاتا ہے کہ اس نے ہمارے ملک کے سیاستدانوں، رہنماؤں اور پارٹی لیڈروں کو کتنا حقیر بنا کر پیش کیا ہے۔ دولت کیا جمع کر لی ہے کہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتا۔ روپیے کی بدولت چونکہ عزت بھی ملی ہے اس لیے وہ سمجھتا ہے کہ بس اس کی اور اس جیسے دوسرے دولتمندوں کی قوت ہے،

جو انگلینڈ پر حکمرانی کر رہی ہے۔

انڈر شفٹ "اچھا، تم بتاؤ۔ اگر ہم نہیں تو پھر کون انگلینڈ پر حکمرانی کر رہا ہے؟"

اسٹفن "کیرکٹر — ابا جان۔ یہ کیرکٹر جو حکمرانی کرتا ہے"

انڈر شفٹ "کس کا کیرکٹر۔ کس کا کردار، تمہارا یا میرا؟"

اسٹفن "نہ آپ کا کردار، نہ میرا۔ بلکہ انگلینڈ کے قومی کیرکٹر کے بہترین عناصر ہیں جو حکومت چلاتے ہیں"

انڈر شفٹ "اوہو — صاحبزادے۔ اب میں سمجھ گیا کہ تم کس پیشے میں جا سکتے ہو۔ تم پیدائشی جرنلسٹ (اخبار نویس) نکلے۔ میں روپیہ لگا کر تمہیں ایک نہایت اعلیٰ درجہ کا ہفتہ وار اخبار نکلوا دونگا۔ اسٹفن یہ ٹھیک ہے"۔

اتنے میں سب لڑکے لڑکیاں آجاتے ہیں۔ پورا خاندان انڈر شفٹ بستی اور کاروبار دیکھنے کے لیے جائیگا۔ سب لوگ تیار ہو چکے ہیں۔ اسٹفن پہلے تو چلنے سے انکار کرتا ہے، بعد میں خود ہی تیار ہو جاتا ہے۔ انڈر شفٹ جس گاڑی میں سوار ہے وہ بظاہر نہایت بھدی گاڑی ہے۔ لیکن اس کی باڈی اس قسم کی ہے جس پر گولی اثر نہیں کر سکتی۔

بستی آگئی۔ کیا دل فزا مقام ہے۔ پہاڑی کا دامن۔ صاف ستھرے مکانات۔ کارخانے۔ توپ سازی کا کارخانہ۔ نئے تجربات کی لیباریٹری۔ دو دو چرچ۔ باربرا کو تعجب ہے کہ اتنے آدمی موت اور تباہی کے کاروبار میں اطمینان سے کیسے بسر کرتے ہیں اور اس کے باپ کے احکام کیونکر مانتے ہیں۔

کزنس "لیکن جونس (مزدور اور ملازم) کو حکم کے تابع بھی تو رکھنا پڑتا ہو گا۔ آپ

اپنے ملازموں میں ڈسپلن اور تنظیم کیسے قائم رکھتے ہیں؟"

اینڈر شفٹ "میں قائم نہیں رکھتا۔ وہ خود ہی رکھتے ہیں۔ ایک چیز ہے کہ کوئی ملازم اپنے ماتحت کی بغاوت برداشت نہیں کرتا۔ بلکہ ان میں سے کوئی یہ بھی برداشت نہیں کرتا کہ جو شخص ۳ شلنگ فی ہفتہ پاتا ہے۔ اس کی بیوی چار شلنگ فی ہفتے سے زیادہ تنخواہ پانے والے ملازم کی بیوی سے سوشل برابری جتائے۔ یہ صحیح ہے کہ نظریاتی اور اعتقادی لحاظ سے وہ سب کے سب میرے باغی ہیں لیکن جہاں تک عمل کا تعلق ہے ان میں سے ہر شخص اپنے ماتحت کو ماتحتی ہی میں رکھتا ہے۔ مجھے ان سے الجھنے کی نوبت ہی نہیں آتی۔ میں انہیں کبھی تنگ نہیں کرتا۔ بلکہ میں تو اپنے شریک کار لازارس کے ساتھ بھی کبھی کوئی زیادتی روا نہیں رکھتا۔ میں بس اتنا کہتا ہوں کہ فلاں فلاں کام ہونا ہے یہ کبھی نہیں کہتا کہ فلاں کام کسے اور کیسے کرنا چاہیے۔ میں نہ کسی کو حکم دیتا ہوں، نہ تنبیہ کرتا ہوں، نہ ڈانٹتا ہوں، نہ تنگ کرتا ہوں۔ بڑی عمر کے ملازم کم عمر چھوکروں پر ڈانٹ ڈپٹ رکھتے ہیں اور ان کو حکم کے نیچے رکھتے ہیں۔ گاڑی والے بھنگیوں اور صفائی والوں کو اپنی ڈانٹ میں رکھتے ہیں۔ دستکار خود ہی بے ہنر مزدوروں پر دباؤ رکھتے ہیں۔ فورمین (نگراں) ان بے ہنر مزدوروں اور دستکاروں دونوں کو اپنی ڈانٹ میں رکھتا ہے، انہیں تنگ کرتا اور اپنے حکم پر چلاتا ہے۔ نائب انجینیر فورمین کی خامیاں اور کمزوریاں تلاش کرتا رہتا ہے۔ الگ محکموں کے منیجر دوسرے افسروں کے لیے مصیبت بنے رہتے ہیں۔ اور کلرک لوگ اونچے اونچے ہیٹ لگا کر اور بغل میں ریلی کتابیں دبا کر خود کو اتنا کھینچے

رکھتے ہیں کہ کسی سے برابری کے درجے پر ملتے ہی نہیں۔ اس تمام ترتیب کا نتیجہ بے شمار منافع ہے جو سیدھا میرے پاس چلا آتا ہے۔"

کرِنس ان دلائل پر بھونچکا رہ جاتا ہے۔ باربرا خوش نہیں ہے۔ کیونکہ اب اس کے جسم پر وہ سالوشن والی وردی نہیں رہ گئی ہے۔ لوماکس مطمئن ہے اور لیڈی برٹیومارٹ اپنے شوہر کے پھیلے ہوئے کاروبار، اعلیٰ درجے کی خوش نما بستی اور ہرے بھرے باغات کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہی ہے۔ کاش یہ سب اس کے بیٹے کو وراثت میں مل جاتا۔

گھوم پھر کر اس مقام کی ایک ایک تفصیل کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ شرلی سالوشن سے نکل کر یہاں چوکیدار ہو گیا ہے۔ انڈرشفٹ جو کارخانے کے اندر کسی ضروری کام سے چلا گیا تھا تھوڑی دیر بعد واپس آگیا ہے۔ تاروں کا ایک بنڈل اس کے ہاتھ میں ہے۔ "Good news from Manchuria" (منچوریا سے خوشخبری آئی ہے)

اسٹفن "کیا ہوا؟ جاپانی پھر جیتے؟"

انڈرشفٹ "مجھے نہیں معلوم۔ کون جیتا، اس سے ہمیں کیا واسطہ۔ کچھ نہیں۔ میرے لیے خوشخبری یہ ہے کہ لڑائی کے جو نئے قسم کے جہاز ہم نے تیار کرائے تھے وہ کامیاب رہے۔ پہلے ہی حملے میں انہوں نے ایک قلعہ اڑا دیا جس میں تین سو سپاہی موجود تھے"

کرِنس "مصنوعی سپاہی ہونگے؟"

انڈرشفٹ "نہیں —— اصلی سپاہی تھے" سناٹا۔

سارہ — "ابا جان۔ ہاں ایک بات تو بتلائیے۔ یہ دھماکے اور پھٹنے والا سامان آپ کدھر تیار کراتے ہیں؟"

انڈرشفٹ "اس کے لیے چھوٹے چھوٹے سائبان الگ بنائے جاتے ہیں۔ اگر ان میں سے کوئی مال پھٹ جائے تو کچھ زیادہ نقصان نہیں ہوتا۔ صرف وہ لوگ مرجاتے ہیں جو آس پاس ہوں۔"

چارلس لوماکس جو ایک سائبان کو اندر سے دیکھنے گیا تھا، وہاں سگرٹ جلا لیتا ہے۔ انجنیر کو شکایت ہے کہ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ اگرچہ سگریٹ احتیاط سے جلائی گئی لیکن پھر بھی نقصان کا اندیشہ باقی رہتا ہے۔ انڈرشفٹ لوماکس کو بلا کر اس سے دیاسلائی کا بکس یونہی مانگ لیتا ہے اور خاموشی کے ساتھ اپنی جیب میں ڈال لیتا ہے۔

مسٹر لوماکس۔ جب آپ جانے لگیں تو انجنیر بلٹن سے گن کاٹن (آگ پکڑنے والا کپڑا) کا ایک ٹکڑا مانگ لیجیے گا وہ دے دیگا۔ اور اپنے گھر پہنچ کر اس کا تجربہ کرتے رہیے گا" (لیکن یہاں نہیں)

لیڈی بریٹو کی تمنا پھر بے قرار ہوتی ہے اور وہ پھر اصرار کرتی ہے کہ وراثت کا معاملہ ابھی طے کر لیا جائے۔

انڈرشفٹ "اگر اڈولفس (کزنس۔ باربرا کا منگیتر) لاوارث یا ناجائز تعلقات کا نتیجہ ہوتا تو اچھا رہتا۔ پھر کسی اور کی ضرورت نہ تھی کیونکہ یہی وہ نوجوان خون ہے جس کی کھپت انگریزی تجارت کے بازار میں ہونی چاہیے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ وہ صحیح النسب ہے" اور پھر یہاں اگر بحث ختم ہو جاتی ہے۔ یہ کہہ کر وہ

اپنے دفتر کے دروازے کی طرف بڑھتا ہے۔

کرِنس ”(مڑتے ہوئے) یہ صحیح نہیں ہے۔ (سب کے سب اسی کی طرف حیرت سے مڑ جاتے ہیں اور غور سے دیکھتے ہیں) —— میں سمجھتا ہوں کہ —— ذرا خیال کیجیے —— میں اپنے مستقبل کی خاطر یہ بات نہیں کہہ رہا ہوں —لیکن ایک بات ہے کہ یہ جو بے نسب اور ناجائز ولادت والا قصہ ہے اسے ایک بار حل کیا جا سکتا ہے؟“

انڈرشفٹ ”یعنی؟ (کرِنس کی طرف واپس آتے ہوئے)

کرِنس ”مجھے کچھ کہنا ہے جس کی نوعیت اقبالِ جُرم کی سی ہے“

سب حاضرین کے منہ سے بے ساختہ —— ”اقبالِ جرم“ کا لفظ نکل گیا۔

اب کرِنس اپنی ذہنی کیفیت بیان کرتا ہے کہ پہلے وہ اپنے آپ کو ایک معزز، صحیح النسب سچّا انسان وغیرہ سمجھا کرتا تھا تاکہ عزتِ نفس جیسی قیمتی چیز برقرار رہے۔ لیکن باربرا سے ملنے کے بعد وہ سب سے زیادہ اہم باربرا کو سمجھتا ہے۔ وہ اسے ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہتا ہے۔ چاہے عزتِ نفس رہے نہ رہے۔ سالویشن آرمی میں وہ خدمتِ خلق اور اولیا، اللہ کی خوشنودی کے لیے نہیں بلکہ باربرا کی خوشنودی کی خاطر گیا تھا۔ لیکن وہاں مجھے پتہ چلا کہ باربرا تو ایک کروڑپتی کی بیٹی ہے۔ وہ بھلا یونانی کے پروفیسر سے کیا شادی کریگی۔ اور پھر اگر اسے معلوم ہوا کہ صحیح النسب نہیں ہوں تو اور مصیبت۔ چنانچہ میں نے اس سے نسبی حقیقت پوشیدہ رکھی۔ اور اب وہ یہ راز کھول دینا چاہتا ہے کہ وہ صحیح النسب نہیں ہے۔ اسٹریلیا کے قانون کے مطابق اس کے ماں باپ کی شادی

جائز تھی لیکن انگلینڈ میں وہ شادی ناجائز ہے کیونکہ میری ماں اصل میں میرے باپ کی سالی ہیں۔ اور اس لحاظ سے میری پیدائش انگلینڈ کے قانون کے لحاظ سے ناجائز تعلقات کا نتیجہ ہے۔

سنسنی پھیل جاتی ہے۔

لیکن ابھی مشکل باقی ہے۔ انڈرشفٹ کو اندیشہ ہے کہ یونانی علم و ادب کا فاضل شاید اس پیشے میں جی نہ لگا سکے۔ کیونکہ قدیم ادب آدمی کو خیال پرستی میں مبتلا کر دیتا ہے۔

"مگر یونانی زبان نے میرے دماغ کو چاٹ نہیں ہے۔ بلکہ اس میں اور اضافہ کیا ہے اور پھر میں نے یونانی ادب کسی انگریزی پبلک اسکول میں تھوڑی سیکھا ہے"

اچھا —— تو مشکل آسان ہوگئی۔ اڈولفس کزنس اس پوری وراثت کے لیے نہایت مناسب آدمی رہیگا۔

ابھی تنخواہ، وظیفے، ٹریننگ وغیرہ کے سوال باقی ہیں۔ جن پر عجیب عجیب نکتے پیش آتے ہیں۔ کزنس سوچتا ہے کہ اور تو سب باتیں دیکھی جائینگی لیکن کم از کم وہ سماج کو یہ فائدہ ضرور پہنچا سکتا ہے کہ جو لوگ حق پر ہوں انہیں گولہ بارود دیا جائے اور جو ناحق پر ہوں ان کے ہاتھ سامان جنگ فروخت نہ کیا جائے۔

انڈرشفٹ —— "نہیں۔ یہ نہیں ہوگا۔ یا تو تمہیں اسلحہ بنانے والے کے سچے ایمان پر عمل کرنا ہوگا ورنہ اس پیشے میں دخل ہی نہ دو۔"

کرنس "وہ اسلحہ ساز کا سچا عقیدہ اور ایمان کیا ہوتا ہے؟"
انڈرشفٹ "یہ ایمان کہ ۔۔۔ تمام لوگ جو اسلحہ کی معقول قیمت ادا کرنے کے لیے تیار ہوں، ان کے ہاتھ بلا امتیاز ہتھیار فروخت کیے جائیں۔ اس میں افراد کا اور ان کے اصول کا کوئی سوال نہیں۔ چاہے امراء و نواب ہوں یا پرجا راج کے حامی، Nihilist[1] ہوں یا زار ہو۔ سرمایہ دار ہوں یا سوشلسٹ پروٹسٹنٹ ہوں یا کیتھولک۔ نقب زن چور ہوں یا پولس والے۔ سیاہ فام ہوں سفید فام یا زرد فام۔ ہر حال میں، اور ہر صورت میں۔ تمام قوموں کو، تمام مذاہب والوں کے ہاتھ۔ ہر قسم کی حماقت کرنے والوں کے ہاتھ، ہر قسم کا مقصد اور ہر طرح کا جرم پیش نظر رکھنے والوں کے ہاتھ۔ ہتھیار بے امتیاز بکنے چاہییں۔ انڈرشفٹ کمپنی کے مورث اعلیٰ نے دکان پر کچھ بنیادی اصول لکھے ہیں۔ پہلا اصول یہ ہے کہ۔ اگر خدا نے بازو دیے ہیں تو کسی شخص کو تلوار سے پرہیز نہ کرنا چاہیے۔ دوسرا اصول یہ لکھا ہے ہر انسان کو حق ہے کہ وہ جنگ کرے۔ کسی کو دوسرے کے جانچنے کا حق نہیں ہے۔ تیسرا اصول لکھا ہے۔ انسان کے ہاتھوں میں ہتھیار ہوں ۔۔۔ فتح خدا کے ہاتھ ہے۔ چوتھا اصول جو لکھنا تھا اس میں ادبیت پیدا نہ کی جا سکی اس لیے لکھا ہی نہیں گیا۔ البتہ مورث اعلیٰ نے اس وقت نپولین کے ہاتھ توپیں فروخت کیں جب انگلینڈ میں جارج سوئم کی حکومت تھی۔ پانچواں اصول فرمایا ہے۔ امن دنیا میں نہیں ہو سکتا مگر یہ کہ اس کے ہاتھ میں تلوار ہو گی۔ چھٹا قول حکمت بھی۔ ہا میرا مورث اعلیٰ کیا کمال

---

[1] زار روس کے عہد میں ایک ابتدائی بغاوت پسند گروہ جو بالشویزم کے آنے سے پہلے ختم ہو چکا تھا۔

کر گیا ہے۔ لکھتا ہے۔ دنیا میں کبھی کوئی کام اُس وقت تک نہیں کیا گیا جب تک لوگ اس پر کمر بستہ نہ ہو گئے کہ اگر وہ کام نہ ہوا تو وہ ایک دوسرے کا خون پی جائینگے۔ اب لکھنے کو کچھ نہیں رہ گیا تھا چنانچہ انہوں نے آخر میں بس ایک لفظ لکھ دیا ــــ شرم وحیا سے عاری"

اس پر کرِزنس پھر اپنا روایتی اصول دہراتا ہے لیکن انڈرشفٹ اُسے ہوشیار کرتا ہے کہ جب تک تم اسلحہ سازی کے مالک نہیں بنتے اس وقت تک یہ سب امتیاز ٹھیک ہے۔ یہاں آنے کے بعد تم اپنی مرضی پر نہیں چل سکوگے کیونکہ یہاں اپنی مرضی اور اپنی قوت کا لفظ ہی بے معنی ہے۔ ایک مشین ہے جس میں کارخانوں کا مالک بھی ایک پرزہ ہوتا ہے۔

باربرا ــــ "اور ہاں جب تک میں نے سالویشن میں شرکت نہیں کی تھی میں بھی اپنی قوت اور اپنی مرضی کے ماتحت تھی۔ اور سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس قوت سے کیا کام لوں۔ بعد میں جب سالویشن آرمی میں شریک ہو گئی تو وہاں خود اپنے کاموں کے لیے بھی کافی وقت نہ ملتا تھا" (چہ جائیکہ کچھ اور سوچا جائے)

اب انڈرشفٹ اپنی بیٹی کا ذہن تبدیل کرتا ہے۔ وہ نرمی سے سمجھاتا ہے۔ غم نہ کرو۔ جو چیز فِٹ نہ ہو اُسے غم کیے بغیر ٹھکرا دو۔ اگر اخلاق ومذہب کے نظریے حقائق کے جسم پر چست نہیں ہوتے تو انہیں اس طرح رد کر دو گویا کوئی نقصان نہیں ہوا۔ آج کی دنیا میں یہی تو کمزوری ہے۔ اگر انجن میں پرزہ فِٹ نہ آئے تو لوگ پرزہ نکال پھینکتے ہیں، لیکن زندگی پر جو تعصبات اور روایتی اخلاق فِٹ نہیں ہوتے ان سے پھر بھی چپکے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مشینی ترقی

توخوب ہو رہی ہے مگر اخلاقی مذہبی اور سیاسی ترقی رکی ہوئی ہے۔" اگر تمہارا پرانا مذہب کل ناقص نکل گیا، کوئی غم نہیں، آج دوسرا نیا مذہب اختیار کرلو" یا ربرا "مگر آپ تو آج اس سے بھی برا مذہب پیش کرتے ہیں"

باپ جواب دیتا ہے کہ برا مذہب صرف ایک ہے اور وہ غربت۔ سالویشن کے مرکز میں غربت و مصائب، سردی اور بھوک ہے۔ یہاں وہ نہیں نظر آئیگی۔ جہاں غربت ہے وہاں تاریکی ہے۔ روٹی، کپڑا، ایندھن، کرایہ، ٹیکس، عزت اور بچے۔ سات ضرورتیں ایسی ہیں کہ اگر وہ پوری نہ ہوں تو ہر ضرورت بجائے خود ایک گناہ ہے۔ پہلے میں خود بھی بھوکا تھا، مفلس تھا۔ اب میں دولتمند ہوں اور سات گناہوں سے بری ہوں۔ پہلے میں خطرناک تھا۔ اب ایک مفید شخص ہوں۔ جب سارے انگریزوں کی زندگی ان عیوب سے پاک ہو جائیگی تو انگلینڈ رہنے کے قابل جگہ بن جائیگی۔

تم لوگ سمجھتے ہو کہ قتل کوئی بڑا گناہ ہے، اور قتل کا سامان بنانا جرم۔ یہ بات نہیں۔ تین پولیس والے چھ سو ستر آدمیوں کے ہجوم کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیتے ہیں لیکن اگر ان میں قتل کرنے کی ہمت آجائے تو ۶۷۰ عام آدمی ایک حکومت بن جاتے ہیں۔

"تمہارے یہ پاکباز عوام، یہ ہجوم رائے دینے کی پرچی پر نشان لگا کر چلے آتے ہیں اور اپنے جی میں سوچ لیتے ہیں کہ وہ بیلٹ پیپر کے ذریعے اپنے آقاؤں پر حکومت کر رہے ہیں۔ لیکن رائے دینے کی پرچی جو اصل میں حکومت کرتی ہے، وہ پرچی ہے جس میں بندوق کی گولی بھی لپٹی ہو۔"

کرِنس "شاید اسی لیے میں نے اچھا کیا جو ہوشیار ذہین لوگوں کی طرح کبھی میں نے کسی کو ووٹ ہی نہیں دیا"۔

انڈرشفٹ۔ "ووٹ؟ اس سے کیا ہوتا ہے۔ آپ صرف وزارت کے نام بدل دیتے ہیں۔ لیکن جب آپ گولی چلاتے ہیں تو آپ صرف وزارت ہی نہیں بدلتے بلکہ حکومتوں کو نیچے گرا دیتے ہیں، نیا دور آغاز کرتے ہیں۔ پرانے نظام صاف کر ڈالتے ہیں، اور اس کی جگہ نیا نظام قائم ہوتا ہے۔ کیا تاریخی اعتبار سے یہ بات صحیح ہے، مسٹر عالم فاضل، یا نہیں؟"

کرِنس "ہاں تاریخی اعتبار سے بالکل صحیح ...... یہ صحیح ہے لیکن اسے صحیح نہ ہونا چاہیے تھا"

انڈرشفٹ "چاہیے تھا، چاہیے تھا...... کیا ساری زندگی یہی کہتے کہتے گزار دو گے کہ کیا ہونا چاہیے تھا۔ مردِ خدا۔ چاہیے تھا کو 'ہو کے رہیگا' میں بدل دو۔ آؤ۔ میرے ساتھ پھٹنے اور آگ لگانے والا سامان تیار کرو۔ جو چیز انسان کو جلا کر خاک کر سکتی ہے وہ سوسائٹی کو بھی پھونک سکتی ہے۔ دنیا کی تاریخ ان لوگوں کی تاریخ ہے جن میں اس سچائی کو قبول کرنے کی بھرپور ہمت ہوتی ہے"

کرِنس اس ایمان کو قبول کر لیتا ہے۔ باربرا کی طرف سے اندیشہ باقی ہے کہ شاید وہ پسند نہ کرے۔

کرِنس پھر جذباتیت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ باربرا، محبت، امن اور بزنس کے درمیان اسے انتخاب میں جھجک ہو رہی ہے۔ انڈرشیفٹ افلاطون

کے حوالے سے اس یونانی ادب کے پروفیسر پہ آخری وار کرتاہے۔

"افلاطون کہتاہے، میرے دوست، کہ یہ سماج اس وقت تک
نجات پا نہیں سکتا جب تک کہ — یا تو یونانی ادب کے پروفیسر
بارود نہ بنانے لگیں یا پھر بارود بنانے والے اپنا کاروبار چھوڑ کر
یونانی ادب کے پروفیسر نہ ہو جائیں"

باربرا ابھی تک کزِنس کا امتحان لے رہی ہے، وہ روحانی طاقت حاصل کرنے پر زور دیتی ہے۔ بحث جاری ہے۔ باربرا کی ذہنی روایت نے جو جال اس کے شعور پر بچھایا تھا، وہ آہستہ آہستہ ٹوٹنے کا نام نہیں لیتا۔ لیکن بالآخر ایک ضرب لگتی ہے اور باربرا اس جال سے نکل آتی ہے۔

"میں تمہیں چھوڑ دیتی اور اس شخص سے شادی کرلیتی جو میرے باپ کی پیشکش کو قبول کرتا۔"

باربرا — (ماں سے) "گاؤں میں مجھے ایک گھر چاہیے جہاں میں ڈولی (کزِنس) کے ساتھ رہ سکوں۔ بتاؤ، مجھے، میں کس گھر میں جا کر رہوں۔؟"

انڈرشفٹ (رخصت ہوتے وقت کزِنس سے) "کل صبح — صبح چھ بجے یونانی ادب کے عاشق!" (تیار رہنا)

سیب گاڑی

۱۹۲۹ء میں لکھا گیا۔ اور شا کے آخری ڈراموں میں سب سے اہم سمجھا جاتا ہے۔

پہلا ایکٹ

مقام: شاہی محل۔ باہر کا کمرہ۔ بادشاہ کے دو خاص پیشکار اپنی اپنی میزوں پر بیٹھے کام کر رہے ہیں۔ اور آپس میں بات چیت کرتے جاتے ہیں۔ سمپرونیس ایک نوجوان اور تازہ وارد پیشکار ہے۔ اس کا فرض ہے کہ بادشاہ کے خطوط دن کے بارہ بجے تک ملاحظہ کے لیے تیار کر لیا کرے۔ پمفلیس پرانا سکرٹری ہے اور اخبارات کے شعبے سے اس کا تعلق ہے۔ دونوں کی گفتگو طویل ہو جاتی ہے۔ گفتگو کے درمیان پمفلیس اپنے نوجوان رفیق کار کو یاد دلاتا ہے۔

"ہاں یہ بھی خیال رکھیے کہ اس محل میں اگر سکرٹری ۱۲ بجے تک بادشاہ کے خطوط تیار نہ رکھے تو اُسے ملازمت سے ہاتھ دھونے پڑتے ہیں"

سمپرونیس "تمھیں خدا سمجھے۔ مجھے اپنا کام ختم کرنے سے پہلے تم نے باتوں میں کیوں لگا لیا؟ تمھیں تو کچھ کرنا ہوتا نہیں سوائے اس کے کہ اخبارات پڑھ لینے کا اظہار کر دیتے ہو اور حسب بادشاہ سے کہہ دیتے ہو کہ "جناب والا، آج تو کوئی خاص خبر نہیں ہے" اس کے جواب میں "خدا کا شکر ہے" کہہ کر خاموش ہو جاتا

ہے: لیکن ان کے خطوں میں سے ایک نقطہ چھوٹ جائے تو بس۔ خط بھی کیسے کہ کبھی خالائیں، ممانیاں جائے پر بلا رہی ہیں اور کبھی شاہ کی محبوبہ اور ننھیا کے خطوط چلے آ رہے ہیں۔ جن پر لکھا ہوتا ہے " بالکل پرائیویٹ اور پوشیدہ، صرف ہز مجسٹی ہی اس کو کھول سکتے ہیں" یہ تانتا کبھی ٹوٹتا ہی نہیں۔ ابھی کل ہی چھ عشقیہ خطوط آئے"......

لیکن اعلیٰ حضرت کی محبوبہ اور ننھیا کے خطوط صرف شاہ کے ہاتھوں میں پہنچتے ہیں۔

اس کے بعد جو وزارتی بحران آیا ہوا ہے اس کی گفتگو جاری ہے کہ مسٹر بونر جبیس آ جاتے ہیں۔ یہ مزدوروں کے علاقے سے چن کر پارلیمنٹ میں آئے تھے۔ انہیں محکمۂ تجارت کا وزیر بنا دیا گیا ہے۔ پہلے یہ خود بادشاہ کے بڑے کٹر مخالف رہے ہیں۔ اور با اثر آدمی ہیں۔ انتخاب کے بعد پہلی بار شاہ سے انٹرویو لینے آئے ہیں۔ بھاری بھرکم اور خود پسند، تلخ زبان آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ انہیں اپنے وجود کی اہمیت کا ہر وقت احساس رہتا ہے۔

اعلیٰ حضرت کو ان کی آمد کی اطلاع کی جاتی ہے۔ اعلیٰ حضرت اسی کمرہ میں ملنے چلے آتے ہیں جہاں پرائیوٹ سکرٹری پہلے سے موجود ہیں۔ رسمی گفتگو ہوتی رہتی ہے۔ بونر جبیس اس کا اظہار کرتا ہے کہ اسے اس موقع پر بہت ہی اہم گفتگو کرنی ہے۔ "ایسی گفتگو جو اس سے قبل کسی بادشاہ سے نہیں کی گئی"

شاہ کو بھی اپنے اوپر کافی اعتماد ہے اور وہ اس اہمیت کے ذکر کو بے تکلفی کے ساتھ ٹال جاتا ہے۔ بونر جبیس کو اپنے ہلکے پن کا احساس ہوتا ہے لیکن وہ پھر

بادشاہ کو آگاہ کرتا ہے کہ آپ کو اپنے اوپر اتنا اعتماد نہیں کرنا چاہیے "آپ محض ایک آئینی بادشاہ ہیں" اور بلجیم کے محاورے میں آئینی بادشاہ کو "ربڑ کی مہر" کہتے ہیں۔

بادشاہ میگنس جواب دیتا ہے کہ تم اور میں دونوں ہی ربڑ کی مہریں ہیں۔ میں بھی دستخط کرنے کا فرض انجام دیتا ہوں، تم وزراء بھی یہی کرتے ہو۔ تمہارے پاس سرکاری احکام پڑھنے اور انہیں جانچنے کے لیے وقت بھی نہیں ہوتا۔ اور نہ تم خود اپنی مرضی سے کچھ کر سکتے ہو۔

ایک وقت تھا جب بادشاہ کو ظل اللہ (خدا کا سایہ) کہا جاتا تھا اور اُسے آسمانی وجود قرار دیا جاتا تھا، وہ نظریہ تو کچھ دن چل بھی گیا کیونکہ "ہم سب میں کچھ نہ کچھ آسمانی نور ضرور ہے۔ اس کے علاوہ احمق سے احمق اور بدترین قسم کا خاندانی بادشاہ یا وزیر، چاہے پوری طرح خدا نہ ہو لیکن خدا کا جزو تو ہے ہی۔ کم از کم خدا بنانے کی ایک کوشش تو ہے، چاہے یہ کوشش کتنی ہی ناکام اور یہ خود کتنا ہی مختصر کیوں نہ ہو۔ لیکن یہ "ربڑ کی مہر" والا نظریہ تو ہر ہنگامی حالت میں دم توڑ دیتا ہے۔ کیونکہ کوئی بادشاہ اور کوئی وزیر مہر کی طرح قطعاً نہیں رہ سکتا، وہ ایک جیتی جاگتی روح ہوتا ہے"۔

بونرجیس کو اس لفظ پر اعتراض ہے۔ بہرحال شاہ کے کہنے کا منشا یہ ہو کہ صرف ربڑ کی مہر بن کر کام نہیں چلتا۔ شاہ اور وزیر اس سے کچھ زیادہ بھی ہوتے ہیں" تم نے تو اس کا ثبوت مہیا کر دیا ہے کیونکہ کوئی معمولی آدمی اس مرتبہ پر نہیں پہنچ سکتا تھا جس پر تم پہنچ گئے ہو، اور میرا معاملہ یہ ہے کہ

میں اس لیے بادشاہ ہوں کہ اپنے چچا کا بھتیجا ہوں، اور میرے دونوں بڑے بھائی دنیا سے سدھار چکے ہیں۔ اگر میں اس ملک کا سب سے زیادہ بیوقوف انسان بھی ہوتا تب بھی بادشاہ ہی ہوتا۔ میں نے یہ حیثیت اپنی قابلیت سے نہیں حاصل کی ہے۔۔۔"

بونر جیس ایک بار جتاتا ہے کہ وہ آج بھی ریپلکن (یہ جارج کا حامی) ہے۔ شاہ میگنس "تم مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتے مسٹر بونر جیس۔ میں خوب سمجھتا ہوں کہ تم ریپلکن کیوں ہو۔ اگر انگریز قوم مجھے چلتا کر دے اور اس ملک کو ریپلک بنا ڈالے تو برطانوی ریپلک کا پہلا صدر بننے کا موقع تمہارے سوا غالباً کسی کو نہیں ملیگا۔۔۔۔۔ اور اگر ایسا ہوا تو مجھے جتنے اختیارات کبھی حاصل تھے، اس سے دس گنی زیادہ قوت اور اختیارات تمہاری مٹھی میں ہونگے۔۔۔۔ لیکن بادشاہ کیا ہے؟ ایک کٹھ پتلی اور ایک بُت ہے جسے دولتمندوں کے گروہ نے اس لیے بٹھا رکھا ہے کہ بُت کے پردے کے پیچھے وہ ملک پر حکمرانی کر سکیں۔ لیکن ریپلک کے صدر کو ملک کے عام باشندے چنتے ہیں جو اتنا مضبوط آدمی ہو کہ انہیں دولتمندوں کے پنجے سے محفوظ رکھ سکے۔"

بونر جیس پوچھتا ہے کہ کیا شاہ واقعی شاہ ہونے کے بجائے ریپلک کا صدر رہنا پسند کرینگے؟

شاہ کو انکار ہے کیونکہ فی الحال وہ خود کو زیادہ محفوظ سمجھتا ہے۔ "میں جانتا ہوں کہ خاندانی شاہی کسی لمحے میں ختم ہو سکتی ہے لیکن جب تک بھی یہ

باقی ہے اس وقت تک تو میں بہت محفوظ ہوں۔ الکشن کے جھمیلے کتنے خوفناک اور کیسے ہمت شکن ہوتے ہیں میں ان سے بھاگتا ہوں۔ مجھے اب ووٹ دینے والوں کو خوش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وزراء آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں لیکن میں اپنی جگہ قائم رہتا ہوں۔ (ذرا سوچو تو) تمہاری پوزیشن کس درجہ خطروں میں گھری ہوئی ہے"

"وہ کیسے ؟"

میگنس "وہ ایسے کہ ووٹ تمہارے خلاف بھی جا سکتے ہیں۔ تم مزدوروں کے حلقے سے چن کر آئے ہو۔ اگر ہائیڈرو الکٹرک مزدوروں کا فیڈریشن تمہیں الگ کردے تو تم کیا رہ جاؤ گے ؟"

بونر جیس۔ "یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔" دنیا میں کوئی بادشاہ اپنے عہدے پر اتنا محفوظ نہیں ہوتا جتنا ایک ٹریڈ یونین (مزدور انجمن) کا عہدیدار ہوتا ہے۔ صرف ایک چیز ہے جس کی بدولت وہ نکالا جا سکتا ہے اور وہ ہے شراب۔ صرف شراب پینے سے نہیں، بلکہ شراب پی کر مدہوش ہونے اور ادھر اُدھر گرنے سے۔ میں اُن لوگوں کے سامنے جمہوریت کی گفتگو کرتا ہوں۔ میں انہیں بتاتا ہوں کہ ان کے پاس ووٹ کی قوت ہے۔ ووٹ کی قوت یعنی حکومت، طاقت اور شان و عزت۔ میں ان سے کہتا ہوں۔ "تم سب سے اونچے ہو، سب سے زیادہ طاقتور اپنی طاقت کو استعمال کرو"۔ وہ جواب دیتے ہیں۔ "بہت اچھا، بتلائیے کیسے استعمال کریں ؟" اور پھر میں اس کا جواب دیتا ہوں کہ "تم اپنا ووٹ عقلمندی سے استعمال کرو یعنی مجھے ووٹ دو" چنانچہ

وہ ایسا ہی کرتے ہیں۔ اور یہی جمہوریت ہے.....''

میگنس'' بہت خوب۔ لیکن اگر تم سے اونچی آواز والا۔ کوئی احمق فالتو آدمی وہاں آپہنچا۔ تب؟ کوئی ایسا نوخیز جو مجمع کو پلیٹ فارم کی زیادہ چالاکی کے ساتھ لبھا سکے تب؟''

بونز جیس'' آپ کا مطلب الکی جیکب سے ہے غالباً؟ وہ تو صرف باتیں بناتا ہے ہیں اُسے پھٹکنے بھی نہیں دونگا۔

میگنس'' میں نے اس کا نام کبھی کبھی نہ سنا تھا۔ خیر.....''

اتنے میں شاہ کی لڑکی کسی ضروری کام سے کمرے میں چلی آتی ہے۔ شاہ اس سے اپنے نئے وزیر کا تعارف کراتے ہیں۔ وہ بونز جیس سے سوال کرتی ہے کہ آپ اس قسم کا (اُول جلول) لباس کیوں پہنتے ہیں؟ بونز جیس جواب دیتا ہے۔ یہ مزدور پارٹی کی وردی ہے'' میں اسے پہننے پر فخر کرتا ہوں''۔

ایلیس'' ہاں مجھے معلوم ہے مگر آپ اس میں مزدور تو نظر نہیں آتے۔ ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ آپ قدرتی طور پر حکمراں جماعت سے تعلق رکھتے ہیں''۔

شاہ کے اشارے پر شاہزادی کمرے سے چلی جاتی ہے۔ اور بعد میں شاہ بھی یہ عذر کرکے رخصت ہوتا ہے کہ ملک میں جو بحران آیا ہوا ہے اس پر گفتگو کرنے کے لیے وزیر اعظم مع اپنی وزارت کے آج آنے والے ہیں۔ شاید تم بھی ان میں شریک ہوگے۔ اس لیے پھر ملاقات ہوگی۔

شاہ محل کے اندر چلا گیا۔

ذرا دیر بعد وزیر اعظم اور کئی وزرا اپنے شاندار سرکاری لباس میں محل

کے دروازے پر پہنچتے ہیں۔ ان وزرا میں سے ایک صاحب بڑھ کر بونز جیس کے لباس پر حملہ کرتے ہیں۔ "جائیے ذرا ڈھنگ کے کپڑے بدل کر آئیے"۔ اس پر بونز جیس بھی ترکی بہ ترکی جواب دیتا ہے۔ وزیر اعظم مداخلت کرتا ہے۔ معاملہ رفع دفع ہو جاتا ہے۔ وزیر اعظم پروٹیس بونز جیس سے پوچھتا ہے، کہو بادشاہ کے ساتھ کیسی رہی؟

"ٹھیک ہے آپ بادشاہ کو مجھ پر چھوڑ دیجیے۔ میں سمجھ گیا ہوں کہ اس سے کیسے معاملہ رکھنا چاہیے۔ اگر میں تین مہینے پہلے سے وزارت میں ہوتا تو شاید بحران پیدا ہی نہ ہونے پاتا"

سب وزرا غیر سنجیدہ ہیں اور بونز جیس پر تیکھے جملے کس رہے ہیں۔

پروٹیس "ان لوگوں کی پرواہ مت کرو تم، یہ تمہیں نیا آدمی سمجھ کر مذاق کر رہے ہیں۔ بس کافی حماقت ہو چکی۔ اب آؤ کام کی باتیں کریں" (وہ خود اس کرسی پر بیٹھ جاتا ہے جو بادشاہ کے جانے سے خالی ہوئی تھی۔ شاہ کے سکرٹری کسی ضرورت سے کاغذات سنبھالے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ باقی پانچوں وزرا بھی بیٹھ جاتے ہیں)

وزیر اعظم "اچھا تو اب کام شروع کیا جائے۔ اول تو کیا آپ سب لوگ یہ محسوس کرتے ہیں کہ اگرچہ ہماری پارٹی نے پچھلے انتخابات میں تمام دوسری پارٹیوں سے میدان جیت لیا اور پچھلے تین سال سے ہم حکومت کی مسند پر بیٹھے ہیں لیکن اس تمام عرصے میں ملک پر اصل میں بادشاہ راج کرتا رہا ہے؟"

نکوبار "جی، میں یہ محسوس نہیں کرتا ــــ ہم ..."

پروٹیس (وزیر اعظم) "نہیں کرتے تو خدا کے لیے یا تو آپ استعفا دے دیجیے

اور ان لوگوں کا راستہ چھوڑ دیجیے جو حقیقتوں کو دیکھتے ہیں اور ان کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ یہ نہیں کر سکتے تو آپ، میرا عہدہ سنبھالیے اور پارٹی کی رہنمائی خود کیجیے۔"

نکوبار" مگر مصیبت یہ ہے کہ آپ خود ہی حقائق کا سامنا نہیں کرتے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگرچہ آپ وزیر اعظم ہیں لیکن آپ قادر مطلق خداوند عالم تو نہیں ہیں۔ بادشاہ سوائے اس کے کچھ نہیں کر سکتا جس کا ہم اسے مشورہ دیتے ہیں۔ وہ بھلا ملک پر حکمرانی کیسے کر سکتا ہے جبکہ اصل طاقت ہمارے ہاتھ میں ہے اور اس کے پاس کچھ بھی نہیں؟"

بونر جیس اس کے جواب میں ایک دم وہی جملہ دہرا دیتا ہے جو شاہ میگنس نے "ربڑ کی مہر" والی ترکیب پر ابھی کہا تھا، پھر دونوں اُلجھ پڑتے ہیں۔ وزیر اعظم انہیں خاموش کرتا ہے۔

بونر جیس (خاموش ہونے سے پہلے) "اب بھی میرے لیے زیادہ موقعے ہیں بہ نسبت تمہارے، صاحبزادے! اگر ہمارا ملک ریپبلک ہوتا اور عوام (صحیح معنوں میں) انتخاب کر سکتے تو میرے لیے اچھے موقعے تھے۔ میں آپ کو بتا دوں کہ ریپبلک کے صدر کو بہ نسبت بادشاہ کے زیادہ اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ کیونکہ عوام ایسے "مضبوط آدمی" کو چاہتے ہیں جو انہیں امیروں کے جبر سے محفوظ رکھ سکے"

پروٹیس (تنگ آکر) "بہت خوب۔ آج صبح ہی مزدوروں کے حامی دو اخبارات نے بادشاہ کی تائید میں اڈیٹوریل لکھے ہیں۔ اب وزارت میں بادشاہ کے یہ نئے حامی بھی موجود ہیں ـــــ بس اب میں استعفا ہی دیے دیتا ہوں"

نہیں نہیں ۔ ہرگز نہیں کا شور ہوتا ہے۔ اور پرڈمیس اپنے غصّے کا اور بھی تلخ اظہار کرتا ہے گویا وہ واقعی اپنی ذمہ داری سے اُکتا چکا ہے۔ دوسرے وزرا، اس کے غصّے کو ٹھنڈا کرتے ہیں۔ اور سمجھاتے ہیں کہ آپ جو الٹی میٹم تیار کر کے لائے ہیں پہلے اس کا فیصلہ ہونے دیجیے۔ پھر کوئی قدم اُٹھائیے۔

اتنے میں بادشاہ داخل ہوتا ہے۔ ڈاک کی وزیر خاتون امنڈا مردانہ لباس زیب تن کئے ہوئے اور بجلی کے محکمے کی وزیر لزیز ٹراٹا، دونوں عورتیں اس کے دائیں بائیں ہمراہ آتی ہیں۔ تمام وزرا، استقبال کے لیے اُٹھتے ہیں۔

پرڈمیس ناراض ہوتا ہے کہ اس کی وزارت اِدھر بہت ہی اہم مسئلے پر غور و فکر کر رہی تھی اور اس وزارت کی دو ممبر خواتین وہاں بادشاہ کے پاس بیٹھی رہیں، اور بحث و مشورے میں شریک ہونے نہیں آئیں۔

ایک دوسرے پر طعنہ زنی پھر شروع ہو جاتی ہے۔ ایک دوسرے کو بے تکلفی سے جو، لزی، نِک اور بِل کہہ کر مخاطب کیا جا رہا ہے۔ اس پر پروتر جیس ایک بار پھر احتجاج کرتے ہیں کہ اس طرح سے نام لینا گری ہوئی حرکت ہے باوقار طریقے سے خطاب کرنا چاہیے۔

مختصر یہ کہ تمام وزرا اور شاہ گفتگو شروع کرنے کی خاطر بیٹھ گئے۔ غیر ضروری قصّے رفع دفع کر دیے گئے۔

میگنس "اچھا تو آپ الٹی میٹم لائے ہیں۔ ہاں مجھے بھی کل شام کے اخبارات سے کچھ خیال گزرا تھا کہ پھر بحران اور کرائسس آگیا ہے۔ دوسرا کرائسس۔ مگر یہ الٹی میٹم تو میرے لیے نئی چیز ہے ۔۔۔۔"

پروٹیس (وزیر اعظم) "حضور والا نے کل کی شاہی تقریر میں جو اس کا اظہار کیا ہے کہ بادشاہ چاہے تو وزارت کے کسی فیصلے کو منسوخ کرسکتا ہے، اس کی وجہ سے یہ سارا قضیہ پھر اُبل پڑا ہے"۔

میگنس "اچھا تو آئینی سوال کیا ہے، کیا آپ شاہی وِٹو (حق استرداد) ماننے سے انکار کرتے ہیں؟ یا آپ کو صرف اس پر اعتراض ہے کہ میں نے وِٹو کے حق کی موجودگی کا ذکر کیوں کیا۔

نکوبار (وزیر خانہ) "ہمیں صرف یہ کہنا ہے کہ بادشاہ کو اس کا حق نہیں ہے کہ وہ وزیر اعظم کے مشورے کے بغیر کسی آئینی چیز کا بھی ذکر کرے۔ جب تک وزیر اعظم نے اسے پڑھ کر منظوری نہ دے دی ہو"

میگنس "کس وزیر اعظم کی منظوری؟ اس وزارت میں تو کوئی وزیر اعظم ہیں"

اس جملے پر بونرجیس بغلیں بجاتے ہیں اور خوش ہیں کہ شاہ نے وزارت پر اچھا وار کیا۔

بالآخر پروٹیس ایک بھاری، سنجیدہ اور جنچی تُلی آواز میں شاہ کو مخاطب کرتے ہوئے کام کی بات کہہ ڈالتا ہے ..... "اگر ہمیں آپ کی حکومت چلانی ہے تو ہم آپ کو وہ تقریریں نہیں کرنے دینگے جن میں آپ ہماری رائے کے بجائے خود اپنی رائے کا اظہار کریں۔ ہم یہ برداشت نہیں کرسکتے کہ آپ پبلک میں کہتے پھریں کہ ہمارے قانون میں جو کوئی اچھا قدم اُٹھایا گیا ہے وہ آپ کی بدولت عمل میں آیا، ہماری وجہ سے نہیں۔ ہم یہ نہیں دیکھ سکتے کہ آپ عوام کو یہ بتائیں کہ ہم تو آپس ہی میں لڑتے جھگڑتے اور اُلجھتے رہتے ہیں اور خاک کام نہیں کرتے۔

بس آپ کی ذات ہے جو ان عوام کو بڑے دولتمندوں کے جبر اور ان کی چیرہ دستی سے بچانے کے لیے وِیٹو (متفقہ فیصلہ رد کرنے) کی طاقت رکھتی ہے۔ یہ سلسلہ بند ہونا چاہیئے اور ایک بار ہمیشہ کے لیے بند ہونا چاہیے"۔

دوسرے دو وزیر اس بیان پر خوشی کا نعرہ لگاتے ہیں۔

میگنس "…. جب آپ یہ کہتے ہیں کہ یہ سلسلہ ایک بار ہمیشہ کے لیے بند ہونا چاہیے تو آپ کا کیا مطلب ہے۔ کیا آئندہ میں آپ سے اتفاق رائے کیا کروں یا آپ مجھ سے اتفاق رائے کرینگے ؟"

پروٹیس "میرا مطلب ہے کہ جب آپ کو ہم سے اتفاق رائے نہ ہو تو اس اختلاف کو آپ اپنے تک ہی رکھیے۔

پروٹیس جمہوریت پسند ہے اور اسے یقین ہے کہ جمہوریت کبھی غلطی پر متفق نہیں ہو سکتی (پُر زور انداز میں) "ہم نے غریبی اور مصائب کو ختم کر دیا ہے۔ اسی لیے لوگ ہم پر اعتماد کرتے ہیں (بادشاہ کی طرف مخاطب ہو کر) اور اس لیے آپ کو ہمارا راستہ بے روک چھوڑنا ہوگا۔ ہم نے انگلینڈ کے عوام کو راحت و آسائش مہیا کی ہے ـــ ٹھوس درمیانی درجے کے لوگوں کی سی راحت دی ہے اور وہ ہماری پشت پر ہیں"

میگنس "غلط۔ ہم نے غربت و مصائب کا خاتمہ نہیں کیا۔ صرف ہمارے بڑے بیوپاریوں اور سرمایہ داروں نے اس کا خاتمہ کیا ہے۔ وہ کیسے ؟ وہ اس طرح کہ اپنے سرمایے کو انھوں نے اپنے ملک سے باہر ایسے مقامات پر لگا دیا ہے جہاں غریبی اور مصائب ابھی تک باقی ہیں۔ بالفاظ دیگر جہاں

مزدور ابھی سستا ہے۔ اور اس لگے ہوئے سرمایے سے جو منافع آتا رہتا ہے ہم اُس منافع پر مزے سے گزر کر رہے ہیں۔ اور اب ہم سب معزز خواتین اور شرفا ہو کر رہ گئے ہیں۔

حاضرین اعتراض کرتے ہیں۔ ان کا اعتراض یہ ہے کہ اگر پس ماندہ اور کمزور ملکوں میں برطانوی سرمایہ لگا دیا گیا تو کیا ہرج ہے۔ انگلینڈ کے مزدور کو تو کم از کم زیادہ اجرت مل رہی ہے۔ یہاں تو خوش حالی ہے۔"

میگنس "کیا تم سمجھتے ہو یہ خوش حالی محفوظ اور پائدار ہے؟"

"ہاں پائدار ہے" اور اس کے بعد کئی وزیروں نے اپنے اپنے محکمے کا حال سنایا۔ ایک کے محکمے کے ماتحت مٹھائیاں بنانے کا بہت بڑا کارخانہ قائم ہوا ہے اور "برمنگھم دنیا بھر میں میٹھے بسکٹ کی تجارت کا سب سے بڑا مرکز ہے۔" دوسرے کے ہاں "چاکلیٹ کریم" روزانہ بیس ہزار ٹن تیار ہوتی ہے اور کبھی بے روزگاری نہیں ہوتی۔ اور اسی پر کیا موقوف ہے روزمرہ کی ضروریات کا اور بہت سامان کافی پیدا کیا جا رہا ہے، دوسرے ملکوں کو بازار سے ڈھکیل دیا گیا ہے۔ مویشیوں کی کافی تعداد ہے۔ اور ہاں، وہ انگریز حسینہ ہی تو ہے جس نے دنیا میں حُسن کا مقابلہ جیتا۔

پرڈیلس "تو جناب والا! کیا اب آپ کو اطمینان ہوا کہ دنیا میں سب سے زیادہ جس مزدور طبقہ کو اُجرت مل رہی ہے وہ ہمارے ساتھ ہے"

میگنس "مجھے انقلاب کا خطرہ ہے" اس جملے پر خاتون وزیروں کے علاوہ سب قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔

لیکن شاہ وضاحت کرتا ہے کہ اُسے انگلینڈ میں انقلاب آنے کا سچ مچ کوئی خطرہ نہیں۔ مجھے ان ملکوں میں (انقلاب کا) اندیشہ ہے جن سے منافع کے روپیے پر ہم بسر کر رہے ہیں۔ فرض کیجیے وہ فیصلہ کرتے ہیں کہ اب منافع کا روپیہ ادا کرنا بند کیا جائے۔ پہلے بھی ایسا ہو چکا ہے.....

"جتنا میں اس پر غور کرتا ہوں کہ ہم لوگوں کی خوش حالی کس قسم کی ہے اور جو اس کا نتیجہ ہے کہ تم نے بڑی بڑی اہم صنعتوں کو ان بڑے دولتمند سرمایہ داروں کے ہاتھ میں چھوڑ رکھا ہے جو تمہارے انتخابی حلقوں کے مزدوروں کو کافی اُجرتیں دے کر خوش رکھتے ہیں، اتنا ہی مجھے یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ میں ایک کوہِ آتش فشاں پر بیٹھا ہوا ہوں"

لزینز ٹراٹا اس پر خوشی اور تحسین و آفرین کا اظہار کرتی ہے "خود میرا محکمہ اس کے لیے تیار تھا کہ اسکاٹ لینڈ کی ندیوں سے بجلی تیار کرے لیکن تم نے یہ اہم صنعتی کاروبار اُٹھا کر پینٹ لینڈ فورتھ سنڈیکیٹ کے ہاتھوں میں سونپ دیا۔ جو بدیسی سرمایہ داروں کا ایک گٹھ ہے۔ ہم تو آپس میں اُلجھتے اور گڑبڑاتے رہیں گے اور وہ سنڈیکیٹ اس کاروبار سے کروڑوں روپیہ پبلک کے نقصان کی بدولت کھینچ ڈالیگا۔ یہ کرٹشس (محکوم ملکوں کے محکمے کے وزیر) نے کیا ہے۔ ان کے چچا اس سنڈیکیٹ کے چیرمین ہیں نا"

بکواس، جھوٹ، ہرگز نہیں، شور اور ہنگامہ شروع ہوتے ہوتے رہ گیا پروٹیس نے ہنگامہ روکتے ہوئے کہا "اچھا تو ہز مجسٹی ملک معظم! ہمارے سامنے پتے میز پر رکھے ہیں۔ اب آپ بتائیے کیا کہنا ہے"

اس کے بعد بھی چو طرفہ نوکیلے جملے اور طنز و مزاح جاری ہے۔ جس کے درمیان بادشاہ اس کا اظہار کرتا ہے کہ وہ کھیل ہار چکا ہے اس لیے بہتر ہوگا کہ وہ میدان سے ہٹ جائے۔

پروڈیس اپنے ساتھیوں کو آگاہ کرتا ہے کہ وہ اسے کہیں اپنی فتح نہ سمجھ لیں اصل میں بادشاہ نے ڈور ڈھیلی چھوڑی ہے ورنہ بات وہیں کی وہیں ہے۔ اس پر میگنس اپنے رویے کی وضاحت کرتا ہے۔ حاضرین نہایت متانت اور سنجیدگی کے ساتھ شاہ کی تقریر سن رہے ہیں۔ وہ خاندانی اور موروثی بادشاہ کی مجبوریوں کو سن رہے ہیں۔ لیکن وہ اصل موضوع بحث یعنی "الٹی میٹم" کو ٹال جاتا ہے۔ اور پروڈیس کو دوبارہ جتانا پڑتا ہے کہ جب تک وہ بادشاہ ہے اس الٹی میٹم کو نہیں منوالیگا یا فیصلہ نہیں کرالیگا اس کمرے سے نہیں جائیگا۔

میگنس "اس عہد نامے کی کیا شرائط ہیں بتاؤ؟"

پروڈیس "اول یہ کہ شاہی تقریریں نہیں ہوا کرینگی"

میگنس "اگر تمہاری بتائی ہوئی تقریر کروں تب بھی نہیں؟"

پروڈیس "جی ہاں، تب بھی نہیں ...." کیونکہ پروڈیس جانتا ہے کہ "دنیا میں بہترین تقریر اس انداز سے پڑھی جاسکتی ہے کہ حاضرین سن کر لوٹ پوٹ ہو جائیں (یعنی اس کا مطلب ہی الٹا ہو جائے) ایسا بہت ہو چکا ہے اس لیے آئندہ تقریر کا سلسلہ ختم۔

"دوسری شرط یہ ہے کہ شاہی محل کے چور دروازے سے جو اخبارات کو ہشکارا جاتا ہے وہ بھی آئندہ بند کیا جائے۔"

میگنس "تم جانتے ہو کہ اخبارات میرے ہاتھ میں نہیں ہیں۔ وہ ان لوگوں کے ہاتھ میں ہیں جو مجھ سے کہیں زیادہ دولتمند ہیں۔ اگر میں خود اپنے ہاتھ سے کسی تحریر پر دستخط کرکے بھیجوں اور شاہی احکام کے ساتھ بھیجوں تب بھی وہ لوگ اس کا ایک پیراگراف اس وقت تک اخبار میں نہیں دینگے جب تک ان کا اپنا مفاد وابستہ نہ ہو"

میگنس کو یقین ہے کہ ان لوگوں کو مضامین شاہی محل سے پہنچتے ہیں اور شاہ کا سکرٹری انہیں تیار کرکے پہنچاتا ہے۔

"تیسری شرط یہ ہے کہ ویٹو (شاہ کے حق استرداد) کا آئندہ ذکر نہ کیا جائے آپ چاہیں تو یہ پابندی ہم پر بھی آپ کی طرح عائد ہوتی ہے۔ کیونکہ ویٹو مر چکا ہے"

میگنس "تو کیا اس مردے کے سلسلے میں تاریخی حوالہ بھی نہ دیا جائے؟"

پروٹیس "میں ملک معظم کی حکومت اس وقت تک نہیں چلا سکتا جب تک کہ میں عہد کرکے انہیں پورا نہ کر سکوں۔ اور اگر میرے انتخابی حلقے کے لوگوں کو باربار یہ یاد کرایا جائے کہ بادشاہ کو اختیار ہے وہ پارلیمنٹ کے کسی فیصلے کو بھی رد کر سکتا ہے تو ایسی حالت میں میرے عہد اور وعدے کی کیا قیمت رہ جاتی ہے؟ کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ جب عوام مجھ سے وعدہ طلب کریں تو میں اُن سے کہہ دیا کروں "بادشاہ سے جا کر پوچھو"

بادشاہ سمجھتا ہے کہ شاید تم یہ چاہتے ہو کہ ویٹو کو ختم نہ کیا جائے بلکہ اُسے دوسرے دروازے" کی طرف بھیج دیا جائے۔

پرڈیس: جی ہاں اور " دوسرا دروازہ عوام کا ہے۔ اس دروازہ پر پیتل کے حروف میں لکھا ہے "عوام کی رائے"۔

میگنس " بات کا رُخ تم نے اچھا موڑا، مگر یہ صحیح نہیں ہے۔ تم سے کہیں زیادہ پبلک کی رائے کا پابند تو میں خود ہوں۔ کیونکہ جمہوریت پر عام یقین ہونے کی بدولت تم ہمیشہ یہ ظاہر کرتے ہو کہ جو کچھ تم کر رہے ہو وہ پبلک کی خواہش ہے۔ حالانکہ خدا گواہ ہے پبلک نے کبھی اس کا گمان بھی نہ کیا ہوگا۔ اور اگر گمان کیا بھی ہوگا تو اسے سمجھا نہیں ہوگا۔ اس کے برعکس بادشاہ جو کچھ کرتا ہے تنہا وہی اس کا ذمہ دار قرار دیا جاتا ہے ....."

لزیز ٹرانٹما: "جی سرکار۔ مجھے اس کے صحیح ہونے میں شبہ ہے۔ میں جانتی ہوں کہ اگر میرے محکمے میں کوئی گڑبڑ ہو جاتی ہے تو میں ہی اس کی ذمہ دار قرار دی جاتی ہوں"

میگنس ...... " بہرحال یہ طے ہے کہ ایک زمانہ ہوا جب عوام یہ سمجھنے لگے ہیں کہ جمہوریت بالکل بکواس اور واہیات ہے۔ اس نے ذمہ دار حکومت قائم کرنے کے بجائے اسے ختم کر ڈالا ہے ....."

بونرجیس احتجاج کرتے ہیں، شاہ ان کے اعتراض کو رد کرتا ہے لیکن اس طرح کہ

" جمہوریت حقیقی چیز ہے کم از کم اور بہت سے پرانے اداروں کے بہ نسبت کچھ کم واہیات ہے۔ مگر جمہوریت کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ عوام حکمرانی کرتے ہیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ذمہ داری اور ویٹو دونوں نہ تو

بادشاہ کے ہاتھ میں ہیں، نہ بڑی بڑی باتیں بنانے والوں کے ہاتھ میں۔ یہ صرف ان کے ہاتھ میں ہیں جو ان دونوں سے زیادہ ہوشیاری کے ساتھ اسے قبضائے ہوئے ہیں۔"

"یعنی مثال کے طور پر خود آپ کے ہاتھ میں؟"

میگنس "نہیں میں تو ابھی اس کی دوڑ میں شریک ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ میں آپ کا الٹی میٹم مان لینے پر خود کو مجبور نہیں پاتا۔ اگر میں نے اس پر دستخط کر دیے تو میں اس دوڑ سے ہٹ جاؤنگا۔ پھر ایسا کیوں کروں؟"

پروٹیس۔ اگر دو آدمی ایک ہی گھوڑے پر سوار ہوں تو ایک کو پیچھے بیٹھنا ہی ہوگا"

مگر سوال یہ ہے کہ حکومت کے گھوڑے پر پیچھے کون بیٹھے۔ خاندانی بادشاہ یا منتخبہ وزارت؟

پروٹیس "میں اس فضول کی جھک جھک کے لیے تیار نہیں ہوں۔ میں ایک کتا بننا پسند کرونگا بجائے اس کے کہ ایسے ملک کا وزیر اعظم بنا رہوں جہاں کے باشندے اگر کسی معاملہ میں سنجیدہ ہیں تو وہ یا فٹ بال ہے یا تفریحات۔ تم لوگ بادشاہ کے جوتے چاٹتے رہو۔ تم اسی قابل ہو۔" اور غصے میں آپے سے باہر ہو کر کمرہ چھوڑ دیتا ہے۔

باقی وزرا سمجھ رہے ہیں کہ یہ وزیر اعظم کی محض چالبازی ہے کہ وہ غصے کو بہانہ بنا کر باہر چلے گئے، کیونکہ باہر تنہائی میں وہ بادشاہ سے گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔ سب لوگ دبی زبان سے اس کا اظہار کرتے ہیں۔ بادشاہ

باہر وزیر اعظم کو منانے کے لیے جا چکا ہے اور وہیں ان دونوں نے مسئلے پر گفتگو شروع کر دی ہے۔

تھوڑی دیر بعد بادشاہ اور وزیر اعظم دونوں اندر کمرے میں واپس چلے آتے ہیں۔ سب لوگ تعظیماً اُٹھتے ہیں اور سنجیدگی سے بیٹھ جاتے ہیں۔

میگنس: (نہایت سنجیدگی اور وزن کے ساتھ) وزیر اعظم نے ازراہ عنایت تنہائی میں گفتگو کر کے مسئلے کو اس نکتے تک پہنچا دیا ہے جہاں معاملہ بالکل صاف ہو جاتا ہے۔ اگر میں آپ لوگوں کا الٹی میٹم منظور نہیں کرتا تو آپ اور وزیر اعظم وزارت سے استعفا دے دینگے اور اس کے بعد دار العوام (ہاؤس آف کامنز) میں تقریر کر کے پبلک پر یہ واضح کر دیا جائیگا، کہ وہ آیا وزارتی حکومت چاہتی ہے یا خاندانی اور موروثی حکمراں کی حکومت؟ یہ ایک ایسا سوال ہوگا جس پر میں صاف طور پر کہے دیتا ہوں کہ مجھے جیت کر بھی سخت افسوس ہوگا۔ کیونکہ وزیروں کی ایک جماعت جس کے ہوتے ہوئے عام لوگوں کو یہ خیال رہتا کہ وہ اپنی حکومت خود چلا رہے ہیں ـــ اور اس جماعت کی مدد کے بغیر میں حکومت نہیں چلا سکتا"..... لہذا میں ایسے ٹکراؤ کو ٹال جانا چاہتا ہوں جس میں اگر جیت میری ہوئی تو مجھے نقصان اُٹھانا پڑیگا اور اگر ہار ہوئی تو میں بالکل ہی بیکار ہو جاؤنگا۔"

آپ لوگ چاہتے ہیں کہ ایسا عہد نامہ بھر دوں جس کی بدولت میں صرف لارڈ چمبرلین بن کر رہ جاؤنگا، لارڈ چمبرلین کو کم از کم یہ تو اختیار حاصل ہے کہ وہ تھیٹر کو دبائے رکھتے ہیں، مجھے یہ بھی اختیار نہ ہوگا۔ اب میں تنہا رہ گیا ہوں۔

آپ کی تعداد بھی زیادہ ہے۔ پہلے زمانہ میں بادشاہ کو نوابین اور بڑے بڑے آدمیوں کی تائید کی قوت ہوتی تھی، اب وہ بھی نہیں ہے۔ نوابین اور دولتمند سرمایہ دار پہلے سے زیادہ دولتمند، زیادہ لائق اور زیادہ تعلیم یافتہ ہوگئے ہیں۔ اب وہ حکومت کے جھمیلوں میں خود کو الجھانا نہیں چاہتے۔ کیونکہ "پبلک کام ایسا ہوتا ہے کہ ایک کام ختم کرو تو دس اور پیدا ہو جاتے ہیں۔ ہمارے ۹۹ فیصدی کاموں کی پبلک کو خبر بھی نہیں ہوتی۔ اس لیے وہ شکر گزار نہیں ہوتے۔ اور جو ایک فیصدی کام ہوتا ہے اس پر وہ بگڑتے اور ناراض ہوتے ہیں کہ ان کی آزادی پر ڈاکہ ڈالا گیا۔ ٹیکس بڑھا دیا گیا۔ مضبوط سے مضبوط آدمی ایسے کاموں میں پانچ چھ سال کے اندر تھک کر چور ہو جاتا ہے۔" صحت جواب دے جاتی ہے۔" یاد رکھیے کہ اب اس ملک میں صرف یہی (حکومتی معاملات ہی) ایک ایسا پیشہ رہ گیا ہے جس میں پسینہ بہانا پڑتا ہے"...... "ان ارب پتیوں کے درمیان میری حیثیت خود ایک معمولی آدمی کی ہو کر رہ گئی ہے...... اب اس پیشہ کی بھی کوئی عزت نہیں رہی۔ اعلیٰ درجہ کے ذہین لوگ ہمارے کاروبار کو گندا کاروبار سمجھتے ہیں...... سائنس دانوں کو بھی ہم سے کوئی واسطہ نہیں، کیونکہ پالیٹکس (حکمرانی کی سیاست) کی فضا اور سائنس کے ماحول میں بڑا فرق ہے۔ حد یہ کہ ہماری سیاسی سائنس جس کے ساتھ تہذیب کی موت و حیات وابستہ ہے، ماضی کو سلجھانے میں لگی ہوئی ہے، جبکہ ہم حال سے الجھے ہوئے ہیں...... ملک میں ذہانت اور قابلیت والے جتنے لوگ تھے، انہیں مفت کمائے ہوئے روپیے کے سیلاب نے خرید لیا ہے۔ ذہین، دُور رس اور صاحب کمال لوگ

اس زہریلی دولت پر اور دولتمندوں کی خدمت میں بڑے مزے اور عیش سے
گزر کر رہے ہیں بہ نسبت ہمارے جو ملک کی خدمت میں وقت گزارتے ہیں۔
ایک زمانہ تھا جب سیاست کی طرف تمام وہ لوگ جھکتے تھے جن میں قابلیت
ہوتی تھی، پبلک کی خدمت کرنے کا جذبہ ہوتا تھا اور بڑے حوصلے ہوتے تھے
آج کل سیاست صرف ایسے چند شوقینوں کی پناہ گاہ بن کر رہ گئی ہے جنہیں
پبلک میں بولنے کا ہوکا ہے۔ پارٹی تکڑموں سے دلچسپی۔ اور جن پر اُبھرنے
اور نمایاں مقام حاصل کرنے کے اور تمام دروازے بند ہو گئے ہیں، یا تو
اس لیے کہ ان میں کام کرنے کی قابلیت نہیں ہے، کسی قدر غریب ہیں اور
پوری تعلیم نہیں ملی۔ یا پھر اس وجہ سے — یہ لفظ کہنے میں جلدی کرونگا
— کہ انہیں ظلم اور ناانصافی سے نفرت ہے وہ تجارتی انداز کی پیشہ وری
کے جھوٹے دعووں اور اس کے مکر و فریب کو حقارت سے دیکھتے ہیں....
آپ لوگ پبلک سے ڈرتے ہیں اور کوئی بڑا اصلاحی قدم اُٹھانے سے بھی ڈرتے
ہیں — اِدھر میں ہوں کہ مجھے الکشن وغیرہ سے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ اگر
اخبارات کا کوئی بڑا مالک میری ذات پر حملہ کرنے کی جرأت کرے تو اُس
کی فیشن ایبل بیوی کی وہ لڑکی اسے جلد ہی یہ سمجھا دیتی ہیں کہ بادشاہ کو ناراض کرنے
کا انجام یہ ہوگا کہ سینٹ جیمس کے محل (شاہی محل) کی جہاں جہاں رسائی ہے
وہاں ان کی سوشل موت واقع ہو جائیگی (یعنی وہاں ان کا آنا جانا بند ہو جائیگا)
جن ذمہ داریوں کو آپ لوگ اُٹھانے سے ڈرتے ہیں بادشاہ کے کاندھے انہیں
اُٹھا سکتے ہیں۔ لیکن وہ بادشاہ بھی سچ مچ کا بادشاہ ہونا چاہیے کوئی کٹھ پتلی

نہیں۔" آپ اچھے قوانین کی تحسین و آفریں خود لے جاتے ہیں اور جو نقائص رہ جاتے ہیں، پبلک کی بے خبری کا سہارا لے کر مجھے آپ ان کا ملزم قرار دیتے ہیں، غور کیجیے اگر میں آپ کے ساتھ نہ ہوں تو آپ پر کیا گزریگی"۔ میں شکست تو نہیں دے سکتا لیکن آپ کو تنہا چھوڑ کر اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ضرور ہو سکتا ہوں۔ پھر سوچ لیجیے۔

اس موقعے پر حاضرین میں سے ایک وزیر بالبس کو خیال آیا کہ بادشاہ جب خود دست بردار ہونے کا ذکر کر رہے ہیں تو انہیں میرے بہنوئی مائک کو وزارت میں لیے جانے پر کوئی اعتراض نہ ہو گا، چنانچہ اس نے فوراً دبی زبان سے مائک کا نام لے دیا۔

میگنس "اگر میں درمیان میں پاؤں نہ ڈالتا تو وزیر اعظم کی یہ جرأت نہ ہو سکتی کہ وہ مائک کو وزارت کی فہرست سے باہر رکھیں، سمجھے مسٹر بالبس؟"

بالبس پھر اظہار کرتا ہے کہ اگر اس کے بہنوئی مسٹر مائک کو وزارت میں لے لیا جائے تو وزارت اور مضبوط ہو جائیگی کیونکہ مائک بریکیج لمیٹڈ کا آدمی ہے۔ اور بریکیج لمیٹڈ ملک کی سب سے بڑی صنعتی کمپنی ہے۔

یہ سنتے ہی لزیوٹراٹا کا پیمانہ صبر چھلک گیا۔ بجلی اور موٹر پاور کی وزیر ہونے کی حیثیت سے وہ مائک کے بہت خلاف ہے۔ کیونکہ "مجھے ملک کی بھلائی کی خاطر سارے ملک کی موٹر پاور کی تنظیم کرنی ہوتی ہے اور اسے ڈھنگ سے چلانا ہوتا ہے" تیل اور کوئلے کا منا سب بند وبست کرنا ہوتا ہے۔ بجلی، کوئلے، تیل اور گیس جہاں جہاں استعمال ہوتا ہے ان سب کا خیال رکھنا پڑتا

ہے، اور اس کے کارخانے چلوانے پڑتے ہیں" اس میں جتنا خرچ ہونا چاہیے تھا اس سے دُگن خرچ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ جو کوئی نئی ایجاد ہوتی ہے، بریکیج لمیٹڈ کمپنی اس ایجاد کو فوراً خرید لیتی ہے اور اسے سامنے آنے سے پہلے ہی دبا دیتی ہے۔ میرے محکمے میں جو کوئی ٹوٹ پھوٹ ہوتی ہے۔ کوئی حادثہ ہوتا ہے، کوئی نقصان ہوتا ہے، کوئی پرزہ یا مشین بگڑ جاتی ہے تو اس کی مرمت کا کام بریکیج لمیٹڈ کو دیا جاتا ہے (بریکیج کمپنی کا کام مشینوں وغیرہ کی مرمت ہے) اب بجائے اس کے کہ ہم اپنی مشینیں، اپنی ریلیں وغیرہ سال میں ایک بار مرمت ہونے بھیجتے ہیں ہفتے میں ایک بار مرمت کے لیے بھیجنی پڑتی ہیں" ہماری سرکاری مرمتوں کا بل کروڑوں (پونڈ) تک پہنچ جاتا ہے۔ خود میرے زمانے میں ایک درجن سے زیادہ ایسی ایجادیں ہوئی ہیں جن کا میں نام لے سکتی ہوں جن سے اگر کام لیا جاتا تو ٹوٹ پھوٹ اور حادثات میں بہت کمی ہو جاتی اور حد سے زیادہ بچت رہتی۔ لیکن یہ لوگ (بریکیج والے) ایک موجد کو اس کی مشین، اس کی ایجاد یا پرزے وغیرہ کے عوض میں اتنا روپیہ دے دیتے ہیں کہ جتنا روپیہ وہ اس ایجاد سے کام لے کر حاصل کرنے کی اُمید نہیں کر سکتا اور یہ لوگ اس ایجاد کو خریدتے ہی فوراً فنا کر دیتے ہیں۔ اور اگر ایجاد کرنے والا بیچارہ غریب آدمی ہے اور خود اپنی ایجاد کے لیے کھلی آواز نہیں بلند کر سکتا۔ تو یہ لوگ اس کی مشین لے کر جھوٹ موٹ کے تجربے کرتے ہیں اور کہہ دیتے ہیں کہ یہ ایجاد یا نئی مشین بالکل بیکار ہے۔ ان حرکتوں نے بیچارے موجدوں کو ایسا پاگل کر دیا کہ وہ دو بار مجھ پر برس پڑے۔ گویا میں اس شیطان کا مقابلہ کر سکتی ہوں جس شیطان

کے پاس کروڑہا روپیہ ہے، اخبارات ہیں اور ایک ایک پیسے پر جس کی مہر لگی ہوئی ہے۔"

"یہ کیفیت بڑی دل شکن ہے۔ مجھے اپنے محکمے سے محبت ہے"۔ اپنے ہر عزیز، ہر دوست اور ہر رشتے دار کی محبت سے زیادہ مجھے اس کا خیال ہے کہ میرا محکمہ قابلیت سے چلتا رہے۔" میں پوری قوت سے چاہونگی کہ یہ لوگ (بریکیج لمیٹڈ) بالکل دیوالیہ ہو جائیں۔ ان کا آدھا کاروبار ختم کر دیا جائے، باقی آدھا کاروبار پبلک کے کارخانوں کی شکل میں بدل جائے۔ جہاں پبلک کے نقصان سے افراد کا منافع نہ بنتا ہو۔ جناب والا، آپ اس کے حامی ہیں۔ اور میں آخری قطرۂ خون تک آپ کے ساتھ رہونگی۔ مگر کیا کروں، بے بس ہوں، اگر ایک لفظ بھی پبلک میں جا کر کہہ دیتی ہوں تو آئندہ دو سال تک ایک ہفتہ بھی ایسا نہیں گزریگا جس میں تمام سرکاری محکموں اور خاص طور پر ان محکموں کے خلاف جنہیں میری طرح عورتیں چلاتی ہیں نالائقی، بدعنوانی اور گڑبڑ کی خبریں اور مضامین نہ چھپتے رہیں۔ جن مشینوں کو انہوں نے زمین میں دفن کر دیا ہے وہ مشینیں پھر سے نکالی جائیں گی اور تشہیر کیا جائیگا کہ یہ میری غلطی ہے جو ان کا استعمال نہیں ہوا۔ وہ اپنے پرائیویٹ جاسوس مجھ پر لگا دیں گے کہ دن رات مجھ پر نظر رکھیں اور میرے ذاتی کیرکٹر کے خلاف معلومات حاصل کریں۔ بریکیج والوں کے ایک ڈائرکٹر نے میرے منہ پر مجھ سے کہہ دیا کہ اگر وہ انگلی اٹھا دے تو مشتعل ہجوم سے میرے دفتر کی کھڑکیاں تڑوا سکتا ہے۔ اور اس کے بعد ٹوٹی کھڑکیوں پر نئے شیشے لگوانے کا کام بھی بریکیج لمیٹڈ کو ہی ملیگا۔ اور اس کا یہ دعویٰ

بالکل صحیح ہے۔ اگرچہ یہ ذلت انگیز ہے۔ جارحانہ ہے لیکن صحیح ہے۔ اگر میں ان سے لڑنے کی کوشش کروں تو وہ مجھے پبلک زندگی سے نکلوا کر پھینک دینگے اور میری جگہ مسٹر مولڈی مانک کو دلوادینگے تاکہ وہ یہ سرکاری محکمہ اس طرح چلائے جس میں بریکیج والوں کا فائدہ ہو۔ یعنی اس کو اتنا ناکام کردیا جائے کہ وزیر اعظم صرف لوہے کے داموں پر اسے بریکیج لمیٹڈ کے ہاتھوں بیچنے پر تیار ہو جائیں ــــ اور میں ــــ افوہ ــــ کیسے کہوں ــــ" ہر طرف خاموشی۔ گمبھیر خاموشی۔

لیکن وزارت کی دوسری خاتون امنڈا کو بریکیج لمیٹڈ سے کوئی شکایت نہیں ہے کیونکہ وہ اس کے محکمے ڈاکخانے سے ناراض نہیں ہیں اور ڈاکخانے کی کارگزاری سے ان کو بھی فائدہ ہے۔ لیکن امنڈا کے خیال میں اس کی وجہ یہ ہے کہ امنڈا کا اپنے حلقے پر کافی اثر ہے۔ ایک بار بریکیج کمپنی کا چیرمین اس کے حلقۂ انتخاب میں مقابلہ کرنے کے لیے کھڑا ہوا۔ اس نے وہاں ایک جلسہ عام میں تقریر کی۔ بس امنڈا نے دوسرے دن وہیں جلسۂ عام کرکے اس کی تقریر کو ایسے لب و لہجہ سے دہرایا کہ سب لوگ ہنس پڑے اور چیرمین صاحب کا خوب مذاق اڑا۔ پھر امنڈا نے حاضرین سے پوچھا، آپ حضرات گانا سُنینگے۔ اُنہوں نے کہا ضرور۔ چنانچہ امنڈا نے دو گانے گائے جن میں چیرمین کا مذاق اڑایا گیا تھا۔ حاضرین سے کہا، وہ اس گانے میں آواز سے آواز ملائیں۔ لوگوں نے اس حرکت سے خوب لطف اُٹھایا۔ اور بریکیج کا چیرمین مقابلے کی اُمیدواری چھوڑ کر چلتا بنا۔

اس طرح انگلینڈ پر حکومت کی جاتی ہے،" انگلینڈ کی خوش قسمتی کہ ملکہ امنڈا بہت خوب ہے، اگرچہ سطح پر اس میں کچھ کمزوریاں بھی ہیں۔

مختصر یہ کہ پوری وزارت میں ایک شخص بھی نہیں جو بادشاہ کی تائید کرے۔ عورتیں بھی اس کی پوری حمایت کرتے ہوئے ڈرتی ہیں کہ کہیں ان کے دشمن انہیں بعد میں تنگ نہ کریں۔ بادشاہ اظہار کرتا ہے کہ اب بحث مباحثے سے کچھ حاصل نہیں۔ اس لیے وہ اپنا آخری جواب شام کو پانچ بجے تک وزیروں کو سُنا دیگا کہ آیا وہ الٹی میٹم پر دستخط منظور کرتا ہے یا وزارت کا استعفا۔

سب لوگ شام کے ۵ بجے تک کے لیے رخصت ہو جاتے ہیں۔

درمیان میں بحث مباحثے کا وزن اور ڈرامے کی گمبھیرتا کم کرنے کے لیے شا نے ایک ضمنی منظر رکھ دیا ہے۔

بادشاہ اپنی محبوبہ اورنتھیا کے کمرے کے دروازے پر دستک دیتا ہے۔ وہ شاہ سے ناراض ہے اور ملنا نہیں چاہتی۔ تھوڑی دیر ناز کرنے کے بعد بالآخر وہ شاہ کو اندر بُلا لیتی ہے۔

میگنس "آج ناراضی کا سبب کیا ہے جانِ من؟"

اورنتھیا "اپنے ضمیر سے پوچھیے"

میگنس "جہاں تک تمہارا تعلق ہے، میرے پاس کوئی ضمیر نہیں تمہیں خود بتانا ہوگا۔"

ناراضگی کا سبب یہ معلوم ہوا کہ شاہ نے اپنی محبوبہ کو اورنتھیا کا نام یہ کہہ کر دیا تھا کہ یہ بالکل اچھوتا نام ہے، آج تک کہیں استعمال نہیں ہوا۔ مگر ایک معمولی گانوں کی کتاب میں وہی نام نکل آیا جس سے شاعر نے اپنی محبوبہ کو مخاطب کیا تھا۔ گویا بادشاہ نے اورنتھیا سے جھوٹ بولا۔

بادشاہ معذرت کرتے ہوئے کہتا ہے — اب میرا دل نہ دکھاؤ۔ جانے دو۔
اورنتھیا "تمہارے پاس دل کب سے آگیا؟ کیا یہ بھی کسی کباڑی کے یہاں سے پُرانا خرید لیا تھا؟
اسی طرح ایک طرف سے ناز و غمزہ، دوسری طرف سے نیاز مندی کی چھلیں ہوتی رہیں۔ اورنتھیا کو یہ بھی شبہ ہے کہ بادشاہ نے دو خاتون وزیروں کو وزارت میں محض مردانہ جذبے سے لیا ہے اور وہ ہر وقت ان میں ہی اُلجھا رہتا ہے۔ بادشاہ کو اس الزام سے بھی انکار ہے۔
ہوتے ہوتے اورنتھیا نے پھر اپنا یہ مطالبہ دُہرا دیا کہ اگر سچ مچ کے بادشاہ بننا چاہتے ہو تو یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب ایک ملکہ بھی تمہاری شریکِ حیات ہو۔ اور میں حقیقی معنوں میں ملکہ بننے کے قابل ہُوں۔ شاہ جتاتا ہے کہ اس کی ملکہ تو موجود ہے۔
اورنتھیا "تم بینائی سے بھی معذور ہوا بلکہ اندھوں سے بدتر۔ کتنا بُرا ذوق پایا ہے خدا تم کو گلاب کا پھول پیش کرتا ہے اور تم ہو کہ گوبھی کے پھول سے چمٹے ہوئے ہو۔"
میگنس (ہنستے ہوئے) بہت عمدہ استعارہ ہے جانِ من۔ لیکن اگر ایک سمجھدار آدمی کو تم اس پر مجبور کرو کہ یا تو وہ گلاب کا پھول قبول کرے اور یا گوبھی کا پھول، تو دونوں میں سے ایک کا انتخاب کرتے وقت کیا وہ گوبھی کا پھول نہیں لیگا؟ اور پھر یہ کہ شادی شدہ گوبھی کے پھول خود بھی تو کسی وقت گلاب کے پھول رہ چکے ہیں۔ اگرچہ تم جیسے کمسنوں اور نوجوانوں کو یاد نہ ہو لیکن ان کے شوہروں کو یاد ہے۔ اور انہیں تبدیلی محسوس نہیں ہوگی۔ اور پھر تم تو جانتی ہوگی کہ جب ایک

شوہر اپنی بیوی سے اُکتا جاتا ہے اور اسے چھوڑ دیتا ہے تو یہ اس لیے نہیں کہ اس کی بیوی کا حُسن جاتا رہا۔ بلکہ نئی محبوبہ اکثر پہلی محبوبہ سے زیادہ بدصورت اور زیادہ عمر رسیدہ ہوتی ہے۔

اورنتھیا "مجھے دوسروں کی بہ نسبت اس کا علم زیادہ کیسے ہوگا؟"

میگنس "کیونکہ تم دو بار شادی کر چکی ہو۔ اور تمہارے دونوں شوہر تمہیں چھوڑ کر بدصورت اور زیادہ بے وقوف عورتوں کے پاس چلے گئے......

آخر میں اورنتھیا یہ تجویز پیش کرتی ہے کہ شاہ اپنی بیوی سے قطع تعلق نہ کرے، اور دوسری شادی کرلے، وہ پہلی ملکہ سے نباہ کرلیگی۔

میگنس "میری جان اورنتھیا، میں چُڑیل سے شادی کرلونگا مگر تم سے نہیں۔ بیوی بننا تمہارا کام نہیں ہے۔

اورنتھیا "تم دماغ اور فہم سے عاری ہو اس لیے ایسی بات سوچتے ہو۔ تم مجھے جانتے نہیں کیونکہ میں نے کبھی تمہارے قبضے میں خود کو آنے نہیں دیا۔ میں تمہیں دنیا کے ہر انسان سے زیادہ خوش رکھ سکتی ہوں"۔

میگنس "مگر میں خود کو اس سے زیادہ خوش ہونے نہیں دونگا جتنا ہمارے باہمی پاکیزہ تعلقات نے مجھے پہلے ہی خوشی بخش دی ہے"

میگنس پھر وضاحت کرتا ہے کہ میں تم سے جی بہلاتا ہوں۔ تم مجھے بہت عزیز ہو حسین ہو۔ دلچسپ ہو۔ سب کچھ ہو۔ جب ساری دنیا سے اُکتا جاتا ہوں تو تمہارے پہلو میں مجھے فرحت نصیب ہوتی ہے۔ ہمیں اس غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے کہ ہم دونوں ایک گوشت ایک پوست بن جائیں"۔ ہر ستارے

کا ایک دائرہ ہے۔ اس ستارے اور اس کے ہمسائے ستارے کے درمیان صرف ایک زبردست جذب باہم ہی نہیں ہے بلکہ ایک مکمل فاصلہ بھی ہے۔ جب کشش اس فاصلے کی حد سے بڑھ جاتی ہے تو دونوں ستارے ایک دوسرے سے ہم آغوش نہیں ہوتے بلکہ دونوں بُری طرح ایک دوسرے سے ٹکرا جاتے ہیں اور تباہ ہو جاتے ہیں۔ ہم دونوں کے بھی دو الگ دائرے ہیں۔ ہمیں اپنے درمیان باضابطہ فاصلہ بھی رکھنا چاہیے کہ کہیں تباہ کن ٹکراؤ نہ ہو جائے۔" اس فاصلہ کے باقی رہنے ہی میں مزا ہے۔ "اسی میں شرافت ہے۔ اگر یہ شرافت اُٹھ جائے تو انسانی سماج ناقابلِ برداشت اور ناممکن ہو کر رہ جائیگا"

میگنس جانا چاہتا ہے کیونکہ پانچ بجنے والے ہیں اور اس سے پہلے اسے فیصلہ کر لینا ہے، اور نتھیا اسے باتوں میں الجھا کر روکنا چاہتی ہے۔ وہ اُٹھتا ہے اور عذر کرتا ہے۔ اور نتھیا اس سے بیٹھنے کو اصرار کرتی ہے۔ دیر تک کھینچ تان ہوتی رہتی ہے۔ اور نتھیا تندرست اور مضبوط عورت ہے۔ وہ اُٹھنا چاہتا ہے کیونکہ ساڑھے چار بج گئے ہیں اور چائے کا وقت ہو چکا ہے۔ چائے ملکہ کے ساتھ پینی ہو گی۔ اور اگر دیر ہوئی تو شاہ کو شرمندگی اُٹھانی پڑیگی۔ میگنس پھر اُٹھتا ہے، اور نتھیا اس کے گرد اپنی باہوں سے حلقہ بنا لیتی ہے اس کشمکش میں دونوں گر جاتے ہیں، اور ایک دوسرے پر لوٹتے لڑھکتے رہتے ہیں۔ اتنے میں دروازے پر آہٹ ہوئی۔ دروازہ خود بخود کھل گیا سکرٹری کی نظر اس منظر پر پڑی اور اُس نے جھٹ سے دروازہ بند کر دیا۔ اور باہر زور سے کھنکھارا، ناک صاف کی۔ اور اس آہٹ پر دونوں خبردار ہوئے تو شاہ نے آواز دی۔ "اندر آجاؤ" سکرٹری نے عرض کیا۔ حضور ملکہ معظمہ چائے پر انتظار

فرما رہی ہیں۔

شاہ شرمندگی کے احساس کے ساتھ روانہ ہوگیا۔

دوسرا ایکٹ

محل کی کھلی چھت پر بادشاہ اور ملکہ زینہ کے کونے پر کرسیاں ڈالے بیٹھے ہیں۔ کرسیوں کی قطار ایک طرف کھڑی ہے۔ انتظار ہے کہ وزرا آتے ہونگے اور یہیں نشست ہو جائیگی۔ اور کھلی فضا میں "وہ اتنی آسانی سے تقریریں نہ جھاڑ سکینگے جیسے ایک بند کمرے میں کرتے رہتے ہیں"

اتنے میں امریکی سفیر کی آمد کی اطلاع ہوئی اور وہ چونکہ اسی وقت ملنے پر مصر تھا اس لیے بلا لیا گیا۔ سفیر مسٹر وان ہاٹن ایک جوشیلا، چھچھورا، پاپا مب اور بہت ہی مست قسم کا آدمی ہے۔ اس وقت وہ پھولا نہیں سماتا اور بادشاہ کی سنجیدگی کے باوجود اس میں بھی جذباتی جوش و خروش پیدا کرنے کے لیے ڈرامائی طریقے اختیار کر رہا ہے۔ کچھ نہیں بتاتا کہ اصل معاملہ کیا ہے۔ صرف یہ کہے جا رہا ہے کہ ایک زبردست تاریخ ساز واقعہ ہوگیا ہے۔ اور بہت دیر تک ڈرامے کی سی حیرت انگیز فضا قائم کرنے کی ناکام کوشش کے بعد بتاتا ہے کہ برطانیہ پر امریکہ کا جو قرض چاہیے تھا وہ منسوخ کر دیا گیا۔ بادشاہ کو اس پر ذرا بھی حیرت نہیں اور وہ ٹھنڈا ماحول قائم رکھتے ہوئے اس کی اصلیت پوچھتا ہے تو وان ہاٹن نے پھر بات کو کافی گھما پھرا کر بتایا کہ انگریزوں سے الگ ہونے کے بعد امریکہ نے جو اعلان آزادی کیا تھا وہ منسوخ کر دیا گیا۔ اس سلسلے کے تمام صلحنامے پھاڑ کر پھینک دیے گئے۔ "اور ہم نے طے کیا ہے کہ پھر سے برطانوی سلطنت

میں شریک ہو جائیں" اور ایک نوآبادی کی حیثیت سے شریک ہو جائیں۔

شاہ اس پر خاموش ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ امریکہ کے صدر کو تو اتنی چالبازی کرنے کی عقل کہاں تھی، یہ نکتہ کسی اور نے اسے سمجھایا ہوگا۔ امریکہ چاہتا ہے کہ اس ترکیب سے غریب انگلینڈ کو نگل جائے۔ اس مصیبت میں فرانس اور جرمنی بھی ساتھ نہیں دینگے۔ اور یہ چھوٹا سا جزیرہ دولتمند امریکہ ہڑپ کر جائیگا۔ اس طرح مِل جانے سے تو "آخری قطرۂ خون" تک لڑ لینا بہتر ہے۔

"میں جب بچہ تھا اور مجھ پر خاندانی روایات کا اثر تھا۔ اور ہمارے خاندان نے امریکی بغاوت کو جائز تسلیم ہی نہیں کیا۔ اس وقت میں بھی یہ خواب دیکھا کرتا تھا کہ دونوں پھر مل جائیں۔ اور انگریزی بولنے والی سلطنت دنیا کی تہذیب کے سر پر کھڑی ہو۔۔۔۔ مگر اب جبکہ میں زیادہ عمر کو اور زیادہ دانائی کو پہنچ چکا ہوں میں اس حقیقت کو خواب سے زیادہ دلکش نہیں پاتا۔"

اتنے میں وزراء کی آمد کی اطلاع ہوئی۔ اور وان ہاٹن کو رخصت کر دیا گیا محل کی کھلی چھت پر موسم کی دلکشی کا ذکر شروع ہی ہوا تھا کہ شاہ نے کہا۔

"مغرب کے افق پر خطرناک بادل منڈلا رہے ہیں مسٹر پلینی۔ تم نے سُنا امریکہ سے کیا خبر آئی ہے؟" اور سُنا ہے تو تمہارا کیا مشورہ ہے؟

مگر پر ڈیس مشورہ دینے سے پہلے اپنے الٹی میٹم کا فیصلہ چاہتا ہے۔

میگنس "تم سمجھتے ہو کہ الٹی میٹم کی کوئی حیثیت رہ جائیگی اگر کامن ویلتھ کی راجدھانی یہاں سے واشنگٹن منتقل کر دی گئی؟"

دوسرا وزیر "جی، ہم اسے ملبورن، مانٹریل یا جانس برگ پہلے لے جائینگے"

میگنس "نہیں راجدھانی وہیں ٹھہر سکتی ہے جہاں مرکزِ ثقل ہو"۔

پروٹیس "ہم اس پر اتفاق کرتے ہیں۔ اگر برطانوی سلطنت کی راجدھانی کو یہاں سے بدلنا ہی پڑا تو ہم اسے یا تو مغرب میں واشنگٹن لے جائینگے یا مشرق میں ماسکو"۔

میگنس "ماسکو کو اپنے متعلق بڑا گمان ہے۔ بھلا وہ کیا ہے جو ہم خود کو نہیں سکھا سکتے اور ماسکو ہمیں سکھا دیگا۔ ماسکو نیا ہے انگلینڈ کی تاریخ کی بنیاد پر۔ جو تاریخ کارل مارکس نے لندن میں بیٹھ کر لکھی تھی"۔

پروٹیس کے اصرار سے اس سوال کو بعد کے لیے ٹال دیا گیا اور اصل الٹی میٹم اور عہد نامے کی بحث چھیڑی گئی اور جتا دیا گیا کہ اگر بادشاہ نے الٹی میٹم ماننے سے انکار کیا تو ہم ملک سے پوچھیں گے کہ وہ آئینی حکومت چاہتا ہے یا مطلق العنان بادشاہ کی حکومت۔ اور پھر ہم لوگ استعفا نہیں دینگے۔

اچھا تو سُنیئے، میگنس نے کہا۔ میں جانتا ہوں کہ مطلق العنان حکمرانی کا زمانہ گیا۔ تم میرے بغیر کام چلا سکتے ہو، میں تمہارے بغیر نہیں چلا سکتا۔

"میں تمہارا آئینی اصول بغیر کسی شرط اور تحفظ کے تسلیم کرتا ہوں، لیکن الٹی میٹم پر دستخط نہیں کر سکتا۔ کیونکہ اگر میں نے ایسا کیا تو میں گویا ایسا وعدہ کر رہا ہوں جسے بہر حال میں توڑ دونگا۔ اور مجھے وہ پابندی توڑنی ہی چاہیے کیونکہ میرے اندر وہ طاقتیں باقی ہیں جنہیں آپ کی آئینی پابندیاں روک نہیں سکتیں"۔

آئینی اصول تسلیم کر لینے کے معنی یہ ہیں کہ "میں موروثی سلطنت کی پادشاہی سے دست بردار ہو سکتا ہوں"

تمام حاضرین سناٹے میں آگئے۔ جتنے منہ اتنی تعبیریں۔

میگنس "... میں موروثی پادشاہت کو ختم کرنے کے لیے دست بردار نہیں ہو رہا ہوں بلکہ اسے بچانے کے لیے ایسا کر رہا ہوں۔ میرے بعد میرا لڑکا رابرٹ پرنس آف ویلز پادشاہ ہوگا اور وہ ایک بہت اچھا آئینی بادشاہ ثابت ہوگا۔ وہ بڑا ذہین ہے۔ اور پارلیمنٹری سیاست سے کوئی واسطہ نہیں رکھتا۔ اب بھی شاہ سے پوچھا کرتا ہے کہ "یہاں بیٹھ کر آپ کے ساتھ وقت ضائع کرنے اور ملک پر حکمرانی کے دعوے کرنے سے کیا حاصل، جبکہ ملک پر حکمرانی اصل میں بریکیج لمیٹڈ والے کرتے ہیں"

دوسرے وزیر نے کہا کہ اس کا بیٹا بھی ایسے ہی سوال کرتا ہے۔ زمانہ ہی کچھ بدل گیا۔ وزراء کہتے ہیں کہ بادشاہ سے چھٹکارا حاصل ہوگیا اور ان کی فتح ہوگئی۔ سب خوش ہیں اور مبارکباد کے نعروں میں رخصت ہونے لگتے ہیں۔

"ٹھہریے، ٹھہریے" — کیوں؟ اس لیے کہ باشاہ عملی سیاست سے بالکل قطع تعلق کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ وہ صرف سیاسی ماضی پر مطمئن نہیں بلکہ اپنا سیاسی مستقبل بنانے کا منصوبہ سوچ چکا ہے۔

"میں پارلیمنٹ کو برخاست کر دونگا اور پھر عام انتخابات کرائے جانے میں لطف آئیگا"۔ اپنے سارے خطابات، اعزاز وغیرہ چھوڑ کر ایک عام آدمی میں خود کو شمار کراؤنگا۔ پھر بحیثیت ایک عام اُمیدوار کے پارلیمنٹ کی نشست کے لیے کھڑا ہونگا۔ آئندہ انتخابات میں رائل بورڈ آف ونڈسر (شاہی حلقے) سے الکشن لڑونگا۔ اور پارلیمنٹ میں آنے کے بعد بڑے امکانات ہیں۔ خود ایک پارٹی بناؤنگا

اور پھر میرا بیٹا رابرٹ بحیثیت بادشاہ کے مجھے یا تمہیں جس کی پارٹی حکومت بنا سکیگی وزارت بنانے کے لیے طلب کریگا۔

اب تک ہم لوگ ایک دوسرے کے متعلق زبان بند کیے ہوئے، ایک دوسرے پر کھلے دل سے نکتہ چینی نہیں کر سکے۔ اب یہ دونوں باتیں ممکن ہونگی اور ہر ایک نقاب درمیان سے ہٹ جائیگا۔

وزراء میں کھلبلی مچ گئی۔ کیونکہ ایسی حالت میں شاہ کا منتخب ہونا یقینی تھا۔ وزراء کا بے نقاب ہونا یقینی تھا۔

پروٹیس (بہت زورادر اہمیت پیدا کر کے) "بس اب کوئی دست برداری نہیں ہوگی۔ اب کوئی عام انتخابات نہیں ہونگے، اب کسی قسم کا کوئی الٹی میٹم نہیں ہے، جیسے کام چل رہا تھا، ایسے ہی چلتا رہیگا۔ کرائسس اور بحران ختم ہوگیا۔

(بادشاہ سے) میں کبھی آپ کو نہیں بخشونگا۔ میں نے جو صبح تاش کا ہاتھ چلا تھا، آپ نے میرے ہاتھ کے پتے اُڑا لیے۔

لزیز ٹراٹم کو افسوس ہے کہ اگر بادشاہ اپنی ضد پر جم جاتا تو ایک ایسی پارٹی بن سکتی تھی جو بریکیج لمیٹڈ کا مقابلہ کر سکتی۔ اب اس کی بھی اُمید نہیں۔

رات کے کھانے کا وقت ہوگیا ہے۔ کرائسس دور ہوگیا ہے۔ وہی وزیر ہیں، وہی بادشاہ، وہی جھک جھک اور پارلیمنٹری جمہوریت۔ سب ایک دوسرے سے رخصت ہوگئے۔

مضامین اور کتابیں

جن کا اس سلسلے میں مطالعہ کیا گیا اور "خُذ ما صفیٰ ودَع ما کدر" کے اصول پر عمل کیا گیا۔

(۱) Studies in dying culture از کرسٹوفر کاڈویل

(۲) Fallen among Fabians..." از الک ویسٹ (مطبوعہ ۱۹۵۰ء)

(۳) George Bernard Shaw از لارڈ جی کے چسٹرٹن (تازہ ترین اڈیشن)

(۴) SHAW از سی ای ایم جود (۱۹۴۸ء)

(۵) Mather Life & Value از " " "

(۶) G.B.S. a pleybo & prophet از ہیسکتھ پیرسن

(۷) Teble Talk with G.B.S. از آرکبلڈ ہنڈرسن

(۸) Art of G. Bernard Shaw از ڈاکٹر سین گپتا

(۹) Quintessence of G.B.S. از ونسٹن چرچل

(۱۰) Georg Bernard Shaw از فرینک ہارس

(۱۱) Real georg Bernard Shaw از اریک بنٹلی

(۱۲) Appreciation of G.B.S. از مسز کلارک

(۱۳) G.B.S. .... از کولبورن

(۱۴) Dictionary & Bibliog. of Shaw's play's & works. از سی ایل اینڈ وی ایم بَرود

(۱۵) کچھ یادداشتیں — (مضمون مطبوعہ مانچسٹر گارجین) ایچ جی ویلز

(۱۶) انسانیت دوست، برنارڈ شا — (مضمون مطبوعہ ماڈرن ریویو)

ایچ این برلسیفورڈ

(۱۷) حیرت ناک شا، آخری ملاقات — (مضمون مطبوعہ سنڈے سٹنڈرڈ)

ہنّن سوفر

(۱۸) برنارڈ شا (مضمون مطبوعہ لیبر منتھلی) رجنی پام دت

اور کئی بکھرے ہوئے مضامین کے علاوہ خود

(۱۹) میرے سولہ۱۶ خاکے — جارج برنارڈ شا (۱۹۴۹ء)

2591

چند اہم اور مفید کتابیں

جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات
تمام دنیا کی سیاسیات سے متعلق
افراد واقوام ممالک ومقامات اور معاہدوں
اور اصطلاحوں کی مکمل یادداشت ہر
لائبریری میں رکھنے کے لائق کتاب قیمت ۷/

شہنشاہیت.. شہنشاہیت کی حقیقت اس کی تاریخ
اس کے نتائج واثرات پر اردو میں پہلی
کتاب یہ کتاب انتہائی معلوماتی بھی ہے
اور دلچسپ بھی قیمت ۲/-

انقلاب روس اس کتاب کے مطالعہ سے انقلاب روس کے
علاوہ دنیا کے عام انقلابات اور تحریکات کے
اسباب اور نتائج و ثمرات کا نقشہ بھی
آنکھوں میں سما جاتا ہے نہایت دلچسپ
اور سبق آموز تاریخی کتاب قیمت ۳/-

سرمایہ کارل مارکس کی شہرۂ آفاق کتاب "کیپٹل"
کا جامع اور آسان خلاصہ قیمت ۱/۸

مکتبہ برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی